عبداللہ ؛ ہاشم ندیم

Abdullah: Sequel

....Continued from Abdullah 1

عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے
انوکھے و لافانی سفر کی داستان

پی ڈی ایف میں تبدیلی

وحید احمد
princesnowwhite@gmail.com
0321-7255030

.....ہاشم ندیم ☆ قسط نمبر 1.....

قارئین!! آپ کے بے حد اصرار پر ہم نے 24 اگست 2008ء سے سنڈے میگزین کے پہلے ناول ''عبداللہ'' کی سلسلے وار اشاعت کا آغاز کیا۔ ناول کا یہ بہت کامیاب سفر 8 مارچ 2009ء کو اپنے اختتام پر پہنچا۔ ناول کتاب کی صورت مارکیٹ میں بھی آ گیا، لیکن بھئی، قارئین نے تو فون، خطوط اور ای میلز کے ذریعے احتجاج کر کر کے جینا محال کر دیا، خصوصاً کئی نوجوان خواتین نے تو باقاعدہ رونا دھونا شروع کر دیا۔ ناول کو یوں اچانک ختم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ آپ نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ ابھی تو کئی تشنگیاں باقی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو جی، ہم ایک بار پھر ''عبداللہ'' کے ایک نئے آغاز، لیکن پرانے تسلسل کے ساتھ حاضرِ خدمت ہیں۔ ملاحظہ کیجیے، اس Sequel کی پہلی قسط۔

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ اس سے قبل ان کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلا کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے ''عبداللہ'' کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ۔ آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

(''عبداللہ'' کے پہلے حصے، سابقہ 29 اقساط کا خلاصہ)

شہر کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان، ساحر ایک کار ریس کے اختتام پر خود کو ایک ساحلی درگاہ کے قریب پاتا ہے۔ قریب کھڑی ایک بڑی گاڑی کو دیکھنے کا شوق اسے درگاہ تک دھکیل لاتا ہے اور وہاں ایک پری وش زہرہ کی ایک ہی جھلک اسے اپنی دنیا سے بے گانہ کر دیتی ہے، لیکن زہرہ کا من جیتنا ساحر کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ واضح الفاظ میں اس کا بھیجا گیا رشتہ ٹھکرا دیتی ہے۔ ساحر کا جنوں اسے درگاہ کے متولی عبداللہ تک کھینچ لاتا ہے، جہاں اس کی سلطان بابا سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے، جو عبداللہ کے استاد ہیں۔ ساحر سلطان بابا سے بحث میں الجھ کر اپنی تقدیر کا شکوہ کرتا ہے اور سلطان بابا جواباً اُسے اکساتے ہیں کہ عشق کا حصول کچھ آسان کام نہیں۔ پہلے ساحر خود کو اس جنوں کا اہل ثابت کرے اور اپنی دنیا چھوڑ کر درگاہ پر عارضی بسیرا کرلے تو کوئی اس کے دعوے کی سچائی کو تسلیم بھی کرے۔ ساحر یہ چیلنج قبول کر لیتا ہے، لیکن تب اس پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ زہرہ کسی اور کی نہیں، خود درگاہ کے متولی عبداللہ کی نظر سے گھائل ہے، لیکن عبداللہ اسے بتاتا ہے کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور زہرہ کبھی بھی اس کی منزل نہیں رہی۔ ساحر گھر والوں کی اجازت سے درگاہ پر آ بیٹھتا ہے اور یہاں اسے اپنے نئے نام ''عبداللہ'' کی شناخت ملتی ہے۔ سلطان بابا پرانے عبداللہ کے ساتھ کسی سفر پر نکل جاتے ہیں اور ساحر، مولوی خضر کی تربیت میں درگاہ پر اپنے شب و روز گزارنے لگتا ہے۔ مولوی خضر کی معیت میں اس پر کئی نئے اسرار کھلتے ہیں اور خود زہرہ بھی ساحر کے جنوں کے آگے رکھی اپنی ڈھال کو زنگ زدہ پاتی ہے، لہٰذا ساحر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گھر واپس لوٹ جائے، کیوں کہ ساحر کا جنوں اس کے راستے کی دیوار ہے۔ ساحر گھر تو لوٹتا ہے، لیکن اپنا سب کچھ درگاہ ہی میں چھوڑ آتا ہے۔ آخر کار، ساحر کے والدین اس کی بٹی ہوئی زندگی اور تقسیم شدہ روح کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے دوبارہ درگاہ جانے کی اجازت دے دیتے ہیں، لیکن اس بار، اُس کی منزل درگاہ نہیں، بلکہ سلطان بابا کا ساتھ ہے اور ان دونوں کا پہلا پڑاؤ دور دراز کی سینٹرل جیل ہے، جہاں سکندر نامی قیدی کی پھانسی اگلی صبح طے ہے۔ مقتول کی بیوہ نائلہ خود بھی سکندر کی زندگی کی ڈور تھی، لیکن اب وہ سکندر کو پھانسی پر جھولتا دیکھنا چاہتی ہے۔ عبداللہ (ساحر) کی کوشش تو رنگ لے آتی ہے، نائلہ آخری وقت میں سکندر کو معاف تو کر دیتی ہے، لیکن خود بھی سکندر کی سانسوں کے ساتھ اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ سلطان بابا کا اگلا پڑاؤ رباب کی حویلی بنتی ہے، جہاں یاقوط نامی ایک جن زادہ رباب کی زلفوں کا اسیر ہے۔ وہ سلطان بابا کو شکست دینے کے لیے عبداللہ کے جسم پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے، لیکن جیت آخر انسان ہی کی ہوتی ہے اور رباب، یاقوط کے چُنگل سے آزاد ہو جاتی ہے۔ سلطان بابا عبداللہ کو جبل پور روانہ کر دیتے ہیں، جہاں راستے میں زہرہ کی سوتیلی بہن زریاب کو دیکھ کر عبداللہ دنگ رہ جاتا ہے اور پھر اُسے جگن نامی غنڈے کے عذاب سے بچانے کے لیے عبداللہ کو ایک بار پھر سلطان بابا کو پکارنا پڑتا ہے۔ زریاب تو جگن کی دست بُرد سے نکل آتی ہے، لیکن خود جبل پور کے خان کریم کی آنکھوں کا تارہ، لاریب، عبداللہ کے ماں باپ کی زبانی ساحر اور زہرہ کی لازوال داستان سن کر نادانستہ عبداللہ کو دل میں بسا لیتی ہے اور شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ عبداللہ کو ایک بار پھر زہرہ کے مرہم کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ زہرہ کو جبل پور طلب کر لیتا ہے، لیکن خود زہرہ اس مرتبہ عبداللہ کی مستقل مزاجی اور محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ لاریب کو زہرہ کی سچائی اور اس کے جذبے کی طاقت دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہے اور زہرہ، عبداللہ سے کہتی ہے کہ اب اس کی روح عبداللہ کے بلاوے کی منتظر رہے گی۔ سلطان بابا اور عبداللہ جبل پور سے اپنے نئے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔.....(اب آگے پڑھیے)

میری آوارگی میں کچھ دخل ہے تمہارا بھی محسن
تمہاری یاد آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا

ہمیں جبل پور سے نکلے، آج تیسرا دن تھا اور اب تک ہم دو ٹرینیں بدل چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے آس پاس کے مناظر سے سبزہ اور پہاڑ اوجھل ہوتے جا رہے تھے اور تیسرے دن دوپہر تک باہر کا موسم یک سر بدل چکا تھا۔ ریت اور گرد کے بگولے گاڑی کی ادھ کھلی کھڑکیوں اور برسوں سے زنگ خوردہ، جامد دروازوں سے ہمارے استقبال کو یوں اندر لپک رہے تھے، جیسے کوئی صدیوں کا بچھڑا اپنے گم شدہ محبوب کی طرف بڑھتا ہے، گرم لُو کے تھپیڑے چہروں کو جھلسانے لگے تھے اور باہر دوڑتی زمین کے آثار بتا رہے تھے کہ ہم کسی صحرا میں داخل ہو رہے ہیں۔ آس پاس کے مسافروں نے جلدی جلدی سامان سے تولیہ یا کوئی اور کپڑا نکال کر پانی میں بھگویا اور سر اور چہرے چھپانے لگے۔ سلطان بابا نے مجھے بھی یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا، لیکن میں مسکرا کر ٹال گیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس سے کہیں زیادہ ''شدید لُو'' تو شاید ازل ہی سے میرے اندر چل رہی ہے۔ باہر چلتی ہوا کے یہ چند گرم جھونکے بھلا مجھ جیسے کرم جلے کا کیا بگاڑ پائیں گے۔ اور پھر بات باہر کے موسم کی تھی ہی کب، جن کے اندر ہی سدا کے لیے خزاں ٹھہر گئی ہو، انہیں بیرونی تبدیلیوں سے کیا واسطہ۔ گاڑی اب باقاعدہ ایک وسیع صحرا سے گزر رہی تھی، جہاں اڑتی ریت کی زیادتی سے گرم دھوپ میں چمکتی لوہے کی پٹری بھی جگہ جگہ

ریت میں دھنس کر غائب ہو جاتی تھی۔ شاید اسی لیے ٹرین کی رفتار اب کافی مدھم پڑ چکی تھی۔ دو اہل کار ایک بڑی سی قنات نما کپڑے کی رسی لیے گاڑی کے آگے آگے بھاگ رہے تھے، جسے انہوں نے زمین پر یوں ڈھلکا رکھا تھا کہ اس کے پونچھے کی رگڑ سے پٹریوں پر پڑی ریت پونچھی جا رہی تھی۔ شاید اسی مقصد کے لیے رسّی کو اچھی طرح پانی میں بھگویا گیا تھا۔ ایک تیسرا اہل کار ایک بڑے سے کین میں پانی لیے ان کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جیسے ہی لُو کے گرم تھپیڑوں سے پونچھا خشک ہونے لگتا، وہ جلدی سے دوبارہ پانی کا چھڑکاؤ کر کے اُسے بھگو دیتا۔ بعض جگہ ریت کے ٹیلے باقاعدہ لوہے کی پٹری کے اوپر سرک آئے تھے، جنہیں ہٹانے کے لیے متعین عملے کو خاص بیلچوں کی مدد سے ٹرین رُکوا کر ریت ہٹانی پڑتی تھی۔ کہیں پڑھا تھا کہ ریت بھی ہم انسانوں کی طرح سفر کرتی ہے اور صحرا کی منزل بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، تو بہت دیر تک اس سرکتی ریت اور بدلتے صحرا کے کھیل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

رفتہ رفتہ شام ڈھلنے لگی۔ افق کے پار سورج ڈوبنے کے باوجود آتشی گلابی رنگت کی ایک واضح لکیر، یوں گاڑی کے ساتھ بہت دیر تک دوڑتی رہی، جیسے کسی دیا سلائی کا مختصر سا شعلہ رگڑ کھانے کے بعد لکڑی کی تیلی پر اپنے اختتام کی جانب دوڑتا ہے۔ صحرا کے آسمان کی حد پر قدرت نے بھی کوئی دیا سلائی سی جلا دی تھی، جو اب تیزی سے اُفق کے دوسرے پار تک اپنی گلابی آنچ پہنچا کر پورے فلک کو جلا دینا چاہتی تھی۔ مغرب کی نماز ہم نے ہچکولے کھاتی گاڑی ہی میں پڑھی اور مکمل اندھیرا ہونے تک ہمیں کسی انسانی بستی یا اسٹیشن کے آثار نظر نہیں آئے۔ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا، جب ٹرین نے ایک آخری ہچکی لی اور دھیرے دھیرے ایک ویران سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ سلطان بابا نے مجھے اشارہ کیا ''چلو میاں..... ہماری منزل آ گئی ہے۔'' میں اپنے خیالات کی رَو ٹوٹنے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہم نے جس زمین پر قدم رکھے، اسے پلیٹ فارم سے زیادہ ریت کا کوئی ٹیلہ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک برآمدے کے پیچھے تین چار کچے کمرے ایستادہ تھے، جن میں سے ایک کے اندر میل خوردہ لالٹین کی کم زور سی روشنی، کھڑکی کے ملگجے شیشوں سے چھن کر باہر آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہر چیز کو گرد اور ریت کی موٹی تہہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جب تک سلطان بابا اندر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے، تب تک میں نے پلیٹ فارم پر بچھے ایک لکڑی کے تختے نما بینچ کو دوبارہ اپنے ہاتھ سے جھاڑ کر اس کی سطح صاف کرنے کی کوشش کی، لیکن چند لمحوں ہی میں پھر سے تیز ہوا کے ساتھ اڑتی ریت نے اُسے ڈھک لیا۔ ہم انسان پوری زندگی اس گرد سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، لیکن بالآخر ایک دن یہی مٹی ہمیں اپنی پناہ میں لے لیتی ہے۔ سچ ہے ''آخر کار سب مٹی ہو جاتا ہے''

دفعتاً مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جیسے کوئی اور بھی پلیٹ فارم پر رات کے اس سناٹے میں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی تو دور پٹریوں کے دوسری پار، جہاں اسٹیشن کی حد ختم ہو رہی تھی اور جہاں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ کو بہ طور گھنٹی لٹکایا گیا تھا، ایک نوجوان لڑکی کا ہیولا سا دکھائی دیا، لیکن ٹرین تو کب کی جا چکی تھی، پھر اس ویرانے میں اتنی رات گئے، ایک تنہا لڑکی کیا کر رہی تھی۔ اس نے ایک کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر سفید پھول کڑھے ہوئے تھے، لیکن فاصلہ زیادہ اور اسٹیشن کی دم توڑتی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس کے چہرے کے خدّ و خال کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اور تبھی اچانک اپنے عقب میں مجھے سلطان بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ''کن سوچوں میں گم ہو..... ہمیں ابھی بہت سفر پیدل بھی طے کرنا ہے۔ اگر تھکن زیادہ ہو تو ہم رات بھر اسی اسٹیشن پر قیام کر سکتے ہیں، لیکن پھر بہت سویرے نکلنا ہوگا، کیوں کہ صحرا میں سورج نکلتے ہی موسم بہت شدید ہو جاتا ہے۔'' سلطان بابا کو ہمیشہ میرے ہی آرام کی فکر کھائے جاتی تھی، میں مسکرایا۔ ''نہیں..... ہم ابھی سفر کریں گے..... میں بالکل تازہ دم ہوں.....'' سلطان بابا نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے۔ میں نے پلیٹ فارم سے نکلنے سے پہلے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لڑکی اب وہاں نہیں تھی۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ کوئی واہمہ ہو، لیکن وہم اس قدر جزئیات کے ساتھ تو نہیں اُترتے۔ بہر حال، میں سر جھٹک کر صحرا میں آگے بڑھتے سلطان بابا کے نقشِ قدم پر چل پڑا۔ جن لوگوں نے صحرا کی ڈھلتی رات کو جیا ہے، وہ اس کے سحر سے ضرور واقف ہوں گے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پوری کائنات ایک آسمان بن گئی ہو اور اس پر چمکتے ان گنت تارے مجھ سے سرگوشیاں سی کر رہے ہوں کہ ''ہمیں چھوڑ کر کہاں چل دیے؟'' رات کے وقت صحرا خود ایک لامتناہی سمندر کی طرح نظر آتا ہے۔ بس، ہر موڑ پر ایک نیا سراب چھل دینے کے انتظار میں کھڑا ملتا ہے۔ جانے یہ تارے صحرا میں اتنے روشن اور چمک دار کیسے ہو جاتے ہیں، میرے مقدر کا ستارہ تو سدا کا دھندلا تھا۔

صبح ہونے سے کچھ پہلے ہم ایک صحرائی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ بستی کیا تھی، بس ویرانہ ہی تھا۔ کچے گھروں کی طویل قطاریں دور دور تک صحرا میں پھیلی ہوئی تھیں، جنہیں کیکر نما ایک جھاڑی کی باڑھ سے ڈھکا گیا تھا۔ بستی کی زبوں حالی اور غربت، ان کچے جھونپڑوں ہی سے ظاہر تھی، البتہ کچھ آگے بڑھنے پر چند پکی عمارتیں اور پھر خاکی رنگ کی ایک بہت بڑی سی قلعہ نما عمارت بھی نظر آئی۔ شاید پوری بستی میں یہی ایک واحد عمارت تھی، جہاں بجلی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی گھرر..... کی سی آواز سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ اجالا کسی بہت بڑے جنریٹر کا مرہونِ منت ہے۔ میں نے بستی کی ٹیڑھی میڑھی، اینٹوں سے چُنی سڑکوں اور کچی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک اور عجیب سی بات بھی محسوس کی کہ کسی ایک آوارہ کتے نے بھی ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید پوری بستی میں کوئی کتا تھا ہی نہیں۔ بس، ایک لرزا دینے والا سناٹا طاری تھا۔ اب بستی کا باقاعدہ بازار ختم ہو رہا تھا اور دور چند گلیوں سے پرے، صحرا میں ایک ٹیلے پر ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، البتہ بستی ختم ہو جانے کے بعد، میں جس روشنی کو بہت قریب سمجھ بیٹھا تھا، صحرا میں وہ عمارت اور وہ چراغ بھی بہت دور نکلے۔ چراغ نے دھیرے دھیرے ایک بڑی سی گیس بتی کی شکل اختیار کر لی اور ریت کا ٹیلہ دھیرے دھیرے صحرا میں کھڑے ایک بوسیدہ مزار کی عمارت کی شکل اختیار کرتا گیا۔ یہی زرد اینٹوں سے چُنا گیا، صدیوں پرانا مزار ہماری منزل تھا، جو صحرا میں ریت کے ایک بہت بلند ٹیلے پر واقع تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، دور بستی کے کچے گھر اور وہ قلعہ، بچوں کے بنائے گھروندوں سے معلوم ہو رہے تھے۔

مزار کا بوسیدہ لکڑی کا گیٹ تیز ہوا سے جھول کر، اس سناٹے میں ایک عجیب سی اور مستقل آواز پیدا کر رہا تھا، جیسے نئے آنے والے مہمانوں سے اپنی بے کسی کی فریاد کر رہا ہو۔ مزار کا صحن بھی انہی کچی اور پیلے رنگ کی اینٹوں سے جُڑا گیا تھا، جس کا استعمال قصبے کی سڑک میں نظر آیا تھا۔ صحن سے کافی پرے، چند بوسیدہ کمرے اور وسط میں ایک گنبد تھا، جس کے اوپر کی گئی پتھریلی اور منقش مینا کاری، مہ و سال کی گردش کے سبب جگہ جگہ سے اکھڑ گئی تھی اور مزار کی چھت پر کھڑا یہ عظیم گنبد اس وقت خود کسی سجدے کی سی حالت میں نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً میرے دل میں وہی پرانا سوال پھر سے جاگ اٹھا ''لوگ ان مزاروں پر کیوں آتے ہیں۔ ان برستی ویرانیوں کا ہمارے دل کی ویرانی سے کیا رشتہ ہے.....؟'' آہٹ سُن کر اندر سے ایک بوڑھا نکل آیا اور اس نے بڑے تپاک سے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ سلطان بابا اسے اکرام اللہ کے نام سے مخاطب کر رہے تھے اور جب انہوں نے عبداللہ کے نام سے میرا تعارف کروایا تو اس نے پہلے تو چونک کر ایک بار پھر سے میرا بہ غور جائزہ لیا اور پھر نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ''خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کام یاب کرے'' میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ کس مقصد کی بات کر رہا تھا؟ اگر زہرہ ہی میرا مقصد تھی، تو شاید اُسے تو میں حاصل کر چکا تھا، تو پھر زہرہ کے بعد وہ کون سا مقصد تھا، جو مجھے ان ویرانوں میں دربدر بھٹکا رہا تھا۔ یہ کیسی تلاش تھی، جو ختم ہونے کے بعد ہی شروع ہوتی تھی۔؟ کچھ ہی دیر میں فجر کا وقت بھی ہو گیا۔ اکرام اللہ صاحب نے اذان دی اور سلطان بابا کی معیت میں ہم دونوں نے باجماعت نماز پڑھ لی۔ کچھ ہی دیر میں پھر شفق سے قدرت کی وہ ان دیکھی دیا سلائی سُلگی اور مدھم شعلے جیسی اک گلابی روشنی، افق کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی جانب لپکی۔ میں پل بھر کے لیے مبہوت سا رہ گیا۔ فلک پر ایسا چراغاں، میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اکرام صاحب پیتل کی چھوٹی سی کیتلی میں چائے اور ایک چنگیر میں روٹی کے چند ٹکڑے لیے اندر سے برآمد ہوئے۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی میرے منہ میں ریت کا ذائقہ اور ذرّے بھر سے گئے۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں اس ریت بھری چائے کو نگلوں یا اُگلوں..... یہی حال گندم کے آٹے سے بنی اس روٹی کا بھی تھا۔ اکرام صاحب غور سے میری حالت دیکھ رہے تھے، دھیرے سے مسکائے ''بھئی یہاں کی ہر چیز میں تمہیں اس ریت کا ازلی ذائقہ ملے گا۔ آٹا اور چینی کتنے بھی ڈھانک کر رکھو، ریت کہیں نہ کہیں سے اندر چھن ہی آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ''کال گڑھ'' والے اب اس ریتیلے ذائقے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب تو سالن میں نمک، مرچ اور دیگر مسالوں کے ساتھ ریت کا بھی باقاعدہ حساب رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں تمہیں گھر جیسا ناشتا نہیں پیش کر سکتا۔'' ان کا آخری جملہ سن کر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ایک وقت تھا کہ ساحر صاحب صبح کا ناشتہ صرف اس لیے چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے کہ فرانس کا مارملیڈ اور مصر کا شہد میز پر موجود کیوں نہیں۔ ہالینڈ کے بنے ہوئے دلیے کے علاوہ اگر کوئی دیسی یا بدیسی کارن فلیکس ہوتا تو پورا دن مزاج بگڑا رہتا۔ ہم انسانوں کی زندگی بھی کیسے کیسے ان جانے موڑوں اور غلام گردش جیسی اجنبی گولائیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ کون، کب کیا ہو جائے..... کس کو خبر.....؟

کچھ ہی دیر میں سورج کا گولا مشرق سے بلند ہوا اور آناً فاناً جیسے ہر چیز کو آگ سی لگ گئی۔ میں نے صحرا کی گرمی اس سے پہلے کبھی نہیں جھیلی تھی۔ کبھی پاپا کاشف کے ساتھ شکار یا کیمپ فائر کے لیے جانا ہوا بھی تو ہمارے ساتھ بڑے بڑے جنریٹر ہوتے تھے اور ہمارے خیموں کو ٹھنڈا کرنے کا پورا اہتمام

ہمارے ساتھ ہی سفر کرتا تھا، لیکن یہ تپش..... دو گھنٹوں ہی میں مجھے یوں لگنے لگا تھا، جیسے میرے وجود کے ساتھ ساتھ میری روح بھی پگھل کر بہہ جائے گی۔ یہ نیلا آسمان ایسے قہر بھی برساتا ہوگا، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کال گڑھ ایک صحرائی بستی تھی، جس کے نام کی وجہ تسمیہ بھی سدا کا کال اور قحط ہی تھا۔ یہاں برسوں سے بارش نہیں برسی تھی اور پانی یہاں آبِ حیات سے بھی بڑی عیاشی تھا، قصبے میں نوے فی صد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزارتی تھی اور پوری بستی پر قلعے کے باسیوں کا قبضہ تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے اکرام اللہ صاحب سے پتا چلیں، جو خود کال گڑھ کے واحد اور برائے نام مڈل اسکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بستی کے بچوں کو درسِ قرآن دیتے تھے۔ ان کے خاندان میں ان کا اکلوتا بیٹا ہی بچا تھا، جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑے شہر میں رہتا تھا۔ اُسے کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی پسند نہیں تھی، لہٰذا وہ میٹرک کے بعد ہی باقاعدہ شہر منتقل ہوگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ قلعے کے ذکر پر اکرام صاحب کچھ بے چین اور باقاعدہ خوف زدہ سے ہوجاتے تھے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا ''آپ نے ہر چیز کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتادیا ہے، لیکن یہ قلعے اور اس میں بسنے والے قلعے داروں کا اسرار مجھے سمجھ میں نہیں آیا'' میرا سوال سنتے ہی اکرام صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ انہوں نے جلدی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ہم دونوں مزار کے برآمدے میں ستون کے گرم سائے میں چھپنے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔ سلطان بابا اندر کمرے میں آرام کرنے جاچکے تھے۔ اکرام صاحب نے سرگوشی کی ''عبداللہ میاں..... ان قلعہ داروں کے سائے سے بھی بچ کر رہنا۔ بہت سفاک اور اذیت پسند ہے، وہاں کا بڑا قلعے دار..... سارا علاقہ کانپتا ہے جبروت کے نام سے.....'' ''جبروت.....؟ یہ کیسا نام ہے.....؟'' ''نام تو ماں باپ نے شاید جابر رکھا تھا، جو پیار سے جبرو ہوا اور پھر اس کے ظلم کی دہشت نے اسے جبروت بنا ڈالا۔ اور اب وہ اسی نام سے حکمرانی کرتا ہے۔'' جبروت جو کوئی بھی تھا، اس کی دہشت، میں اپنے سامنے بیٹھے اکرام اللہ کے چہرے ہی سے محسوس کرسکتا تھا۔ انہوں نے مزید جو کچھ بتایا، وہ اس جدید دنیا میں مجھے ایک ماورائی داستان سے کچھ کم محسوس نہیں ہوا۔

کال گڑھ جبروت کی کسی ذاتی جاگیر کی مثال بن چکا تھا۔ علاقے میں کوتوالی یا پولیس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک سب انسپکٹر، ایک برائے نام سی تھانہ نما عمارت میں چار، چھ کانسٹیبلوں کی نفری کے ساتھ بیٹھتا تو تھا، لیکن اس کی حیثیت بھی جبروت کے ذاتی غلاموں جیسی ہی تھی۔ کال گڑھ کا قانون، عدالت اور انصاف، سب کچھ جبروت تھا۔ علاقے کے تمام مقدمے اسی کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہی ان کا فیصلہ کرتا تھا۔ اس کی حکم عدولی کی سزا فوری اور انتہائی اذیت ناک تھی۔ قلعے کے اندر اس نے ذاتی جیل بھی بنا رکھی تھی، جس کی کال کوٹھڑیوں میں اس کے مجرم پڑے پڑے سڑتے رہتے تھے۔ ان سے دن بھر انہی زنجیروں اور بیڑیوں سمیت مشقت لی جاتی تھی اور پھر شام ڈھلے، ان ہی بندھے بھاری پتھروں سمیت پھر سے تہہ خانوں کے زندان میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ ان میں سے تو کئی ایسے تھے، جنہیں قلعے سے باہر کا آسمان دیکھے بھی برسوں بیت چکے تھے۔ پورا قصبہ جبروت کے دیے ہوئے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور اُن کی دوسری نسل بھی اس قرض کو چکاتے چکاتے، اپنی جوانی بڑھاپے میں بدل رہی تھی۔ برسوں کے قحط نے کال گڑھ کے باسیوں کی کمر پہلے ہی توڑ رکھی تھی اور اب تو انہوں نے قرض کی اس غلامی سے باہر نکلنے کا خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ قلعے میں جبروت کے پہرے داروں اور محافظوں کی فوج کے علاوہ اس کی تین بیویاں اور کتوں کی ایک فوج بھی رہتی تھی۔ جبروت کو اگر دنیا میں کسی چیز سے پیار تھا، تو وہ اس کے پالے ہوئے خوں خوار کتے تھے، جنہیں وہ اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ویسے بھی جبروت کی تمام اولاد، بچپن ہی میں ماں کی گود ہی میں خدا کو پیاری ہوجاتی تھی۔ اسی اولاد کی خواہش میں اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں اور چوتھی بیوی کا انتقال بھی زچگی کے دوران ہی ہوا تھا، لیکن کچھ افسانے یہ بھی دہراتے تھے کہ جبروت نے خود ہی کسی بات پر ناراض ہوکر اُسے زہر دے دیا تھا، وجہ کچھ بھی رہی ہو، آج کل پھر جبروت کی چوتھی بیوی کا کمرا اور نشست خالی تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی مرتبہ ہوچکا تھا اور ہر بار پوری بستی کی اس وقت تک جان پر بنی رہتی تھی، جب تک جبروت کہیں نہ کہیں سے کوئی نئی نویلی چوتھی بیوی بیاہ کر نہیں لے آتا تھا۔ چار کی اس گنتی کو تین کرنے میں جبروت کی کسی نہ کسی بیوی کو کبھی ہیضے، کبھی سانپ کے کاٹے، کبھی بخار اور کبھی کسی دوسری ''انہونی'' کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترنا ہی پڑتا تھا۔ سچ ہے ''قدرت کے لکھے'' کو بھلا کون ٹال سکتا تھا، لیکن چار کی گنتی پوری کرنے کے چند دن بعد ہی جبروت پھر سے ان کھلونوں سے اُوب جاتا اور پھر سے قدرت کے لکھے کا انتظار کرنے لگتا۔ ہاں البتہ، اس کی دل چسپی اگر سدا کسی مشغلے میں برقرار رہی تو وہ تھی، خون خوار بھیڑیا نما کتوں کی دیکھ بھال اور نشوونما۔ سُنا تھا کہ ان کے راتب اور خوراک وغیرہ میں غفلت کرنے والے نوکروں کو وہ انہی بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دیتا تھا۔ دن میں تین مرتبہ ان کتوں کو خوراک، ورزش اور غسل کے بعد ٹہلانے کے لیے جب بستی میں نکالا جاتا تھا تو جبروت خود ان کے ساتھ ہوتا اور انہیں دیکھ کر ہی بستی والوں کا پتا پانی ہوجاتا۔ ان کتوں کے بارے میں ایک اور لرزہ خیز فسانہ بھی کال گڑھ میں زبان زدِ عام تھا۔ کہنے والے کہتے تھے، جبروت اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلتا تھا۔ اسے خود کو انصاف پسند کہلانے کا بہت شوق تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا اسے کبھی بے انصاف کا لقب نہ دے، لہٰذا اپنے دشمنوں کو مروانے سے پہلے وہ انہیں ایک پیش کش کرتا تھا کہ اگر اس کا دشمن چاہے تو اب بھی اس کی جان بخشی ہوسکتی ہے، بس اسے جبروت کے ان لاڈلوں کو ہرانا ہوگا۔ کھیل یہ طے پاتا تھا کہ ملزم کو کال گڑھ کا تپتا صحرا بھاگ کر پار کرتے ہوئے سات کوس کے فاصلے پر موجود ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ہوتا تھا۔ شکار کے سرپٹ صحرا میں دوڑنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد، جبروت کے خوں خوار درندے بھی اس دشمن کے تعاقب میں چھوڑ دیے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آج تک ایک بھی ایسا خوش نصیب ثابت نہیں ہوسکا تھا، جس کی لرزہ خیز چیخوں سے کال گڑھ کا صحرا نہ گونجا ہو۔ بستی میں داخل ہونے والے ہر ذی روح کو پہلی سلامی کے لیے جبروت کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا، ورنہ وہ شخص پہلے دن ہی سے باغی قرار پاتا تھا۔ اکرام صاحب کے بقول، میں اور سلطان بابا اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ جبروت دو دن سے کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا، لہٰذا اسے فی الحال ہماری کال گڑھ میں موجودگی کا پتا نہیں چل پایا تھا، لیکن ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی پریشان تھے کہ جب جبروت کی واپسی ہوگی تو وہ ضرور ہم دونوں سے ملنا چاہے گا۔ اکرام صاحب نے پریشانی سے سر ہلایا۔ دفعتاً تب ہی ہمارے عقب میں آواز ابھری ''جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے'' میں اچھل ہی تو پڑا۔ سلطان بابا جانے کب سے، ہمارے عقب میں کھڑے جبروت نامی اس عجیب الخلقت کردار کے فسانے سُن رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر ان کے چہرے کی جانب دیکھا، جہاں حسبِ معمول ملامت آمیز سکوت پھیلا ہوا تھا۔

اکرام صاحب ہمارے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے چلے گئے۔ اسی سوچ و بچار میں شام بھی ڈھل گئی اور پھر سے وہی خواب ناک صحرا کی رات، تاروں بھرا آنچل لیے ہمارے سروں پر آکر ٹھہر گئی۔ اکرام صاحب مغرب سے کچھ پہلے ہی واپس لوٹ چکے تھے۔ عشاء کے بعد سلطان بابا نے مجھ سے کہا ''اب تم بھی ذرا کمر ٹکا لو عبداللہ میاں..... میں بھی کمرے میں اپنی تسبیح پوری کروں گا۔'' لیکن میری بنجر آنکھوں میں بھلا نیند نے کب آبیاری کی تھی۔ سو کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد گرمی اور حبس سے پریشان ہوکر میں مزار کے صحن میں نکل آیا۔ آسمان پر چمکتے ستاروں کا کارواں مجھے دیکھ کر مُسکایا۔ میں ان تاروں میں اپنا اور زہرہ کا تارا تلاش کرنے کے لیے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا، جیسے مزار کے صحن کے باہر، میں نے کسی کے پھولوں بھرے آنچل کی ایک جھلک لہراتے دیکھی ہے۔ ہاں..... وہ وہی تو تھی، جسے میں نے کل رات ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا، لیکن وہ میرے پیچھے یہاں اس ویرانے میں آدھی رات کو اس مزار تک بھی آپہنچی، کیوں.....؟ مجھے لگا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے، لیکن کل کی طرح آج بھی ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا اور پھر اس کا وہ لمبا سا صحرائی گھونگھٹ کل کی طرح پردہ بن کر اس کے خدوخال مجھ سے چھپا رہا تھا۔ آخر وہ چاہتی کیا تھی۔ حلیہ تو اسی ریگستانی بستی ہی کا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ فضا میں دو تین جیپ نما گاڑیوں کا شور گونجا۔ میری توجہ لمحے بھر کو صحرا کی جانب ہٹی، جہاں دور تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جگمگاتی ہوئی مزار کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں نے دوبارہ وہاں نظر ڈالی، جہاں وہ کچھ دیر پہلے گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی، تو اب وہ جگہ سنسان تھی۔ شاید کسی کو آتا دیکھ کر وہاں سے بڑھ گئی ہو۔ تینوں گاڑیاں پرانے ماڈلز کی ولیز جیپیں ہی تھیں، جو اب بالکل مزار کے قریب پہنچ کر رک گئی تھیں۔ دفعتاً میرے کانوں میں بہت سے کتوں کے غرّانے کی آواز گونجی۔ جیپ سے کوئی کود کر نیچے اُترا اور اس نے بھاگ کر پچھلی جیپ کا دروازہ کھولا۔ ایک دراز قد ہیولا اندھیرے میں نیچے اُتر آیا۔ میری آنکھیں ابھی تک جیپ کی جلتی لائٹس کی وجہ سے چندھیائی ہوئی تھیں، لہٰذا روشنی کے پیچھے چھپے سائے بصارت کی پکڑ میں نہیں آرہے تھے۔ باقی اشخاص پیچھے کھڑے رہے۔ دراز قد شخص روشنی میں آگیا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ اکرام اللہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق میرے سامنے کھڑا وہ شخص جبروت کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے، اچانک جبروت کے عقب سے ایک خوں خوار کتا میری جانب لپکا۔ .....(باقی آئندہ)

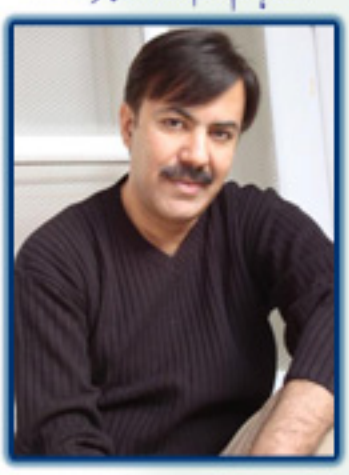

قارئین!! آپ کے بے حد اصرار پر ہم نے 24 راگست 2008ء سے سنڈے میگزین کے پہلے ناول ''عبداللہ'' کی سلسلے وار اشاعت کا آغاز کیا۔ ناول کا یہ بہت کام یاب سفر 8 مارچ 2009ء کو اپنے اختتام پر پہنچا۔ ناول کتاب کی صورت مارکیٹ میں بھی آ گیا، لیکن بھئی، قارئین نے تو فون، خطوط اور ای میلز کے ذریعے احتجاج کر کر کے جینا محال کر دیا، خصوصاً کئی خواتین نے تو باقاعدہ رونا دھونا شروع کر دیا۔ ناول کو یوں اچانک ختم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ آپ نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ ابھی تو کئی تشنگیاں باقی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو جی، ہم ایک بار پھر ''عبداللہ'' کے ایک نئے آغاز، لیکن پرانے تسلسل کے ساتھ حاضرِ خدمت ہیں۔ ملاحظہ کیجیے، اس Sequel کی دوسری قسط۔

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ اس سے قبل ان کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلا کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق انہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ۔ آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

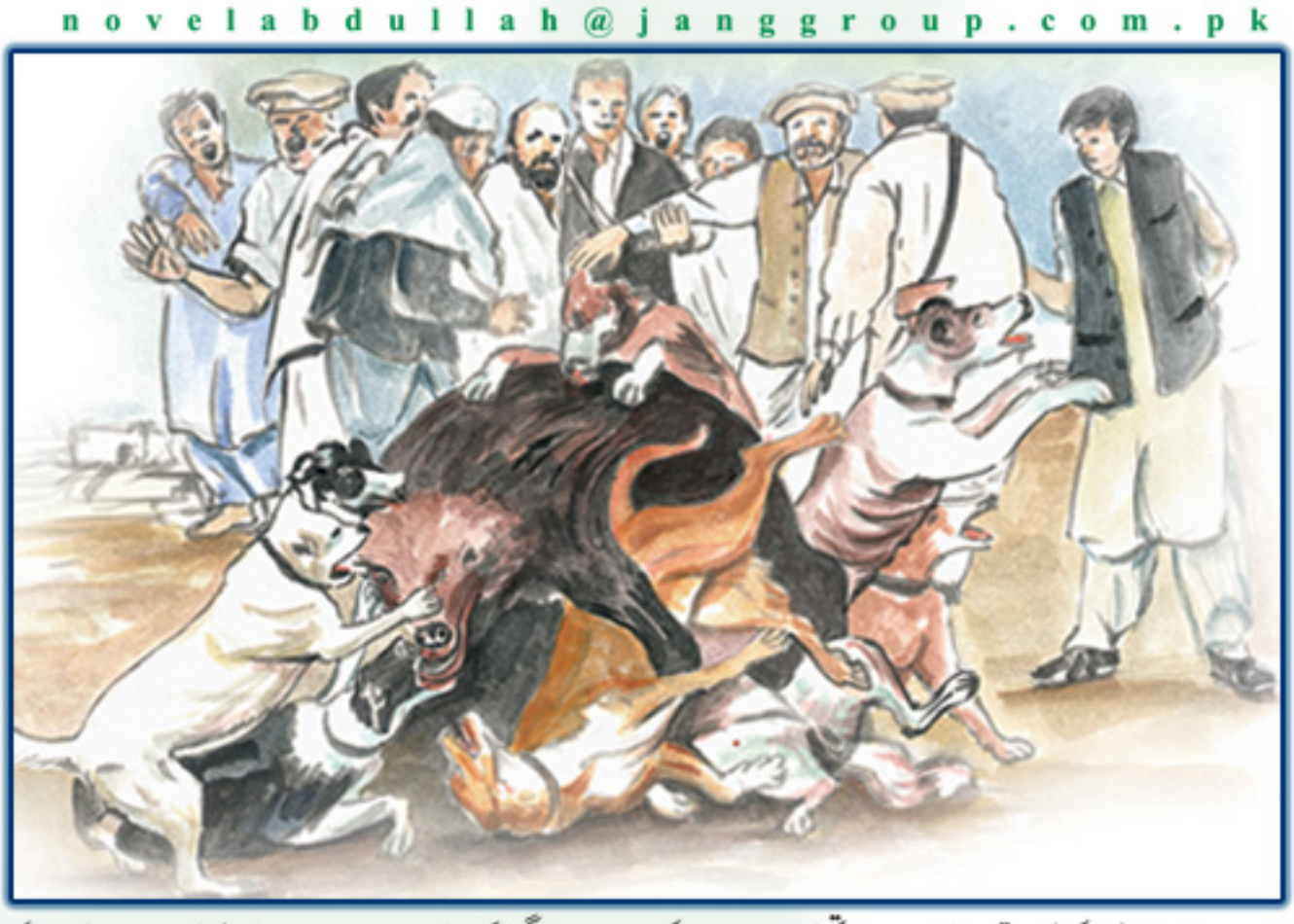

اس خوں خوار کتے کی لپک اتنی اچانک اور شدید تھی کہ میں نے اس کی غرّاہٹ سے گھبرا کر دونوں ہاتھ ہوا میں یوں بلند کیے کہ جیسے اس کے حملے کو روک ہی تو لوں گا، لیکن اچانک فضا میں جبروت کی گرج دار آواز گونجی، ''ناں..... کالے.....!!'' اور اس آواز میں جانے کیا جادو تھا کہ زقند بھرنے کے لیے تیار اور اپنے خوں خوار جبڑے کھولے اور اپنی اگلی ٹانگوں پر اپنے وزن کو تولتے ہوئے کتے کو سکتہ سا ہو گیا اور وہ وہیں زمین پر بنا آواز کے یوں بیٹھ گیا، جیسے اگر ذرا سی بھی جنبش ہوئی، تو پتھر کا ہو جائے گا۔ جبروت نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی۔ ''کون ہو تم..... اور میرے علاقے میں کیا کر رہے ہو؟'' ''عبداللہ..... مزار کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔'' جبروت کو جیسے کچھ یاد آیا۔ ''اوہاں! ہیڈ ماسٹر نے بتایا تھا، تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟'' ''وہ آرام کر رہے ہیں..... لمبے سفر کی تھکن ہے۔'' جبروت نے لمبا سا ہنکارا بھرا ''ہوں.....'' اور جانے کے لیے پلٹا، پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چلتے چلتے رک گیا ''ہیڈ ماسٹر سے کہنا، کل تم لوگوں کو قلعے سے ضرورت کا سامان دلوا دے۔ یہاں تم لوگوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔'' جبروت لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی جیپ کی جانب بڑھ گیا اور پھر اس کے بعد مجھے بھی رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے اکرام صاحب پریشانی میں ہڑبڑائے ہوئے سے تیز تیز چلتے مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ''کیا رات کو جبروت یہاں آیا تھا، اس نے کیا کہا؟'' سلطان بابا اس کی پریشانی دیکھ کر مسکرا دیے۔ ''بھئی میں تو کمرے میں تھا۔ اس کی ملاقات صرف عبداللہ سے ہوئی تھی۔ وہ در پردہ ہمیں قلعے میں حاضری لگانے کا حکم دے گیا ہے۔'' میں نے اکرام اللہ کو ساری تفصیل بتا دی، جسے سن کر ان کے ماتھے پر پڑی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ ''میری مانیں تو آپ دونوں دو گھڑی کے لیے آج وہاں سے ہو ہی آئیں۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر اچھا نہیں ہوتا۔ جو چند دن آپ لوگوں نے یہاں گزارنے ہیں، کم از کم وہ تو سکون سے گزر جائیں گے۔'' سلطان بابا پہلے ہی سے کسی گہری سوچ میں گم تھے، انہوں نے تسبیح کا آخری دانہ پڑھ کر سر اٹھایا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں، جتنا ممکن ہو، شر اور فساد سے پہلو تہی کرنی چاہیے۔ عبداللہ میاں! آج سہ پہر تم اکرام صاحب کے ساتھ قلعے سے ہو آنا۔'' میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ اکرام صاحب ہڑبڑائے۔ ''اور آپ..... آپ نہیں چلیں گے کیا؟'' ''نہیں، ابھی میرے جانے کا وقت نہیں آیا، اگر میرا پوچھیں، تو کہیے گا کہ میں بھی جلد ہی اس کے در دولت پر حاضری دوں گا۔ فی الحال میرا نمائندہ ہی سہی۔'' اکرام صاحب کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ان کے اندر کی بے چینی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے، لیکن وہ سلطان بابا کے احترام کی وجہ سے چپ ہی رہے اور میرے ساتھ سہ پہر کا وقت طے کر کے الٹے قدموں لوٹ گئے۔

رفتہ رفتہ سورج کا گولا پھر سے وہی آگ برسانے لگا، جانے کیوں اس صحرا کا یہ آفتاب میرے لیے بالکل اجنبی تھا، یہ تو کوئی دوسرا سورج تھا، میری دنیا کے سورج سے بالکل جدا، اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا، کہیں یہ اس سورج کا دوسرا رخ تو نہیں تھا۔ کہیں میں چلتے چلتے اپنے سورج کے دوسری جانب تو نہیں آ پہنچا؟ ہاں شاید یہ ایسا ہی تھا، ورنہ یہ فلک مجھ سے کبھی اتنا انجان تو نہ تھا۔ سلطان بابا آنکھیں بند کیے، تسبیح پھیر رہے تھے، میرے

آنے کی آہٹ ہوئی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ”کیوں میاں، کبھی اپنی سوچ کے گھوڑے کو لگام بھی دیتے ہو یا نہیں، کبھی تو ان اعصابی ریشوں کو آزاد بھی چھوڑ دیا کرو۔“ جانے انہیں ہر مرتبہ میری سوچ کی خبر کیسے ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں اس وقت مزار کے برآمدے میں بنے بوسیدہ سے ایک کمرے میں موجود تھے، جہاں براہِ راست لُو سے بچنے کے لیے دروازے اور پچھلی جانب کھلتی لکڑی کی جھولتی ہوئی کھڑکی کے اوپر ایک ٹوٹی پھوٹی چق اور چند کپڑے کی کترنیں لگا کر ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کی گئی تھی۔ کمرے میں فرش کی جگہ ریت کا بستر تھا اور ایک صراحی کمرے کے کونے میں ادھ بھری رکھی تھی۔ میں سلطان بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پھر من میں بہت دنوں سے مچلتا سوال میرے ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ ”ایک بات بتائیں، ہم ان درگاہوں اور مزاروں کے اردگرد ہی خدا کو کیوں کھوجتے پھرتے ہیں..... میں آپ کی طرح اسے اپنی شہ رگ کے قریب کیوں محسوس نہیں کر سکتا۔ اور ہر بار ہمارا بسیرا ایسی ہی کسی ویران درگاہ یا مزار سے متصل کیوں ہوتا ہے.....؟“ انہوں نے تسبیح ختم کر کے اپنے اور میرے چہرے پہ پھونکا۔ ”اسے کسی مزار یا درگاہ میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی اسے اپنی شہ رگ سے بھی قریب ڈھونڈنے کے لیے کسی خاص وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کائنات کے ہر گوشے میں یکساں موجود ہے۔ تمہاری یہ فکر کہ تم اسے محسوس کیوں نہیں کر سکتے، یہ بھی تمہاری اس سے قربت ہی کی ایک نشانی ہے۔ بس، اتنا ضرور یاد رہے۔ یہ فکر کبھی ختم نہیں ہونی چاہیے۔ رہی بات کہ ہم ہمیشہ ایسی ہی درگاہوں، مسجدوں یا مزاروں ہی میں کیوں قیام کرتے ہیں، تو ہمارے دروازے اب مذہب کے نام پر کچھ کم ہی کھلتے ہیں۔ ایسے میں ان بستیوں میں موجود یہی درگاہیں اور خانقاہیں اپنی بانہیں پھیلائے ہر گھڑی ہمارے استقبال کو تیار ملتی ہیں۔ ہمارے سونے کو اطلس و کم خواب کے بستر نہ سہی، پر مسجد کا فرش ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہی خاک ازل سے ہمارا مقصد اور ہمارا مقدر ہے اور ہمیں سب کو یاد دلاتے رہنا ہے کہ ہم سب نے آخر خاک ہی ہو جانا ہے۔“ میرے سوال ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ ”لیکن! اس بار آپ نے اس قدر دور دراز علاقے کا انتخاب کیوں کیا، ہم راستے میں نہ جانے ایسی کتنی درگاہیں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔“ سلطان بابا نے گہرا سا سانس لیا۔ ”اس بار معاملہ بے اختیاری کا ہے۔ اب تک تم نے جو بھی جھیلا، اس میں کہیں نہ کہیں، ہمیں کچھ اختیار ضرور حاصل تھا، لیکن اس مرتبہ ہم دونوں کسی اور کے اختیار میں ہیں میاں۔“ میں نے چونک کر ان کی آنکھوں میں دیکھا، نہ جانے کیوں مجھے سلطان بابا کی آواز میں دور کہیں کسی شدید پریشانی اور آنے والی پریشانیوں کا احساس ملا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کے دریچے وا ہوتے چلے گئے۔ ہاں سچ ہی تو تھا۔ اس پورے علاقے پر ایک ظالم اور انتہائی سفاک شخص کی حکومت تھی، ایک طرف سرحد تھی اور دوسری طرف ایک وسیع و عریض تپتا صحرا۔ درمیان میں سات کوس کے فاصلے پر وہ بستی واقع تھی، جس سے گزر کر ہی ہم کال گڑھ سے نجات کے واحد ذریعے، یعنی دن میں ایک بار گزرنے والی ٹرین کے اسٹیشن تک پہنچ سکتے تھے، جو کم از کم پیدل چار گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا، ایک دم ہی میرے رونگٹے، یہ سوچ کر ہی کھڑے ہونے لگے کہ اگر کبھی ہمیں اس بستی سے ہجرت کرنی بھی پڑتی تو اس کی اجازت اور اختیار بھی صرف اس جلاد کو حاصل تھا، جو اس پھانسی گھاٹ کا پہرے دار بھی تھا، میں نے الجھن آمیز نگاہوں سے سلطان بابا کو دیکھا۔ ”لیکن کیوں، اس بے اختیاری کی منزل سے گزرنا اس قدر ضروری کیوں، اس امتحان اور اس کسوٹی سے کیا حاصل.....؟“ ”سارا کھیل ہی تو اس اختیار و بے اختیاری میں توازن کا ہے۔ یاد رکھو، ہمارے اختیار کی حدود ختم ہو جاتی ہیں، جہاں سے ہمیں اپنے خود مختار ہونے کا زعم ہونے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب سمجھ میں آ جائے گا۔ جاؤ تم تیاری کرو، ابھی ظہر کے بعد تمہیں قلعے بھی جانا ہے۔“ جانے کیوں، ایک دم ہی میرے ذہن میں نہ جانے کتنے سوالوں کے بچھو ڈنک مارنے لگے تھے۔ اختیار و بے اختیاری کے دھاگوں میں میرا من کچھ یوں الجھا کہ مجھے اکرام اللہ صاحب کے ساتھ بستی پہنچنے تک بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ میں تب چونکا، جب بستی کے کچی اینٹوں والے بازار میں اونٹوں کی ایک لمبی قطار نے مجھے تقریباً مس کرتے ہوئے کراس کیا۔ کال گڑھ کے اس مختصر سے بازار میں سہ پہر کی اس شدید دھوپ کے باوجود اچھی خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ بازار کے بیچوں بیچ بکریوں کے ایک ریوڑ کی خرید و فروخت جاری تھی، جس کے ساتھ ہی ایک پرانی سی دکان میں جلیبیاں تلی جا رہی تھیں۔ دکان دار پرانے اخبارات کے بنڈل پھاڑ پھاڑ کر گاہکوں کو شیرے سے بھری نارنجی جلیبیاں پکڑا رہا تھا اور بالکل سامنے خشک گھاس اور بھوسے کے گٹھے بیل گاڑی سے اتروائے جا رہے تھے، سنہری بھوسا نارنجی شیرے میں ضم ہو رہا تھا اور پچھلی جانب پرانی سائیکلوں کے انبار کے بیچ، ایک کاریگر سامنے ٹب میں پانی بھرے، پرانی ٹیوبوں کو پنکچر لگا رہا تھا۔ بازار کے سرے پر ایک دھنکیا پرانی رضائیوں اور لحافوں کی روئی دھن رہا تھا اور فضا میں اڑتے اون اور روئی کے ننھے بگولے گرد اور ریت کے ساتھ ہمارے حلق میں پھنس رہے تھے۔ اگلے نکڑ پر ایک ماشکی پرانی سی مشک میں انتہائی گدلا پانی بیچ رہا تھا۔ اون دھننے والے کے اوزار کی دھن دھن، اونٹوں کی جرس، بھیڑ بکریوں کا شور، گرم شیرے کے نیچے جلتے الاؤ کی دھونکنی اور ماشکی کے آوازے..... سب مل کر چند لمحوں کے لیے اس مردہ کال گڑھ کو کس قدر زندہ کر گئے تھے۔ موڑ مڑتے ہی قلعے کی آسمان سے باتیں کرتی خاکی چار دیواری شروع ہو گئی۔ جیسے جیسے ہم قلعے کے مرکزی دیوہیکل دروازے کی جانب بڑھتے گئے، ویسے ویسے قلعے کے اندر سے ایک عجیب سے وحشت ناک شور کی آوازیں بلند ہوتی گئیں اور پھر جیسے ہی میں نے اکرام صاحب کے پیچھے بڑھتے ہوئے قلعے کی چار دیواری میں اپنا پہلا قدم رکھا، تو ان کرب ناک چیخوں کا راز بھی کھل گیا۔ وحشت اور بربریت کا ایک خوف ناک کھیل عین قلعے کی بیرونی چار دیواری کے وسط میں کھیلا جا رہا تھا۔ میرے قدم جیسے زمین ہی میں گڑ گئے۔ جبروت اپنے حواریوں کے جھرمٹ میں ایک اونچے سے تخت پر براجمان وحشیانہ انداز میں چیخ رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا اور غصے میں گالیاں بک رہا تھا۔ اس کے سامنے کھلے میدان میں ایک لمبی اور موٹی سی فولادی زنجیر گلے میں ڈالے ایک عظیم الجثہ سیاہ ریچھ اپنا خون خون بدن لیے کھڑا جھول رہا تھا اور جبروت کے آٹھ خوں خوار کتے چاروں طرف سے، اس بیڑیوں میں جکڑے قیدی ریچھ پر حملے کر رہے تھے اور ریچھ کے جسم سے لپٹے کتے اسے بھنبھوڑ رہے تھے اور گھائل ریچھ کا زخم زخم بدن خون کا فوارہ بنا ہوا تھا، لیکن ریچھ نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اب بھی وہ پوری قوت سے ان وحشی کتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے نرخرے سے عجیب سی خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی نکیل کا کڑا زور لگانے کی وجہ سے اس کی ناک کی نازک جلد کو چھیدتا ہوا ہڈی کے اندر تک دھنس چکا تھا، جس کی ناقابلِ برداشت اذیت نے ریچھ کو انتہائی حد تک خطرناک کر دیا تھا، اور وہ کرب اور تکلیف سے بے حال، غصے میں پاگل ہو کر چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ آٹھ طرفہ حملے کو کسی طور روک پائے۔ یہ سارا وحشیانہ کھیل ایک بہت بڑے ہجوم کے دائرے میں ہو رہا تھا۔ تماشائی جبروت کے خوف کے سبب صرف کتوں ہی کو داد دے رہے تھے۔ خود جبروت کا وحشی پن بھی عروج پر تھا۔ وہ کتوں کی ہمت بڑھانے کے لیے انہیں چلا چلا کر ہشکار رہا تھا اور کتوں کے منہ سے بہتے کف کی طرح، اس کی رال بھی فرطِ جوش سے بار بار ٹپک رہی تھی۔ جب کوئی کتا ریچھ کو گہرا زخم لگانے میں کام یاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر ریچھ کی خوش قسمتی سے کوئی کتا اس کے پنجے کے تھپیڑے یا گرفت میں آ جاتا تو جبروت بے قابو ہو کر اپنے کتوں اور ان کے سدھارنے والے خدمت گاروں کو گندی گندی گالیاں دینے لگتا۔ ان پر غراتا، چلاتا اور بالکل ہتھے سے اکھڑ جاتا۔ مقابلہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور تھکن اور پیاس کے مارے کتوں کی زبانیں باہر لٹک آئی تھیں، لیکن شاید ایسے مقابلوں میں کتوں کو پانی کے قریب نہیں پھٹکنے دیا جاتا، تب ہی کتوں کے رکھوالے انہیں بار بار پانی سے دور ہانک دیتے تھے، ان میں وہ کتا بھی شامل تھا، جسے جبروت نے رات ”کالے“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ دفعتاً ریچھ کو ایک موقع ملا اور ایک چتکبرے کتے کی غلط چھلانگ نے اسے ریچھ کے بازوؤں کی لپیٹ میں دے دیا۔ ریچھ نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا اپنی گرفت شدید تر

کردی اور میں نے اتنی دور کھڑے ہونے کے باوجود اس کان پھاڑ دینے والے شور میں بھی اس کتے کی ریڑھ کی ہڈی کے چٹخنے اور پھر ٹوٹ کر تڑ کنے کی آواز سنی۔ کتے کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور زمین پر گرتے ہی چند لمحے تڑپنے کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اسی اثناء میں ریچھ کا پنجہ پوری قوت سے لہرایا اور ''کالا'' ہوا میں لہراتے ہوئے ہجوم کے دائرے سے باہر جا گرا اور گرتے ہی بے سدھ ہو گیا۔ جبروت کا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور وہ زور سے چلایا ''مرنے دے اس مردار کو، کوئی ہاتھ نہ لگائے اس حرام خور کو.....'' آٹھ میں سے دو کتوں کو ریچھ نے مکمل پچھاڑ دیا تھا، لیکن اسے اب بھی چھ طرفہ حملے کا سامنا تھا اور ریچھ کے جسم سے تیزی سے بہتا خون، اب اسے دھیرے دھیرے نڈھال کر رہا تھا۔ جبروت نے جھولتے اور ڈگمگاتے ریچھ کو دیکھا، تو اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ اس نے پاس کھڑے ڈھولکئے کو ڈھول پیٹنے کا اشارہ کیا۔ ڈھول کی پہلی تھاپ سنتے ہی، ادھ مرے کتوں میں جیسے بجلی کی لہر سی کوند گئی اور ان سب نے اپنے گھائل جسم سمیٹے اور ایک ساتھ ہی ریچھ کے شکستہ جسم پر حملہ آور ہو گئے۔ جانے کیوں، اس لمحے مجھے وہ اذیت و کرب سے لہراتا ریچھ رومن دور کے ان جنگجوؤں کی یاد دلا گیا، جنہیں گلیڈیٹر (Gladiater) کہا جاتا تھا اور جنہیں رومن بادشاہ سزا کے طور پر اسی قسم کے اکھاڑوں میں بھوکے شیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے، صرف ایک ڈھال اور نیزے کے بل پر اتار دیتے تھے، لیکن یہاں تو ڈھال اور نیزے کا تکلف بھی نہیں تھا۔ بالآخر ایک کتا ریچھ کے نرخرے میں اپنے خونیں جبڑے گاڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ریچھ کے نرخرے سے خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور آس پاس کئی تماشائیوں کے کپڑے سرخ چھینٹوں سے داغ دار ہو گئے۔ دوسرے کتے موقع پا کر ریچھ کی تھوتھنی اور نکیل والے حصے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ گلیڈیٹر ہار چکا تھا، زمین پر گرنے سے پہلے اس نے ایک بے کسی کی نگاہ اکھاڑے کے بے حس تماشائیوں پر ڈالی اور اس کا عظیم جثہ بے دم ہو کر زمین چھونے کے لیے آخری بار جھول کر ڈھلکا، لیکن اس سے پہلے ریچھ کے مالک کی آنکھ سے ٹپکے دو آنسو زمین کو اپنی آخری سلامی پیش کر چکے تھے۔ ایک زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ ریچھ زمین پر گرا اور گرد کا ایک طوفان اٹھا۔ چھ کتوں میں سے دو مزید شدید زخمی حالت میں ایک جانب پڑے تڑپ رہے تھے اور باقی چار کی حالت سے بھی ایسا لگتا تھا کہ انہیں پھر سے اپنے معمول کی حالت تک پہنچنے کے لیے ہفتوں درکار ہوں گے۔ جبروت نے فتح کا نعرہ لگایا اور ڈھولکیے نے ڈھول کی تان تیز کر دی۔ تماشائی آگے بڑھ بڑھ کر جبروت کو مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک نے مٹھائی کے ٹوکرے کا منہ کھولا اور ایک شان دار حریف کی موت کے جشن میں مٹھائی تقسیم کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے رش میں سے راستہ بنایا اور مجھے کھینچتے ہوئے جبروت کے قریب لے گئے۔ نہ جانے اس شور میں جبروت کو ان کی بات سمجھ میں آئی یا نہیں، لیکن اس وقت وہ خوشی سے اس قدر سرشار تھا کہ اس نے میرے وجود کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی اور اپنے کسی کارندے کو چلا کر راشن دینے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں جب ہم قلعے سے باہر نکل رہے تھے، تو اکرام صاحب کے ہاتھ میں آٹے، چاول اور گڑ کے چند تھیلے موجود تھے۔ جبروت اس ہنگامے کی وجہ سے میرے دوسرے ساتھی یعنی سلطان بابا کی کمی محسوس نہیں کر سکا تھا اور اس بات پر اکرام صاحب سارا راستہ اللہ کا شکر ادا کرتے آئے کہ چلو بلا ٹلی تو سہی۔

میرا من اس وحشیانہ کھیل کو دیکھنے کے بعد اس قدر پژمردہ ہوا کہ میں شام تک ایک گھونٹ پانی بھی اپنے حلق سے نیچے نہیں اتار سکا۔ بار بار میری نظروں کے سامنے اس بے بس اور لاچار ریچھ کی وہ پُرنم آنکھیں اور اس کے ہار کر زمین پر گرنے کا منظر آ جاتا۔ سلطان بابا بہت دیر تک مجھے یوں گم صم بیٹھا دیکھتے رہے۔ انہیں اکرام صاحب نے واپس جانے سے پہلے ساری کہانی سنا دی تھی کہ میں کیوں اتنا گم صم سا واپس لوٹا ہوں۔ مغرب کے بعد سلطان بابا تسبیح ختم کر کے میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت ہوا بالکل بند تھی اور دن کا سورج ڈھلنے کے بعد چاند ایک دوسرے تپتے سورج کے روپ میں طلوع ہونے کی تیاری میں تھا۔ انہوں نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''کیوں میاں، کچھ سمجھ میں آیا، یہ اختیار اور بے اختیاری کا کھیل۔ آج دوپہر کو جو کچھ تم نے دیکھا، وہ بھی اسی معمے کی ایک کڑی ہی تو تھی۔'' میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا ''وہ کیسے؟'' ''بھئی ذرا غور کرو تو وہ بے بس جانور بھی ہماری زندگی کا ایک استعارہ ہی تو تھا، اور آٹھ جانب سے لپکتے وہ حملہ آور، وہ مجبوریاں، جرم، گناہ اور فریب کے وہ حملے تھے، جو ہم تمام عمر جھیلتے ہیں اور ریچھ کی آخر کار وہ موت اختیار سے بے اختیاری کی جانب، اس کا آخری سفر تھا۔ اس کے پیروں سے بندھی وہ زنجیر اور اس کی ناک میں ڈلی نکیل، ہمارے معاشرے کی پابندیاں اور قانون سمجھ لو۔ کبھی کبھی یہ بیڑیاں رشتوں کی صورت بھی ہمیں جکڑے رکھتی ہیں۔ زندگی خود اختیار کی ایک قسم ہے اور موت بے اختیاری ہے۔ ہاں البتہ، اس جانور اور انسان میں ایک واضح فرق ضرور ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اختیار کی حدیں کسی بھی مخلوق سے بہت زیادہ ہیں۔'' مجھے سلطان بابا کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی، لیکن میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ معما بھی از خود مجھ پر کھل ہی جائے گا۔ اچانک مجھے وہ لڑکی یاد آئی، جس کا ہیولا میں دو مرتبہ کال گڑھ آنے کے بعد دیکھ چکا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے ذکر کیا تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے ''بعض مرتبہ یہ صحرا ہم انسانوں سے عجیب خواب و سراب کے کھیل کھیلتا ہے، لیکن سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہے، خاص طور پر اگر یہ کسی انسانی ہیولے کا معاملہ ہے۔ اگر تیسری مرتبہ پھر وہ شبیہہ تمہیں دکھائی دے، تو اس کے قریب جانے کی کوشش کرنا، لیکن یاد رہے، صحرا کا فسوں بڑا گہرا ہوتا ہے۔''

عشاء کے بعد سلطان بابا اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں پھر سے اپنے نصیب کے چند ستاروں کے ساتھ، اس کالی رات میں مزار کے صحن میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ ہماری زندگی کی زیادہ تر انہونیوں کا تعلق رات ہی سے کیوں ہوتا ہے؟ کیا دن کا اجالا بہت سے حقائق کو ڈھانپ لیتا ہے، حالاں کہ عموماً ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ ڈھانپنے اور پردہ ڈالنے کا واسطہ اندھیرے سے ہوتا ہے، لیکن مجھ پر تو زیادہ تر رات ہی کھلتی تھی اور دن ہمیشہ ہی سے میرے لیے ایک دبیز پردے کا کام سرانجام دیتا رہا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ہوا کے دوش پر مجھے دور سے کسی بانسری کی لے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں تک تو میں اس آواز کو بھی اپنا واہمہ ہی سمجھتا رہا، لیکن پھر سلطان بابا کی کہی ہوئی بات نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ''ہاں، واہموں اور سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہوتا۔'' لیکن یہ مدھر لے تو لگاتار اور مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مزار سے نکل کر اس ٹیلے کی جانب قدم بڑھائے، جہاں سے آواز آ رہی تھی، قریب پہنچنے پر وہ آہٹ کی آواز سنتے ہی بانسری تھم گئی اور کوئی دھیمی سی آواز میں بولا..... ''نوری..... تم ہو.....؟'' میں ٹیلہ پار کر کے دوسری جانب آ گیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اندازے سے آواز لگائی ''میرا نام عبداللہ ہے، میں صحرا کے مزار کا نیا خدمت گار ہوں، تم کون ہو.....؟'' چند لمحے دوسری جانب خاموشی رہی اور پھر ایک نوجوان لڑکا بانسری ہاتھوں میں تھامے ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ ''اوہ..... میں کچھ اور سمجھا تھا، نیچے آ جاؤ، میرا نام سانول ہے۔ میں یہیں کال گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ مجید مستری کا بیٹا۔'' لڑکے نے صحرا کی روایت کے مطابق اپنا مکمل تعارف کروا دیا تھا اور اب میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا نام اور مزار سے تعلق دوبارہ دُہرانے کے بعد کہا، ''تم بانسری اچھی بجا لیتے ہو، لیکن اتنی دور ویرانے میں اور یوں آدھی رات کو.....'' اس نے میری بات کاٹ دی ''میرے باپ کو میرا بانسری بجانا پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بھی اس کی طرح قلعہ داروں کے ہاں مہینے بھر کی گندم اور گڑ کے بدلے نوکری کر لوں، پر مجھے وہ غلامی پسند نہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں بھی تمہاری طرح کسی مزار یا درگاہ کا مجاور بن جاؤں۔ ویسے بھی میرا یہاں دل نہیں لگتا۔'' مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ''مجاور بن کر کیا کرو گے، مجاور تو بانسری بھی نہیں بجا سکتے.....'' وہ بھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ''ہاں واقعی، یہ تو ہے، پر تم مجھے کچھ دوسرے قسم کے مجاور لگتے ہو۔ میں تمہیں بانسری سناؤں، تم نے کبھی موسیقی سنی ہے۔'' اب میں اسے کیا بتاتا کہ ابھی کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا کوئی چارٹ ٹاپر (Chart topper) ایسا نہیں تھا، جو میرے ذاتی کلیکشن میں شامل نہ ہو۔ بیک اسٹریٹ بوائز اور وٹنی ہیوسٹن کی ایل ڈیز سے میرے کمرے کے شیلف بھرے رہتے تھے اور دنیا کے ہر کونے سے میرے دوست میرے لیے نئی تخلیقات بھیج کر میرا خزانہ بڑھاتے رہتے تھے۔ گھر، گاڑی، یونیورسٹی، پارٹی، کلب، ڈسکو، ہر جگہ، ہر لمحہ یہ تانیں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ سانول مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ہچکچایا۔ ''اگر تمہیں پسند نہیں تو میں نہیں بجاتا'' ''نہیں نہیں، تم بجاؤ، مجھے بانسری کی اتنی سمجھ تو نہیں، لیکن پھر بھی تمہاری لے تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔'' سانول کا چہرہ خوشی سے چمک سا گیا۔ اس نے جلدی سے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگائی اور ایک پرانے گیت کی تان چھیڑ دی۔ اس کی نظریں بانسری بجائے ہوئے بھی مستقل مجھی پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ اپنی دھن کا اثر میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دنیا کا ہر ہنر، ہر فن اک ستائش ہی سے تو متصل ہوتا ہے۔ ایسے دیوانوں کی ہر کوشش خود کو منوانے اور ہجوم میں الگ و ممتاز رہنے کی ایک پروانہ وار کوشش ہی تو ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے اپنے ہنر کی تعریف کا بھوکا رہا ہے۔ میرے ذہن میں ''خدا اور محبت'' کا ایک جملہ گونجا ''اپنے ہنر کی تعریف کی یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے۔ تب ہی انسان سے تاج محل جیسے شاہ کار سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہ تعریف اور سراہے جانے کا جذبہ ہم میں نہ ہوتا، تو شاید ہم اب تک پتھر کے دور ہی میں زندہ ہوتے.....'' انہیں سوچوں میں گم، میں سانول کی بانسری کی مدھر تان سن رہا تھا کہ اچانک مجھے سانول کے عقب میں کچھ دور اسی لڑکی کا سراپا لہراتے ہوئے نظر آیا۔ ہاں..... وہی تھی..... بڑا سا پلو لیے، میں ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ سانول کے ہاتھ سے بوکھلاہٹ میں بانسری چھوٹ گئی اور وہ گھبرا کر بولا۔ ''یا اللہ خیر..... کیا ہو گیا.....؟''

(باقی آئندہ)

جیون سے اگر لفظ نکل جائیں تو ہم کس قدر نامکمل، کھوکھلے سے ہو جائیں، اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

.....ہاشم ندیم ☆ قسط نمبر 3.....

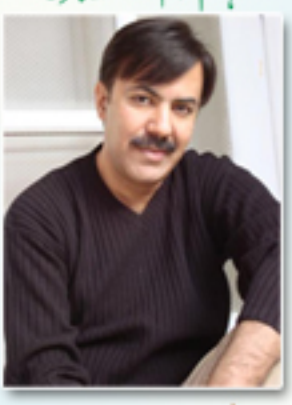

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ ''وہ..... لڑکی.....'' سانول نے بھی جلدی سے پلٹ کر دیکھا، یہی وہ چند لمحے تھے، جب میری توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی ہوگی، لیکن اب جب ہم دونوں نے سانول کے عقب میں دیکھا، تو وہاں صرف سناٹا ہی تھا۔ سانول کچھ دیر تک حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے پیچھے مڑ مڑ کر اس اَن دیکھے وجود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''تم بھی اس صحرا کے چکر میں آ گئے نا، معاف کرنا مزار کے پچھلے خدمت گار کو میں حافظ جی کہتا تھا، لیکن تم تو میرے ہی ہم عمر ہو۔ برا نہ مانو، تو میں تمہیں عبداللہ کہہ کر ہی پکارا کروں.....؟'' ''تم جو چاہو مجھے پکار سکتے ہو، لیکن میں کسی وہم کا شکار نہیں ہو رہا۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ اس لڑکی کو دیکھ چکا ہوں۔'' اب سانول کے چونکنے کی باری تھی۔ ''اچھا.....؟ ذرا مجھے اس کا حلیہ تو بتاؤ۔'' میں نے جلدی جلدی جو کچھ میرے حافظے میں محفوظ تھا، اس کے سامنے دُہرا دیا۔ سانول میری بات سن کر ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا۔ ''بڑا سا پلو، پھولوں والی چادر، ہاتھ میں کہنیوں تک سفید چوڑیاں، سانولا سا رنگ، ماتھے پر بندیا..... تم کہو، تو ایسی دو درجن لڑکیاں میں کال گڑھ کے بڑے میدان میں آج صبح ہی بلوا لوں۔ ارے بھئی، یہ تو اس علاقے کی ہر دوسری لڑکی کا حلیہ بتا دیا ہے تم نے۔ یہاں سب ہی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کوئی خاص نشانی یاد ہو تو بتاؤ؟'' میں سانول کی بات سن کر مخمصے میں پڑ گیا۔ ''خاص نشانی.....؟ ارے ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کسی نوری کو پکارا تھا، کہیں یہ وہی تو نہیں تھی۔؟'' سانول، نوری کا نام سنتے ہی کچھ سٹپٹا سا گیا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے، پھر وہ شرما کر بولا۔ ''نہیں جی..... وہ نوری نہیں ہو سکتی..... میں تو یونہی ہر آہٹ پر اس کا نام پکار بیٹھتا ہوں، وہ بھلا اس ویرانے میں آدھی رات کو کہاں سے آئے گی۔ اس پر تو دن میں بھی ہزار پہرے لگے رہتے ہیں۔'' میں نے شرم سے لجاتے سانول کو چھیڑا۔ ''اوہ..... تو یہ بات ہے، پر یہ نوری ہے کون.....؟'' ''نوری میری منگ ہے جی! یہیں کال گڑھ میں رہتی ہے۔ آپ مزار پر ہیڈ ماسٹر اکرام اللہ سے تو ضرور ملے ہوں گے، نوری انہی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ پوری آٹھویں جماعت تک پڑھا ہے اس نے، پھر اس کے باپ نے گھر بٹھا لیا۔ ویسے بھی آگے پڑھنے کے لیے کال گڑھ سے بیس کوس دور، دوسری بستی کے ہائی اسکول تک جانا پڑتا ہے۔'' سانول شرما شرما کر اپنے اور نوری کے رشتے کی بابت بتا رہا تھا کہ کیسے، اس کے گھر والے نوری کے گھر رشتہ لے کر گئے اور پھر نوری کے گھر والوں نے سانول کی نشانی تو رکھ لی، لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ جب تک سانول برسرِ روزگار نہیں ہو جاتا، وہ بیٹی کو رخصت نہیں کریں گے، لیکن کال گڑھ میں روزگار کے نام پر صرف قلعے داروں کی غلامی ہی تھی، جو سانول کو کسی صورت منظور نہیں تھی، کیوں کہ قلعے کے قرضے کے چنگل میں ان لوگوں کی تیسری نسل پس رہی تھی اور سود در سود کا یہ جال کال گڑھ والوں کو کسی ان دیکھے خون آشام عفریت کی طرح جکڑے ہوئے تھا۔ سانول کا باپ بھی اس سے بچ نہیں پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوری کو اب تک بیاہ کر گھر نہیں لا سکا تھا، کیوں کہ بستی کے تمام رشتوں کا فیصلہ ہر سال قرض ادا کرنے کے موقع پر جبروت کی پنچایت ہی کرتی تھی۔ لوگ اپنا پرانا قرضہ چکاتے اور اپنے پیاروں کے رشتے کے لیے نئے قرض کی گھڑی اپنے شانوں پر ڈالے، قلعے سے نکل آتے۔ اسی لیے سانول کا باپ چاہتا تھا کہ سانول بھی قلعے داروں کی نوکری کر لے، تاکہ باپ، بیٹا دن رات محنت کر کے قلعے کا تمام قرض اسی سال چکتا کر دیں اور سانول کا رشتہ پکا ہو سکے، لیکن خود سانول کو یوں رشتے کے بہانے بار بار نوری اور اس کے گھر والوں کا قلعے بلایا جانا، ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔ اس کا بس چلتا، تو وہ نوری کو سات پردوں میں، زمانے کی نظر اور ہر دید کی آنچ سے بچا کر چھپا رکھتا، لیکن وہ اس وقت بے بس تھا، کیوں کہ نوری پر اس کا پورا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور یہی بات سانول کو ہر دم پریشان رکھتی تھی، اس نے نوری کو بھی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے باپ یا چچا کے بغیر کبھی اپنے گھر کے آنگن سے قدم بھی باہر نہیں دھرے گی، کیوں کہ جبروت کے حواری اور گُرگے آوارہ کتوں کی طرح پورا دن کال گڑھ کی گلیوں میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سانول کے بقول، جب سے نوری کے

ساتھ اس کی منگنی طے ہوئی تھی، وہ ویسے بھی دُہرے عذاب کا شکار تھا۔ پہلے تو پھر بھی کبھی کبھار اسے نوری کی ایک آدھ جھلک نصیب ہو جاتی تھی، لیکن اب تو وہ اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں سانول کو بتاؤں کہ کوئی بھی منگنی یا دوسرا بندھن، اس کا قصوروار نہیں، یہ سارا قصور تو اس محبت کا ہے، جو اپنے جلو میں ہر بار جانے ایسی کتنی بے چینیاں، درد اور لاحاصل پن کی چبھن لے کر آتی ہے، جب تک ہمیں کسی سے محبت نہیں ہو جاتی، وہ شخص ہمارے لیے کس قدر عام ہوتا ہے۔ ہزاروں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک، ہمارے آس پاس باقی لوگوں کی طرح چلتا پھرتا اور ہماری دسترس میں۔ لیکن جیسے ہی ہمیں اس سے محبت ہو جاتی ہے، پل بھر میں وہ ہمارے لیے کس قدر ناممکن، کتنا لاحاصل ہو جاتا ہے۔ وہ جو پہلے پہروں ہماری محفل میں سامع بنا بیٹھا رہتا تھا، اب اس کی قربت کی دو گھڑی کے لیے بھی ہم ترس جاتے ہیں۔ یہ محبت آخر ہے کیا بلا..... کیا اپنے ساتھ ہی یہ مجبوریوں، پریشانیوں، دوریوں اور کرب کا ایک دریا لیے وارد ہوتی ہے؟ پہلے میں سمجھتا تھا کہ محبت کا نزول ہی ہمیشہ دو ایسے افراد کے درمیان ہوتا ہے، جن کا ملن ناممکنات کا دوسرا نام ہو، لیکن اب مجھ پر یہ راز دھیرے دھیرے آشکارا ہونے لگا کہ اصل میں محبت خود اپنے ساتھ ایک ایسا سحر لیے نمودار ہوتی ہے کہ جو ہمارے محبوب کو ہمارے لیے پری زاد بنا دیتا ہے۔ جانے کوہ قاف کے بلند و بالا پہاڑ خود بخود ہمارے درمیان کہاں سے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ زمانے کی نظر بدل کر برچھی کیوں بن جاتی ہے۔ اپنے بھی پرائے ہو کر طعنے مارنے لگتے ہیں، ہمدردی طنز میں بدل جاتی ہے۔ کل تک پلکوں پر بٹھانے والے بیخ پا ہو کر سرزنش کرنے لگتے ہیں۔ یہ محبت ہمیشہ ہمارے اردگرد کا ہر موسم، رویہ ہمارے خلاف کیوں کر دیتی ہے۔ ہر بہار کو خزاں میں بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں اپنے آپ تک سے جدا کر دیتی ہے۔ یہی سب کچھ سانول کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ رات گئے تک مجھ سے اپنا درد بانٹتا رہا۔ جانے اس نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر اتنا بھروسا کیوں اور کیسے کر لیا تھا، رخصت ہوتے وقت بھی اس نے مجھ سے کئی بار وعدہ لیا کہ میں روز رات کو کچھ دیر کے لیے صحرا میں اس سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

میں جب سانول کو الوداع کہہ کر مزار کے صحن میں داخل ہوا تو صبح کی اذان کا وقت قریب ہی تھا۔ سو، وہیں کچی اینٹ کے صحن کو بستر بنا کر اور ہاتھوں کے تکیے پر سر رکھ کر کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا اور پتا نہیں، کس گھڑی میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں مجھے عجیب سے سائے ڈراتے رہے۔ میں نے اچانک خود کو اسی وسیع و عریض اور لق و دق صحرا کے بیچوں بیچ کھڑا پایا۔ سوا نیزے پر آیا سورج میرے سر پر اپنی تپتی کرنوں کی برچھیاں لیے کھڑا ہے اور پھر اچانک ہی مجھے بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں گھبرا کر ایک طرف کو دوڑتا ہوں تو آٹھوں کتوں کو اپنے تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتے پاتا ہوں اور پھر ان میں ایک کتا اچھل کر میرے نرخرے میں اپنے دانت گاڑ دیتا ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں..... یا اللہ..... یہ خواب تھا یا کوئی عذاب.....! سلطان بابا صحن ہی میں ایک برتن سے پانی لے کر وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا، ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت احتیاط سے پانی کا استعمال کر رہے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد میں نے انہیں اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔ میں نے سنا تھا کہ صبح کے قریبی خواب سچے ہوتے ہیں۔ سلطان بابا میرا خواب سن کر کچھ خاموش سے ہو گئے۔ میں نے اصرار کیا تو دھیرے سے بولے، ''خواب تقدیر نہیں ہوتے، کبھی کبھی مستقبل کی ایک جھلک ضرور ثابت ہو جاتے ہیں اور اگر یہ جھلک سچی ہے، تو آنے والے دنوں میں یہ صحرا تمہاری بہت بڑی امتحان گاہ ثابت ہوگا، نہ صرف تمہارے لیے، بلکہ خود میرے لیے بھی..... لیکن ہمیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ جسم صرف اس دنیاوی زندگی کا ایک استعارہ ہے۔ اصل حیات تو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔'' نہ جانے سلطان بابا کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ میں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ صحرا کی بے رحم دھوپ نے مزار کی روشوں پر ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔ میں ابھی تک رات کے خواب کے اثر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ کوئی کتا درد سے بے چین ہو کر رو رہا ہے۔ چند لمحے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ بھی رات والے خواب ہی کا کوئی تسلسل ہے، لیکن جب ایک ہی آواز وقفے وقفے سے مزار کی عقبی دیوار سے ابھرنے لگی، تو مجھے خود کو مجتمع کر کے اٹھنا ہی پڑا اور پھر جب میں تپتی ریت میں پیر دھنساتے ہوئے عقبی سمت تک پہنچا، تو اپنی جگہ جم کر ہی رہ گیا۔ دیوار کے نامکمل سائے میں ادھ مرا ''کالا'' پڑا ہوا تھا۔ ہاں، جبروت کا وہی لاڈلا کتا، جس نے پہلی رات مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور گزشتہ روز جسے ریچھ نے پوری قوت سے اپنے پنجے کے ایک ہی تھپیڑے سے ہوا میں اچھال کر ہجوم کے دائرے سے پرے پھینک دیا تھا۔ مجھے اکرام اللہ صاحب نے بتایا تھا کہ جبروت اپنے ہار جانے والے یا شدید زخمی کتوں کو مرنے کے لیے صحرا میں پھنکوا دیتا ہے۔ شاید کالے کو بھی ادھ مرا سمجھ کر وہ لوگ صحرا میں پھینک گئے تھے، لیکن وہ اس حالت میں یہاں تک کیسے آ پہنچا۔ کتے کا جسم بری طرح زخمی تھا اور ریچھ کے خوں خوار پنجوں نے کالے کا پیٹ بری طرح سے ادھیڑ دیا تھا۔ وہ گرم ریت پر کچھ اس طرح پڑا ہوا تھا کہ اس کی دھونکنی جیسی چلتی سانس اور منہ سے لٹکی زبان ریت چاٹ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ بہ کر ریت میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کتے نے اپنی جگہ سے حرکت کی کوشش کی، لیکن وہ صرف ایک کراہ کے بعد نڈھال ہو کر پھر وہیں پڑ کر رہ گیا۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں، میں جلدی سے بھاگ کر مزار کے احاطے میں پڑی پرانی مشک اٹھا لایا، جس کی تہ میں ابھی کافی پانی موجود تھا۔ میں نے چند قطرے جانور کے چہرے پر ٹپکائے تو اس نے جلدی سے زبان باہر نکال دی اور پانی کی گرتی بوندوں کو بے تابی سے اپنے حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے زخم کی اصل گہرائی کا اندازہ ہوا، لیکن افسوس میرے پاس اس وقت وہاں کوئی ایسا مرہم نہیں تھا، جسے میں زخم پر لگاتا۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں دوبارہ اندر کی طرف دوڑا۔ ایک پرانا ٹاٹ کا ٹکڑا صحن کی دیوار کے پاس پڑا نظر آیا۔ میں نے دیوار میں بنے طاق کے اندر سے ماچس اٹھائی اور ٹاٹ کو آگ لگا دی۔ بچپن میں ایک بار کاشف کی بلی کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا، تب میں نے اپنے لنگوٹیے یار کو یہی نسخہ آزماتے دیکھا تھا۔ ٹاٹ کی راکھ میں نے کالے کے زخم کے اوپر بکھیر دی۔ پتا نہیں، اسے اس سے سکون ملا یا نہیں۔ میں رات کی بچی ہوئی روٹی کے چند خشک ٹکڑے بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ روٹی نگلنے اور پانی پینے کے بعد وہ مجھے کچھ سکون میں دکھائی دیا، لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا، بے زبانی..... اچانک ہی مجھے اس زبان اور ان لفظوں کی شدید اہمیت کا احساس ہوا۔ ہمارے پاس یہی لفظ ہی تو ہوتے ہیں، سب سے خاص، سب میں ممتاز کر دینے والے..... اور اگر ہماری زندگی سے یہ لفظ نکال دیے جائیں، تو ہم کس قدر نامکمل، کس قدر کھوکھلے ہو جائیں۔ بے زبانی کا کرب جس شدت سے اس لمحے میں نے محسوس کیا، شاید ہی کبھی کیا ہو، کالے نے اپنے جسم کو تولا اور تقریباً گھسٹتے ہوئے ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا، یہیں پڑا رہے، لیکن میں تو اشاروں کی زبان بھی نہیں جانتا تھا اور پھر بات اشاروں کی زبان تک ہی کہاں مخصوص تھی۔ میں تو بول کر بھی بعض مرتبہ اپنے لفظوں کو گونگا ہی پاتا تھا۔ کالے نے اونچے ٹیلے سے پلٹ کر ایک بار تشکر بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر ریت کے اڑتے گرم بگولوں میں غائب ہو گیا۔ اتنے میں اندر مزار کے صحن سے کسی کی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں پلٹ کر واپس صحن میں داخل ہوا، تو اکرام صاحب ایک بوڑھے جوڑے کے ساتھ سلطان بابا کے قریب بیٹھے دکھائی دیے۔ بوڑھے کی نظر شاید بالکل ہی جواب دے چکی تھی، لہٰذا وہ بڑھیا کے سہارے ٹٹول ٹٹول کر سلطان بابا سے مخاطب تھا۔ میں بھی سلام کر کے خاموشی سے ان لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بڑھیا گزارے لائق بھی اردو نہیں بول سکتی تھی، سو بوڑھے ہی کو اس کے حصے کے الفاظ بھی ادا کرنے پڑ رہے تھے۔ خود بوڑھا بھی اپنا مدعا ٹوٹی پھوٹی اردو اور صحرائی زبان کی آمیزش میں بیان کر رہا تھا۔ اکرام صاحب بھی درمیان میں لقمے دیتے رہے۔ ماجرا کچھ یوں تھا کہ بوڑھے اور بوڑھی کی نواسی چھ ماہ پہلے بیاہ کر اپنے گاؤں سے، میاں سمیت کال گڑھ سے دو گاؤں آگے، رحمان گڑھ کے لیے روانہ ہوئی تھی، لیکن وہ اور اس کا شوہر کبھی رحمان گڑھ نہیں پہنچ پائے۔ لڑکی کے گاؤں اور رحمان گڑھ کے بیچ صرف کال گڑھ کا ریلوے اسٹیشن ہی پڑتا تھا اور تلاش کے دوران چند ریلوے

ملازمین نے اتنی گواہی تو ضرور دی تھی کہ انہوں نے اس رات ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کو کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس کے بعد وہ دوبارہ ٹرین پر سوار ہوئے یا کہیں اور نکل گئے، اس کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ لڑکی کے ماں، باپ تو چند سال پہلے ہی خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ لڑکی کے نانا، نانی نے ہی پال پوس کر اسے بڑا کیا اور بیاہا تھا۔ لڑکا رحمان گڑھ میں کوئلے کی کان میں مزدور تھا اور ہفتے بھر کی چھٹی لے کر صرف بیاہ کے لیے اپنی دلہن کے گاؤں آیا تھا۔ بوڑھا اور بوڑھی اپنی نواسی کی جدائی میں بے حد نڈھال تھے۔ خاص طور پر بڑھیا کے تو آنسو ہی نہیں رکتے تھے، بقول اس کے، اسے کال گڑھ کی مٹی میں سے اس کی سکینہ کی خوش بو آتی تھی اور گزشتہ چھ ماہ ہی سے وہ دونوں در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے، لیکن ابھی تک ان کی نواسی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا، نہ ہی اس کے شوہر کا کوئی پتا تھا۔ کال گڑھ کی ناکارہ پولیس بھی چند دن کی دکھاوے کی دوڑ دھوپ کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی تھی اور اب تو حوالدار نے باقاعدہ ان دونوں کا داخلہ بھی تھانے میں بند کروا دیا تھا کہ کون روزانہ ان دو خبطی بوڑھوں کی تکرار سنتا پھرے۔ اکرام صاحب نے سلطان بابا کو یہ بھی بتایا کہ شروع میں سب سے پہلے سکینہ کے نانا، نانی نے علاقے کی روایت کے مطابق جبروت سے بھی رابطہ کیا تھا اور جبروت نے چند دن اپنے ہرکارے آس پاس کے علاقوں میں دوڑائے بھی کہ شاید کہیں لڑکا لڑکی کا کچھ پتا چل سکے، لیکن چند دن بعد کارندے بھی تھک ہار گئے۔ اب تو جبروت نے بوڑھے اور بڑھیا سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ظاہر ہے، اس کے پاس کتنے لڑانے جیسے اور بھی بہت سے اہم کام ہوتے تھے، وہ کب تک اپنے وفاداروں کو ہلکان کرتا، لیکن سکینہ کی نانی یہ علاقہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے اب بھی امید تھی کہ اس کی لاڈلی کی اگر کوئی خبر ملے گی، تو وہ یہیں کال گڑھ سے ملے گی۔ بڑھیا نے بوڑھے کے کان میں کچھ کہا اور بوڑھے نے اسے ڈانٹا۔ بڑھیا نے پھر منت کی۔ بوڑھا بادل ناخواستہ گڑگڑایا۔

”میری لگائی سٹھیا گئی ہے پیر صاحب۔ آپ سرکار لوگ ہو، برا نہیں ماننا، پر یہ کہتی ہے کہ اسے روزانہ کئی مہینوں سے ہر رات ایک ہی عجیب سا خواب آتا ہے کہ ہماری سکینہ اس صحرا میں دوڑ رہی ہے اور اس کے پیچھے بہت سے کتے لگے ہوئے ہیں۔ سکینہ زور زور سے رو رہی ہے اور ہمیں پکار رہی ہے.....“ میں زور سے چونکا۔ کچھ ایسا ہی خواب تو میں نے بھی رات کو دیکھا تھا۔ یہ صحرا کیا اپنے سبھی باسیوں کو ایک جیسے ہی خواب دکھاتا تھا۔ بوڑھا گڑگڑا رہا تھا۔ ”آپ ہمارے لیے دعا کرو پیر جی..... ہم بہت مجبور اور بے کس ہیں۔ بڑی دور سے چل کر آئے ہیں۔ یہاں کوئی ہماری فریاد سننے والا نہیں ہے۔“ بوڑھا بولتے بولتے بھرّا سا گیا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر مزار کی بنجر زمین میں جذب ہو گئے۔ بڑھیا نے اپنے مرد کو روتے دیکھا تو جلدی سے اپنا دکھڑا بھول کر، پلّو سے اس کی آنکھیں پونچھنے لگ گئی۔ عجیب نظارا تھا، دو مجبور اور بے بس انسان ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے تھے، حالاں کہ وہ دونوں اس بات سے باخبر تھے کہ ان کا دلاسا جھوٹا ہے۔ پتا نہیں کیوں، ایک دم ہی میرا دل بھر آیا اور میں نے وہاں سے اٹھ جانے کی ٹھان لی۔ اتنے میں مزار کے دروازے سے زوردار آواز کے ساتھ سلام کی آواز سنائی دی، آنے والا سانول تھا، جو وہیں دروازے کے قریب کھڑے ہو کر مجھے پاس آنے کے اشارے کر رہا تھا۔ مجھے تو ویسے بھی وہاں سے ٹلنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ سانول کے قریب پہنچ کر میں نے اس سے پوچھا۔ ”خیر تو ہے..... کہیں نوری کے لیے کوئی منت مانگنے تو نہیں آئے۔“ وہ مسکرایا۔ ”منتوں سے اگر پیارے ملتے تو کال گڑھ کا یہ مزار اتنا ویران نہ ہوتا جناب.....“ ”واہ..... بڑی بات کہہ دی تم نے، کہو، کیسے آئے؟“ سانول نے کچھ رازدارانہ انداز میں میرے قریب ہو کر بتایا کہ نوری کی کسی سہیلی نے اسے پیغام بھجوایا ہے کہ نوری عصر کے بعد اپنے والدین کے ساتھ مزار پر دعا کرنے آئے گی۔ شاید چچا اکرام بھی ساتھ ہوں۔ سانول بھی اس وقت کسی بہانے مزار پر آنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے یہی بتانے کے لیے اس جھلسا دینے والی دھوپ میں دوڑتا ہوا یہاں تک آیا تھا کہ میں اس کی مدد کروں اور اس کے ذمے کوئی ایسا کام لگا دوں کہ وہ جب مزار پر آئے، تو نوری کے گھر والوں کو شک نہ ہو اور وہ برا نہ مانیں۔ بقول سانول، نوری کے گھر والے اس معاملے میں بہت سخت تھے، خاص طور پر اپنے پرانے استاد ہیڈ ماسٹر اکرام صاحب سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ میں نے اس کی رام کہانی سننے کے بعد مسکرا کر اس سے پوچھا کہ ”جہاں اس نے اتنی محنت کی ہے، وہیں ضرور کوئی اچھا سا بہانہ بھی خود ہی سوچ لیا ہوگا۔“ سانول بھی ہنس دیا۔ ”اس کا انتظام بھی میں نے کر دیا ہے۔ آج جمعرات ہے، میں یوں ظاہر کروں گا کہ جیسے تمہارے کہنے پر مغرب کے بعد پڑھ کر بانٹنے کے لیے چنے اور گڑ وغیرہ لے کر آیا ہوں۔ پچھلے حافظ جی بھی ہر جمعرات کو یہی نیاز بانٹا کرتے تھے۔“ یہ محبت کرنے والوں کو ہمیشہ ایسے بہانوں کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ میں نے سانول کو تسلی دی کہ وہ بے فکر ہو کر واپس جائے۔ میں اس ”معاونتِ عشق“ کے جرم میں اس کا پورا ساتھ دوں گا۔ سانول کو پریشان دیکھ کر میں یہی سوچتا رہا کہ یہ پیار اپنے ساتھ اتنی کڑی پابندیوں کے کانٹے کیوں لے کر آتا ہے۔ ہفتوں صحرا میں سر پٹخنے اور پاؤں میں چھالے پڑنے کے بعد آج جب محبوب کا دیدار نصیب ہو بھی رہا تھا تو وہ صرف چند گھڑیوں کے لیے، اور اس کے لیے بھی سو بہانے اور تاویلیں گھڑنی پڑ رہی تھیں۔ یہ پیار اور محبت کا جذبہ، ہماری رگوں سے تمام خون نچوڑنے کے بعد ہی خوشی کی دو بوندیں ہماری روح کے کشکول میں کیوں ڈالتا ہے۔ جاتے جاتے سانول کی نظر صحن میں سلطان بابا کے قریب بیٹھے بوڑھے اور بڑھیا پر پڑی۔ ”اوہ..... یہ بے چارے یہاں بھی آ پہنچے.....؟ تم جانتے ہو انہیں.....؟ کال گڑھ میں کون ہے، جو انہیں نہیں جانتا، پچھلے چھ ماہ سے علاقے کے ہر گھر کی چوکھٹ پر دستک دے چکے ہیں یہ دونوں۔ بڑا ظلم کیا ہے قدرت نے ان کے ساتھ۔ جانے ان کی نواسی کہاں کھو گئی ہے۔ علاقے کے سب ہی جوانوں نے چپہ چپہ چھان مارا، لیکن ان دونوں کا آج تک کہیں پتا نہیں چلا۔ اب تو باقی سب کی طرح میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ضرور وہ لوگ کال گڑھ سے کہیں آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ یہاں ہوتے تو ان کا کچھ نشان تو ملتا؟“ جاتے جاتے سانول ایک بار پھر سے اپنا پورا منصوبہ دُہرا کر اور مجھ سے تصدیق کروا کر واپس پلٹ گیا۔ سلطان بابا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ میں بھی آ کر دعا میں شامل ہو گیا۔ دعا ختم کر کے سلطان بابا نے سکینہ کے نانا، نانی کو تسلی دی کہ انشاءاللہ جلد ہی ان کی لاڈلی کا کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔ اکرام صاحب نے دعا کے بعد واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ بڑھیا نے بوڑھے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور سلطان بابا سے رخصت ہو کر جانے کے لیے پلٹے۔ بڑھیا کی گود سے کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی پھسل کر نیچے زمین پر گر گئی، لیکن اسے شاید اس کی خبر نہیں ہوئی۔ میں بھی انہیں جاتا دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ پہلے میری نظر بھی وہاں نہیں گئی، پھر جب احساس ہوا، تب تک وہ مزار کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے اکرام صاحب کو آواز دے کر روکا اور جلدی سے پوٹلی اٹھا کر انہیں تھمانے کے لیے دروازے کی جانب دوڑا۔ پوٹلی کی گرہ شاید نرمی سے لگائی گئی تھی، تب ہی وہ بیچ راستے ہی میں کھل گئی اور دو چار کپڑے نکل کر صحن میں بکھر گئے۔ ریت کا تیز بگولا مزار کے صحن میں داخل ہو گیا اور میں نے جلدی جلدی کپڑے سمیٹنے شروع کر دیے۔ ریت میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی، کپڑے کیا تھے، چند کترنیں ہی تھیں۔ تیز ہوا نے ایک زنانہ دوپٹے کو دور پھینک دیا۔ میں باقی کپڑے سمیٹنے کے بعد اس جانب بڑھا، جہاں مزار کے صحن میں اُگے کیکر کے ایک جھاڑ میں وہ دوپٹا اٹکا ہوا تھا۔ ریت کے اڑتے ذرّوں نے آس پاس سب ہی کچھ دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی میری نظر اس دوپٹے پر پڑی اور میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے۔ یہ..... یہ تو وہی پھولوں والی چادر کا ایک حصہ تھا، جو میں نے اس ان جان لڑکی کو اوڑھے دیکھا تھا۔ ہاں، وہی تو تھا..... لیکن یہ دوپٹا..... یہاں کیسے.....؟ میں نے جلدی سے کیکر سے کپڑا علیحدہ کیا اور اسے لے کر تقریباً دوڑتا ہوا دروازے کے قریب کھڑے جوڑے تک پہنچا۔ اکرام صاحب بھی میری ہڑبڑاہٹ دیکھ کر گھبرا سے گئے۔ میں نے جلدی سے پوچھا، ”یہ کپڑے کس کے ہیں؟“ اکرام صاحب نے جواب دینے کے بجائے بوڑھے کی جانب دیکھا۔ بوڑھے نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”یہ ہماری سکینہ کی چادر کا آدھا حصہ ہے۔ شادی کے بعد آتے ہوئے اس نے اپنی بدنصیب نانی کو اپنی نشانی کے طور پر دیا تھا۔ اب یہ اسے اپنے سینے سے لگائے پھرتی ہے جی۔ کہتی ہے، اس میں سے اسے اپنی لاڈلی کی خوش بو آتی ہے۔“ میرے ذہن میں بہ یک وقت جانے کتنی آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب تک جوان جانی لڑکی رات کے اندھیرے میں مجھے اس صحرا میں دکھائی دیتی رہی، وہ سکینہ ہی تھی۔

(باقی آئندہ)

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

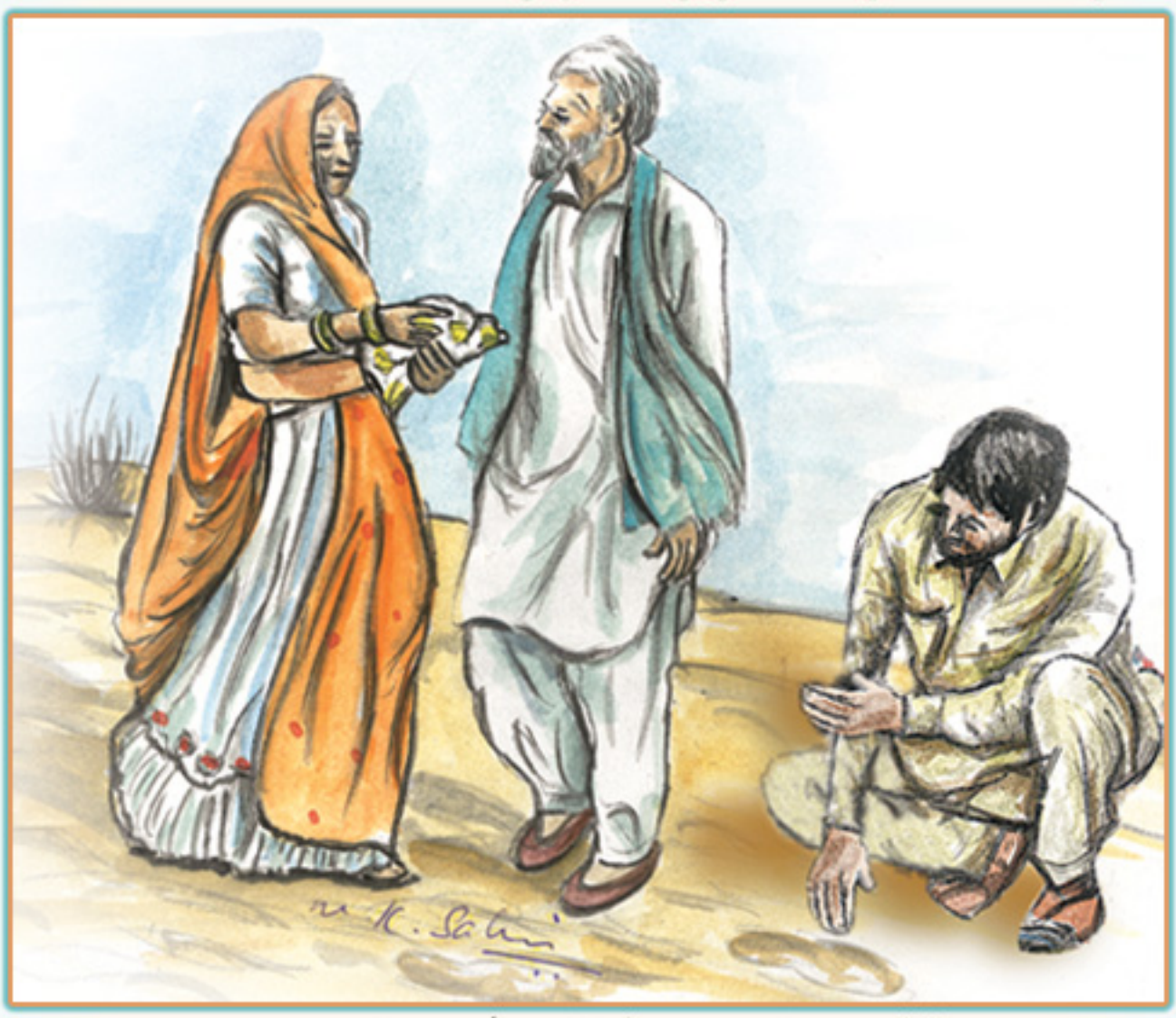

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر ان دونوں کو بتاؤں کہ میں نے سکینہ کو دیکھا ہے، لیکن نہ جانے وہ کون سا احساس تھا، جس نے مجھے اس اعلان سے باز رکھا۔ بوڑھا اور بڑھیا، اکرام صاحب سمیت اپنی نواسی کے کپڑوں کی پوٹلی لیے پلٹ کر چل دیے اور میں وہیں ریت کے شدید طوفان میں مزار کے دروازے کے قریب گُم صُم سا کھڑا رہ گیا۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ریت کی چادر نے میرے سارے وجود کو اپنی جلتی چادر سے ڈھک دیا۔ یہ کیسا اسرار تھا؟ اگر وہ لڑکی سکینہ ہی تھی، جو مجھے ایک آدھ نہیں، پورے تین بار دکھائی دی تھی، تو پھر وہ گزشتہ اتنے عرصے میں کال گڑھ کے دوسرے باسیوں کو کیوں نظر نہیں آئی تھی؟ لیکن کیا صرف ایک پھولوں والی چادر کی مشابہت کی بناء پر مجھے اتنا بڑا دعویٰ کرنا بھی چاہیے یا پھر مزید کسی ثبوت کا انتظار کرنا چاہیے۔ میں انہی سوچوں میں گم رہا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب عصر کا وقت گزر گیا۔ سلطان بابا نے ٹوکا تو میں نے جلدی سے سورج ڈھلنے سے کچھ قبل نماز ادا کی۔ آج مزار پر ہلکی پھلکی چہل پہل بھی تھی، شاید جمعرات کی وجہ سے۔ کچھ ہی دیر میں اکرام اللہ صاحب ایک پکی عمر کے مرد اور عورت کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، ایک سانولی سلونی سی نوجوان لڑکی، علاقے کی ریت کے مطابق بڑا سا پلو نکالے، اندر چلی آئی۔ اچھا تو یہ تھی، سانول کی نُوری..... واقعی سانول کی تڑپ اور بے چینی بلاوجہ نہیں تھی۔ نوری کے نور سے مزار چند لمحوں کے لیے جگمگا سا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی سادگی میں کس قدر کشش ہوتی ہے، کچھ سراپے خود سرتاپا، ایک گہنا ہی ہوتے ہیں۔ انہیں مزید کسی زیور کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ نوری نے بھی سادہ سفید چوڑیاں کہنی تک ڈال رکھی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ اور اکرام چچا کے ساتھ دعا میں مشغول تھی اور میں بار بار باہر صحرا کی طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ نہ جانے سانول کہاں رہ گیا تھا، اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ نوری کی خاص سہیلی نے نوری سے بھی چھپ کر اس کے مزار آنے کی یہ خبر سانول تک پہنچائی تھی۔ نوری کی سب ہی سہیلیاں سانول کی اس بے قراری سے واقف تھیں اور سب ہی کی دلی خواہش تھی کہ نوری جلد از جلد سانول کی ہو کر اس کے گھر چلی جائے، اس لیے وہ نوری کی ناراضی کا خطرہ مول لے کر بھی ایسی حرکت کر گزرتی تھیں، جس سے ان دونوں کو دو گھڑی ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع مل سکے۔ نوری کا سکون بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے سانول کی آمد کی خبر نہیں ہے، ورنہ ایسے شفاف آئینے کہاں کچھ چھپا پاتے ہیں۔ نوری نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور میں نے دورِ صحرا میں نوری کی ہتھیلیوں کے حلقے سے پرے سانول کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے مزار کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی زوردار انداز میں ہم سب کو سلام کیا اور ایک بڑا سا کپڑے کا تھیلا ایک جانب رکھتے ہوئے بولا ''چھوٹے پیر جی..... آپ نے دعا کے لیے جو سامان منگوایا تھا، سب لے آیا ہوں۔'' اس کی اس ''چھوٹے پیر جی'' کی اصطلاح نے مجھے بے ساختہ مُسکرانے پر مجبور کر دیا۔ نوری نے چونک کے پلٹ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر بہ یک وقت حیا، شرم اور کچھ کچھ غصّے کی لالی بکھر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سانول کی اس ''سعادت مندی'' کے پیچھے کیا راز ہے۔ سانول نے باقی سب لوگوں سے بھی علیک سلیک کی اور میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر بار بار پھسل کر نوری کے چہرے کا طواف کر رہی تھی اور چند لمحوں پہلے کسی گہری جھیل کی طرح پُرسکون نظر آنے والی نوری، کسی سمندر کے بے چین مدّ و جزر کی طرح بل کھانے لگی تھی۔ دعا ختم کرنے کے بعد نوری کے والدین نے سلطان بابا سے چند لمحوں کی ملاقات کی۔ اکرام صاحب نے ان سب کا تعارف کروایا۔ اس تمام عرصے میں نوری مستقل سر جھکائے کھڑی رہی۔ سانول کا دیا ہوا لقب، نوری کے ماں، باپ کی زبان پر بھی چڑھ گیا تھا اور وہ رخصت ہوتے وقت تک مجھے ''چھوٹے پیر'' کے نام ہی سے پکارتے رہے۔ گویا سلطان بابا کال گڑھ کے بڑے پیر تھے اور میں اُن کا معتمد، چھوٹا پیر۔ سانول کی بے چینی ظاہر کر رہی تھی کہ اُس کی منّت صرف نوری کی اک نظر ہے، لیکن اس پیکرِ حیا نے بھی جیسے صرف مزار کی زمین پر بچھی ریت ہی کو نہارنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ نوری نے آخری وقت تک اپنی نظر جھکائے رکھی، حتیٰ کہ اس کے ماں باپ اور چچا مزار کے دروازے تک پہنچ گئے۔ سانول بالکل ہی پژمردہ سا ہونے لگا۔ میرے دل سے بے اختیار ایک صدا نکلی کہ اُس کے حصّے کی نظر اسے نصیب کر دے اور ٹھیک اُسی لمحے نوری نے مزار سے نکلتے نکلتے ایک پل کے لیے پلٹ کر سانول کی جانب دیکھا۔

کیا کچھ نہیں تھا، اس ایک نظر میں، حجاب، ستائش، سرزنش اور ایک الوداع..... تب تک کے لیے جب قدرت ایک بار پھر، ان دونوں کا سامنا کرادے۔ سانول اپنی جگہ بُت سا کھڑا رہ گیا اور نوری پلٹ کر چل دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک نظر سانول کو کیا کچھ دے گئی ہے، لیکن مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اب اگلی ملاقات تک سانول کے جگر میں نوری کی یہ آخری نظر، زہر میں بجھے ہوئے ایک تیر کی طرح پیوست رہے گی۔ نہ جانے کتنے جگ راتے اور دھوپ کے کتنے پہر اسی ایک نظر کی کسک اور تڑپ کے اثر میں گزر جائیں گے۔ صورت چاہے کوئی بھی ہو، یہ محبت ہر حال میں ایک دودھاری تلوار ہی تو ثابت ہوتی ہے، نہ ملو تو جدائی کاٹتی ہے اور ملاقات ہو جائے تو محبوب کا جلوہ، جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ سانول بھی اب صرف اپنی راکھ کی صورت ہی میں اس مزار کے احاطے میں موجود رہ گیا تھا اور گرم ہوا کے تیز بگولے اور ریت کا طوفان، اس راکھ کو پورے مزار کی چار دیواری میں اُڑا رہا تھا۔ یہ جذبے بھی کتنے منہ زور ہوتے ہیں، ایک لمحے ہی میں کیسے کیسے زندہ دلوں کو خاک کر دیتے ہیں۔ سانول بھی کچھ دیر بعد اپنے اس ریزہ ریزہ اور خاکستر وجود کو لیے واپس پلٹ گیا۔ مغرب کے بعد جب سلطان بابا نے اپنی تسبیح ختم کی، تو میں نے انہیں سکینہ کے دوپٹے والی ساری بات بتائی کہ اس چادر کا دوسرا حصہ پہنے ہوئے میں نے صحرا میں اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ سلطان بابا میری بات سُن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے تو لہجہ تب بھی کھویا کھویا سا تھا۔ ”گویا وہ صرف ایک سراب ہی نہ تھی، قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینے والی ہے ساحر میاں! خیال رہے کہ اب قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔ ویسے میرا قیاس ہے کہ اب وہ لڑکی تمہیں دوبارہ دکھائی نہیں دے گی۔ اس نے تمہیں جو اشارہ دینا تھا، وہ دے چکی، اب آگے کی کھوج تمہاری اپنی ذمے داری ہے۔“

ہمیشہ کی طرح میں سلطان بابا کی پوری بات سمجھ نہیں پایا اور چُپ ہی رہا، کیوں کہ مجھے اندازہ تھا کہ سلطان بابا مجھے اتنا ہی بتاتے ہیں، جتنا میرے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی اور میری ازلی وحشت اور بے چینی کا دور بھی شروع ہونے ہی کو تھا کہ مجھے باہر سے وہی مخصوص غرّاہٹ سنائی دی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ”کالا“ بھوک لگنے پر اب ہمیشہ مزار کی چار دیواری ہی کا رخ کیا کرے گا، کیوں کہ اس کے پرانے مالک نے تو اسے اس کی زندگی بھر کی وفاداری کا صلہ ایک ”دیس نکالے“ کی صورت ہی دیا تھا۔ وہ وہیں اپنی مخصوص جگہ پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک پرانے برتن میں پانی کا مستقل انتظام کر دیا تھا۔ روٹی کے چند ٹکڑے نگلنے کے بعد کالا وہیں پیر پسار کر بیٹھ گیا۔ جانے اسے اتنی سمجھ کیسے آ گئی تھی کہ وہ مزار کی چار دیواری کے اندر پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ اتنے میں صحرا کی طرف سے سانول کی پُرسوز بانسری کی لَے ہوا کے دوش پر بکھری۔ اس کی تان میں جو درد آج تھا، اسے شاید صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ شاید، شیلے نے کہا تھا کہ ”ہمارے سب سے میٹھے نغمے وہی ہوتے ہیں، جو ہمارے اندر کے شدید غم کو بیان کرتے ہیں۔“ آج سانول کی بانسری بھی شیلے کے اس قول کو سچ ثابت کر رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے ہونٹوں سے بانسری ہٹالی۔ میں نے قریب جا کر اسے چھیڑا۔ ”مجھے نہیں پتا تھا کہ نوری کی ایک جھلک، تمہاری دُھن کو اتنی زندگی بخش دے گی، ورنہ اس کے ماں باپ سے کچھ دیر مزار پر ٹھہرنے کی التجا ضرور کرتا۔“ سانول پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”میں ہر لمحہ اسے دیکھنے کے لیے تڑپتا ہوں، لیکن جب بھی کبھی اس کی ایک آدھ جھلک پالیتا ہوں، تو پھر ہفتوں یونہی اداس اور بے چین رہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے عبداللہ.....“ ”پہلے تو تم یہ فیصلہ کر لو کہ میں عبداللہ ہوں یا چھوٹا پیر، پھر اس کے بعد ہم مل کر اس درد کا مرہم بھی ڈھونڈ لیں گے۔“ اس مرتبہ سانول خود کو کھلکھلا کر ہنسنے سے روک نہیں پایا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میں اُسے یاسیت کے اس دور سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ اس محبت نے آج تک خوشی کم ہی بانٹی ہے۔ کیکر کا مقدر صرف کانٹے ہوتے ہیں، گلاب نہیں۔

میں ابھی تک سکینہ کے بھید میں الجھا ہوا تھا، میں نے سانول سے دوبارہ اُس کا تذکرہ کیا کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ جس لڑکی کی جھلک، میں نے صحرا میں تین مرتبہ دیکھی ہے، وہ سکینہ ہی تھی، لیکن اس بار سانول کا ردِعمل بہت چونکا دینے والا تھا۔ اس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنی انگلی کی مہر لگا دی اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کر کے سرگوشیانہ انداز میں بولا ”میری ایک بات مانو گے، اس بات کو یہیں ختم کر دو، یہ کھوج تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“ مجھے اس کے رویّے پر شدید حیرت ہوئی۔ ”کیوں.....؟ ایسا کیا ہے، اس کھوج کے انجام میں۔ دیکھو، اگر تمہیں اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی پتا ہے تو مجھے ضرور بتاؤ، کیوں کہ اب تو دھیرے دھیرے مجھے بھی یہ یقین ہونے لگا ہے کہ میری کال گڑھ آمد کا مقصد ہی صرف یہ کھوج ہے۔“ سانول نے بات ٹالنے کی بہتیری کوشش کی، لیکن میرے مصمم ارادے کے آگے اُسے ہار ماننی پڑی۔ ”میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتا، لیکن شاید دوسروں سے کچھ بڑھ کر معلومات رکھتا ہوں۔ سکینہ اپنے شوہر کے ساتھ کال گڑھ کے اسٹیشن پر کیوں اُتری، اس کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن وہ ایک رات بستی کے کس مکان میں ٹھہری تھی، مجھے اس جگہ کا پتا ہے۔ میں اور میرا دوست پیرل، وہاں گئے بھی تھے۔“ سانول بولتے بولتے چُپ ہو گیا۔ میں نے اسے ٹوکا ”تم لوگ وہاں کیوں گئے تھے اور اب تمہارا دوست کہاں ہے۔؟“ سانول نے گہری سانس لی ”پیرل کو اس کے باپ نے اگلے ہفتے ہی شہر بھجوا دیا تھا، کیوں کہ اُسے ڈر تھا کہ یہاں اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“ اب میری بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ”خدا کے لیے یہ پہیلیاں بجھوانا بند کرو اور مجھے پوری بات بتاؤ۔“ سانول نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کبھی کبھی مجھے تم، وہ نہیں لگتے، جو تم ہو..... لیکن پتا نہیں، پھر بھی جانے کیوں تم پر اعتبار کرنے کو دل کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔“

سانول نے ایک بار پھر اچھی طرح اطمینان کیا کہ ٹیلے کے آس پاس صحرا میں کوئی دوسرا ہماری گفتگو سننے کے لیے موجود نہ ہو۔ پھر اس نے دھیمے انداز میں بھید کھولنا شروع کیا۔ میں دم بخود سا بیٹھا سنتا رہا۔ سانول کے مطابق، وہ اور پیرل اس رات گھر والوں سے چُھپ کر قریبی قصبے میں نوٹنکی دیکھنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر انہیں دیر ہو گئی اور آدھی رات کے وقت جب وہ بستی کی طرف لوٹ رہے تھے، تو بستی کی مشرقی سمت، جہاں صحرا میں کچے گھر دور دور فاصلے پر بنے ہوئے ہیں اور جن میں سے ہر گھر کے آگے کچا آنگن اور پھر آدھی کچی دیواری کی آڑھ بنائی گئی ہے، وہاں ایک گھر کے قریب انہیں چند سائے لپکتے نظر آئے۔ سانول اور اس کا دوست ڈر کر، وہیں دبک کر بیٹھ گئے اور پھر چند لمحوں بعد یہ ہلچل ختم ہوئی، تو وہ جلدی جلدی اپنے گھروں کو لوٹے۔ دو دن بعد یہی بوڑھا اور بڑھیا کال گڑھ پہنچے اور انہوں نے اپنی سکینہ کی تلاش کی دہائی میں ہر دروازے پر دستک دینی شروع کر دی۔ اسی تلاش میں وہ سانول کے دوست پیرل کے در تک بھی گئے۔ پیرل کا باپ ایک کھوجی ہے، لہٰذا انہوں نے اپنی نواسی کے کھوج کی التجا بھی کی۔ میں نے کھوجی لفظ پر سانول کو ٹوکا۔ ”یہ کھوجی کیا ہوتا ہے.....؟“ سانول نے حیرت سے میری جانب دیکھا ”کیا، تمہیں کھوجی کا نہیں پتا، یہ تو بڑے گُنی لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے باپ دادا سے یہ فن ان کے اندر نسل در نسل چلتا ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی وہ ہوتا ہے، جو زمین پر پڑے نشانات کے ذریعے گاؤں میں ہوئی، کسی بھی واردات کا سراغ لگانے میں مدد کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی حسیات تو اتنی تیز ہوتی ہیں کہ وہ ہفتوں پرانے نشان بھی اٹھا لیتے ہیں اور کچھ کی قوتِ شامہ اور چھٹی حس اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ صرف عورت یا مرد کے جسم یا کپڑوں کی بُو پر کھوج کر سراغ نکال سکتے ہیں۔ کھوجی اگر اعلیٰ نسل کا ہو، تو وہ زمین پر

پڑے نشان دیکھ کر یہ بھی بتا سکتا ہے کہ یہ پاؤں کا نشان کسی عورت کا ہے یا مرد کا، بچے کا ہے یا کسی بوڑھے کا۔ عورت کا ہے، تو کیا وہ جوان تھی یا بوڑھی، حتیٰ کہ عورت کے حاملہ یا غیر حاملہ ہونے کا سراغ بھی، وہ مٹی پر پڑے، انہی بے جان نشانوں سے ڈھونڈ نکالتے تھے۔ اس ساری جمع تفریق اور نشان پہچاننے کا ایک گہرا تعلق عورت یا مرد کے وزن سے بھی ہوتا تھا اور کھوجیوں کی تربیت میں کچھ ایسے خاص گُر شامل ہوتے تھے، جو انہیں مرد و عورت کی چال ڈھال اور رہن سہن تک کے بارے میں سراغ دے جاتے تھے۔ بہرحال، یہ ایک خداداد صلاحیت تھی، جو آج بھی چند مخصوص لوگوں کو حاصل ہے۔ میں سانول کی بتائی ہوئی کھوجیوں کی تفصیلات میں کچھ ایسا کھویا کہ چند لمحے کے لیے سکینہ کو بھی بُھلا بیٹھا۔ پھر سانول نے اپنی بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا کہ سکینہ کے نانا، نانی پیرل کے کھوجی باپ کے سامنے بھی اپنی فریاد لیے آن پہنچے۔ ان کی گریہ وزاری سے کھوجی کا دل پسیج گیا اور اس نے حامی بھر لی۔ اگلے دن طے یہ پایا کہ کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے سکینہ اور اس کے شوہر کے پیر کے نشان اٹھانے کا سلسلہ شروع کیا جائے گا، کیوں کہ پہلا سراغ وہیں سے مل سکتا تھا، لیکن کھوج اور نشان اٹھانے کے لیے ایک بہت اہم نکتہ زمین کی ساخت بھی تھا۔ کال گڑھ کا ریلوے اسٹیشن، چوں کہ صحرا کے بیچوں بیچ تھا اور شدید تیز ہوا اور رات بھر چلتی آندھی تو پل بھر پہلے کے بنے نشان بھی زمین پر جمنے نہیں دیتی تھی، اوپر سے وہ ہر لمحہ سرکتی ریت، نتیجتاً کھوجی کو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے مایوس لوٹنا پڑا۔ سانول نے مجھے بتایا کہ وہ، اس کا دوست پیرل اور سکینہ کے نانا، نانی بھی کھوجی کے ہم راہ ہی تھے، جب وہ ریلوے اسٹیشن سے تھکے ہارے بستی میں داخل ہو رہے تھے، سکینہ کی نانی بار بار سکینہ کی چادر کو چومتی، اپنی آنکھوں سے لگاتی اور روتی ہوئی ان کے پیچھے چلی آ رہی تھی کہ اچانک کھوجی کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ وہ پہلے بھی سکینہ کی چادر کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا، لیکن اس بار اس نے خصوصی طور پر بڑھیا سے چادر جھپٹ کر اُسے خوب اچھی طرح سونگھا اور ایک کچے مکان کے سامنے جا کر رُک گیا۔ سانول اور پیرل کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ یہ تو وہی مکان تھا، جہاں تین دن پہلے رات کو انہوں نے کچھ لپکتے سائے اور کچھ گھٹی گھٹی سی آوازیں سنی تھیں۔ مکان کا دروازہ بھڑا ہوا تھا، لیکن آدھی کچی چار دیواری کے پار آنگن کی ویرانی اور سناٹا دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ صحن سے پرے لکڑی کی بلّیوں والے چھت کے برآمدے میں کُھلنے والے اندر کے کمروں کے دروازے بھی اَدھ کُھلے پڑے تھے۔ شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے بعد کا جھٹپٹا چھا رہا تھا۔ آخر سانول ہی نے سب سے پہلے ہمت کی اور دروازہ کھول کر اندر صحن میں داخل ہو گیا، لیکن کھوجی کی تیز آواز نے اُسے اپنی جگہ جمے، کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ کھوجی چلایا ”اپنی جگہ پر کھڑے رہنا سانول، صحن کی طرف نہ جانا۔ ہو سکتا ہے، وہاں کوئی نشان باقی ہو“ سانول کے پیچھے کھوجی اور پیرل بھی دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھے جوڑے کو انہوں نے باہر ہی روک دیا۔ سانول اور پیرل دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپکے کھڑے رہے۔ کھوجی نے اپنے کُرتے کی جیب سے لکڑی کی دو عجیب سی لمبی اور پتلی ڈنڈیاں نکالیں اور ان سے صحن کی کچی زمین کو پھونکیں مار مار کر صاف کرنے لگا۔ صحن میں اترنے سے پہلے اس نے ایک کام اور بھی کیا کہ اپنے جوتے اتار دیے اور اپنے پیروں میں مخصوص ساخت کے بنا نشان والے اونی موزے پہن لیے۔ شاید اس کا مقصد صحن کی ریتیلی زمین پر اپنے پاؤں کے نشانات سے بچنا ہوگا۔ میں حیرت زدہ سا سانول سے فنگر پرنٹس اٹھانے کا یہ انوکھا واقعہ سُن رہا تھا۔ سانول نے بتایا کہ کھوجی نے بڑی احتیاط سے تمام صحن اور پھر دونوں کچے کمروں کی زمین پر پڑی ریت کو صاف کیا اور اس تمام عرصے میں سکینہ کی چادر کی خوش بو سے بھی مدد لیتا رہا، پھر ایک خاص جگہ پہنچ کر کھوجی نے اپنی کلائی پر بندھی ایک خاص سفید ڈوری کھولی اور اس کی مدد سے زمین پر پڑی مٹی کو مخصوص طریقے سے یوں گھر چا کہ ڈوری کے دونوں سرے، کھوجی نے اپنے ہاتھوں کے دو انگوٹھوں سے باندھ رکھے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو اس طرح کھول رکھا تھا کہ جب وہ اپنے ہاتھ زمین پر پھیرتا تو دھاگے کی ڈوری زمین پر رگڑ کھاتی، چند مخصوص نشان مٹی میں سے ابھار دیتی۔ کھوجی نے اپنا کام ختم کر کے ایک لمبی سی سانس لی اور صحن سے باہر نکل کر بوڑھے سے پوچھا ”کیا تمہاری نواسی بائیس سے چوبیس سال کی درمیانی عمر کی تھی اور کیا اس کے دائیں پاؤں میں کوئی چوٹ یا زخم تھا۔“ بوڑھے سے پہلے، بڑھیا چلا اٹھی ”ہاں ہاں! مہندی کی رات پلنگ سے اترتے وقت اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی، اس لیے وہ کچھ تکلیف میں تھی، لیکن تمہیں کیسا پتا؟“ کھوجی نے ایک نظر آس پاس ڈالی اور پھر آہستہ سے بولا ”اس صحن میں اور کمروں کے اندر پڑے چند نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ایک بائیس تیئس سالہ نوجوان لڑکی، جو اپنے داہنے پاؤں پر پورا بوجھ نہیں ڈال سکتی، موجود تھی، لیکن اس لڑکی کے علاوہ بھی یہاں کم از کم چار مردوں کے چلنے پھرنے کے نشانات موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے، ان میں سے ایک اس کا شوہر بھی ہو۔ بہرحال، ابھی تمہاری نواسی کی خوش بو اس گھر میں موجود ہے۔ اب رات سر پر ہے، لہٰذا ہم اب کل صبح گھر کے باہر سے نشان اٹھانا شروع کریں گے، تاکہ یہ پتا چل سکے کہ یہاں سے سکینہ کس طرف گئی ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی کے منہ سے اتنا ہی سُن کر وہ بوڑھا، بوڑھی اس قدر خوش ہوئے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ساری رات اسی ویران مکان کی چوکھٹ ہی پر گزار دیتے۔ بڑی مشکل سے سانول نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ابھی صبح ہونے میں صرف چند ہی گھنٹے بچے ہیں، لہٰذا کچھ دیر مزید انتظار میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ رات میں ویسے بھی کھوجی نشان نہیں اٹھا پائے گا۔

اُن کے جانے کے بعد راستے میں کھوجی نے دبے لفظوں میں اپنے بیٹے پیرل اور سانول کو اس بات کا اشارہ دیا کہ اُسے شک ہے کہ لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر اس گھر سے کہیں اور لے جایا گیا ہے، کیوں کہ کھوجی نے صحن میں واضح طور پر گھسیٹے جانے کے چند نشان دیکھے تھے۔ سانول نے کھوجی کو کریدا کہ اسے اس بات کا یقین کیسے ہوا کہ جس ذی روح کو گھسیٹا گیا تھا، وہ سکینہ ہی تھی۔ کھوجی نے بتایا کہ چوں کہ گھسیٹتے وقت بھی لڑکی اپنے داہنے پاؤں کا پورا وزن زمین پر نہیں ڈال پا رہی تھی اور پھر ایک مقام پر آ کر، جب وہ صحن میں گر پڑی تھی، تو اُس کے وزن اور مردوں کے پیروں کے نشانات اور کش مکش کے آثار اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ اس صحن میں کوئی ان ہونی ضرور ہوئی ہے۔ کھوجی کو وہاں زمین پر لڑکی کی ایک بالوں والی پن اور ایک ٹوٹا ہوا ناخن بھی ملا تھا، جو اس نے نانا، نانی کو دکھائے بغیر ہی، اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ بہرحال راز جیسا بھی تھا، اسے اگلی صبح کھل ہی جانا تھا۔

سانول اتنی کہانی سنا کر چپ ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی ”پھر اس کے بعد..... آگے کیا ہوا..... وہ بھی تو بتاؤ نا.....“ لیکن سانول خاموش ہی رہا۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ ”اس کے بعد کی کہانی بے حد مختصر ہے۔ میں اگلی صبح پیرل کے گھر پہنچا، تو وہ دونوں بوڑھا بوڑھی پہلے ہی سے کھوجی کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، لیکن دروازے پر پڑا موٹا سا تالا، ہم تینوں کا منہ چڑا رہا تھا۔ تین دن تک سکینہ کے بدنصیب نانا نانی، کھوجی کے بند در ہی پر پڑے رہے اور جب چوتھے دن وہ لوٹا، تو پیرل اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے گول مول سا جواب دے کر ہمارے منہ بند کروا دیے کہ بڑے شہر میں اس کی خالہ نے کسی بنگلے میں چوکیدار کی نوکری ڈھونڈ نکالی تھی، لہٰذا اسے جلدی میں پیرل کو لے کر جانا پڑا۔ سکینہ کی تلاش کے سلسلے میں بھی وہ بالکل ہی سرد رویے کا اظہار کرتا رہا کہ اب اتنے دن بعد کہاں کوئی نشان بچا ہوگا، البتہ بڑھیا کی حد سے زیادہ آہ و زاری سے تنگ آ کر وہ دو گھڑی کے لیے ہمارے ساتھ اس ویران مکان تک چلا گیا، لیکن کچھ دیر باہر میدان کی خاک چھاننے کے بعد حتمی اعلان کر دیا کہ روزانہ کی چلتی آندھی اور تیز ہوا سے آس پاس کا ہر نشان مٹ چکا ہے، لہٰذا اب یہاں سکینہ کی تلاش لاحاصل ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ اس کے چاہنے والے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کریں۔“ سانول نے بات ختم کر کے کچھ اس طرح میری جانب دیکھا، جیسے اسے خود بھی اس نامکمل داستان کے انجام سے شدید کوفت ہوئی ہو۔ ”لیکن کھوجی نے ایسا کیوں کیا، تم نے اس سے کچھ تو پوچھا ہوتا۔“ سانول نے مایوسی سے سر ہلایا ”کھوجی نے اس دن کے بعد سے اپنے لب، کچھ اس طرح سے سی لیے ہیں کہ اب وہ شاذ و نادر ہی کسی سے کوئی بات کرنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔ نہ جانے پیرل کو بھی اس نے کہاں بھیج دیا ہے۔ میں تو گزشتہ چھ مہینوں سے اپنے جگری یار کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس گیا ہوں۔“ ہم نے ساری رات باتوں میں گزار دی تھی۔ بستی کی جانب سے اذان کی آوازیں بلند ہونے لگیں، تو میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال کسی کوندے کی طرح لپکا۔ ”کیا ہم اس وقت اُس کھوجی کے گھر جا سکتے ہیں۔؟“ سانول میری بات سُن کر اچھل ہی تو پڑا۔ ”اس وقت..... کھوجی کے گھر، کیوں خیر تو ہے، وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ اپنا وقت ضائع مت کرو عبداللہ“، ”میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے، چلو دیر نہ کرو، مجھے روشنی ہونے سے پہلے واپس مزار بھی پہنچنا ہے، ورنہ سلطان بابا پریشان ہوں گے۔“ کچھ دیر بعد ہی ہم بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک پرانے سے بوسیدہ مکان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ سانول کی تیسری دستک پر اندر سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی چپل گھسیٹتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ہاتھ میں لالٹین تھامے سر باہر نکال کر کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا، ”اس وقت کون ہے بھئی.....“ دفعتاً اس کی نظر پہلے سانول اور پھر مجھ پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر بولا ”تم.....؟“ .....(باقی آئندہ)

☆.....☆ہاشم ندیم☆.....

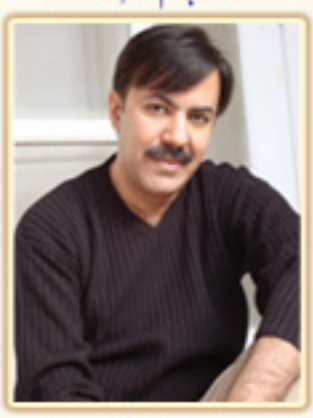

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

مجھے اس بوڑھے کھوجی کی ہڑبڑاہٹ پر مزید حیرت ہوئی۔ ''آپ مجھے جانتے ہیں.....'' ''ہاں..... اس دن تمہیں ہیڈ ماسٹر کے ساتھ بستی کے بازار میں دیکھا تھا، تم مزار کے نئے مجاور ہو نا..... لیکن اس طرح منہ اندھیرے میرے دروازے پر..... سب ٹھیک تو ہے نا.....؟'' اب سانول نے بات سنبھالی۔ ''ہاں چاچا! سب ٹھیک ہے، اس کا نام عبداللہ ہے۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے۔ یہ تم سے ملنا چاہتا تھا، سو میں اسے یہاں لے آیا۔'' کھوجی کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سانول کی یہ ''خدائی خدمت گاری'' ایک آنکھ نہیں بھائی، لیکن وہ چپ رہا اور بادلِ نخواستہ اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اور سانول صحن میں پڑی ایک جھلنگا سی چارپائی کی پائنتی ہی پر ٹِک گئے۔ باہر گلی میں اِکا دُکا نمازیوں کے کھنکھارنے اور چلنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر براہِ راست سوال داغ دیا۔ ''آپ سکینہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟'' میرا سوال سن کر کھوجی بوڑھے کے ہاتھ سے لالٹین گرتے گرتے بچی اور وہ سانول کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ ''اچھا..... تو یہ تمہاری شرارت ہے، بدمعاش لڑکے، اس لیے میں نے پیرل کو بھی تمہارے سائے سے دور بھجوا دیا تھا، لیکن تم اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ نکل جاؤ تم دونوں یہاں سے..... میں پہلے بھی ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے بارے میں مزید کچھ نہیں پتا۔'' میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ''سانول نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا، جس سے آپ کسی مصیبت میں پڑ جائیں۔ میں نے خود سکینہ کو صحرا میں دیکھا ہے۔'' یہ دوسرا دھماکہ تھا، جو عین کھوجی کے سر پر کسی بم کی طرح پھٹا۔ ''کیا تم نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ پھر تم اس کا پتا مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو، جا کر اسی سے پوچھ لو نا.....'' میں کھوجی کے سامنے جا کھڑا ہوا ''وہ مجھے صرف چند لمحوں کے لیے ایک جھلک کی طرح نظر آئی اور پھر غائب ہوگئی، لیکن آپ اس کے بارے میں ضرور کچھ ایسا جانتے ہیں، جس سے مجھے اس کی کھوج میں کچھ مدد مل سکے، لیکن شاید آپ بتانا نہیں چاہتے۔'' کھوجی غصے سے بپھر گیا ''کتنی دفعہ کہوں کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں پتا، اب تم دونوں یہاں سے چلتے بنو۔ اپنی جوانی پر نہیں، تو میرے بڑھاپے پر کچھ رحم کھاؤ۔'' کھوجی کے حتمی انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس مدعے پر مزید کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ صحن کا دروازہ کھولے کھڑا، ہماری روانگی کا انتظار کر رہا تھا۔ سانول نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازے کی جانب قدم بڑھائے تو کھوجی دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہوگیا۔ میں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ ''ٹھیک ہے..... آپ کہتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں، لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ آپ کے پاس یہ فن اور یہ خداداد صلاحیت قدرت کی ایک امانت ہے اور..... آپ نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اوپر والے نے آپ کا اندر اس لیے روشن کیا کہ آپ دوسروں کو اندھیرے میں راستہ دکھائیں اور ان کی مدد کریں، لیکن آپ نے آج اپنے فرض اور کام کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ بے ایمانی آپ کی آنے والی نسلوں کے اندر سے یہ وجدان و صلاحیت ہی ختم نہ کر دے۔'' میں بات ختم کر کے واپسی کے لیے پلٹا تو کھوجی ہیجانی انداز میں چلایا ''نہیں..... میں نے اپنے فن کے ساتھ کبھی بے ایمانی نہیں کی..... لیکن بعض دفعہ مصلحت بھی آڑے آجاتی ہے۔ میں ایک غریب انسان ہوں اور میری ساری پونجی میرا جوان بیٹا پیرل ہے۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں، پر اسے اگر کچھ ہوگیا، تو میں جیتے جی مر جاؤں گا.....'' سانول نے حیرت سے پہلے میری اور پھر کھوجی کی جانب دیکھا۔ میں نے یہ آخری کوشش اسی امید پر کی تھی کہ شاید کھوجی کے دل و دماغ پر جمی برف کچھ پگھلے۔ ہر فرض شناس کاریگر کی طرح وہ اپنے فن اور ہنر پر آیا الزام برداشت نہیں کر سکا اور تلملا کر بول اٹھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے کہیں زیادہ کم زور اور اس علاقے میں صرف ایک اجنبی ہوں، لیکن پھر بھی اس لڑکی کی کھوج میں آپ تک چلا آیا۔ کیا آپ کو ان بدنصیب لاچار، بوڑھوں پر ترس نہیں آتا، جو اپنی زندگی کے آخری دن یوں اس تپتے صحرا کی جلتی ریت چھانتے ہوئے گزار رہے ہیں۔ ان دنوں میں تو انہیں اپنے گھر کے آنگن میں آرام اور سکون کی زندگی گزارنی چاہیے تھی، جیسے میں اور آپ گزار رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ دونوں اسی صحرا میں سسک سسک کر اپنی جان دے دیں۔'' کھوجی نے بے بسی سے سر پٹخا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میرے باپ دادا نے بھی انگریزی پولیس میں کھوجی کی ڈیوٹی دی ہے۔ انگریز سرکار نے میرے باپ کو اس کی خدمت کے صلے میں بڑی عزت، بڑا مان دیا۔ خود میں نے بائیس سال کھوجی کی نوکری کی ہے، لیکن کبھی خود کو اتنا بے بس نہیں پایا۔ میں اپنے پیشے کی بہت عزت کرتا ہوں، لیکن.....'' کھوجی کچھ بولتے بولتے چپ ہوگیا، پھر لمبی سی سانس لے کر بولا، ''اچھا غور سے سنو..... میں اگلی صبح اس مکان کے باہر نشان اٹھانے پہنچ گیا تھا۔ نشان اٹھانے کا بہترین وقت صبح شبنم اور کہرے کے خشک ہونے سے پہلے ہی کا ہوتا ہے، تب تک وہ بوڑھی اور بوڑھا نہیں پہنچے تھے۔ لڑکی کو گھر سے نکالنے کے بعد قریباً 30 فٹ تک گھسیٹا گیا تھا اور پھر اسے کسی اونٹ پر لاد دیا گیا تھا۔ اب اس جگہ سے آگے لڑکی کے جسم کے نشان ختم ہوگئے تھے۔ اب تو تم ہی سمجھ ہی گئے ہوگے کہ لڑکی کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ میں یہ بات اگر لڑکی کے نانا نانی کو بتا بھی دیتا تو وہ بے چارے

اس پردیس میں کیا کر لیتے۔ اسی لیے میں چپ رہا اور بس.....'' میں نے غور سے کھوجی کی جانب دیکھا۔ ''لیکن اس اونٹ کے پیروں کے نشان بھی تو کسی جانب گئے ہوں..... آپ نے اس کا کھوج نہیں لگایا؟'' کھوجی نے خود کو جیسے ہمارے حوالے کر دیا، وہ بالکل ہی ہار کر بولا۔ ''وہ ایک نہیں تین اونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے اور تمام نشانات دوبارہ صحرا کی طرف ہی پلٹ گئے تھے۔'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ''تو پھر آپ نے یہ بات سکینہ کے گھر والوں کو کیوں نہیں بتائی۔'' کھوجی نے بے بسی سے سر پٹخا۔ ''کیسے بتاتا، اغوا کنندگان کو پچھلی شام ہی ہماری ساری سرگرمی کی اطلاع مل چکی تھی اور صبح جب میں اس مکان کے سامنے سکینہ کے نشان اٹھا رہا تھا، تب ہی منہ اندھیرے وہ تین نقاب پوش میری بے خبری میں، میرے سر پر آ پہنچے۔ ان کے ہاتھ میں لڑکی کے شوہر کے خون آلود کپڑے تھے، جو انہوں نے میرے سامنے پھینک کر دھمکی دی کہ اگر میں نے اس معاملے میں زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش کی تو اسی رات اپنے اکلوتے بیٹے کا سر بھی اپنی چوکھٹ پر لٹکا ہوا دیکھوں گا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کرتا؟ میں اسی لمحے گھر پلٹا اور سب سے پہلے پیرل کو شہر چھوڑ آیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے کہ میرے اندر کا کھوجی ایک مجبور باپ کے سامنے ہار گیا۔''

کھوجی اپنی بات ختم کر کے یوں لمبے لمبے سانس لینے لگا، جیسے برسوں کا بھرا غبار اندر سے نکل گیا ہو۔ میں سانول کو اس کے گھر چھوڑتے ہوئے مزار لوٹا تو سلطان بابا فجر کی نماز ختم کر کے سلام پھیر رہے تھے۔ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''کیوں میاں! کہاں تک پہنچی تمہاری کھوج..... کچھ کامیابی ہوئی یا پھر مزید الجھنیں سمیٹ لائے ہو۔'' ہمیشہ کی طرح سلطان بابا مجھ سے پہلے میری تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے رات بھر کی تمام روداد انہیں سنا دی۔ کھوجی کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے سکینہ کا معاملہ کسی قبائلی رشتے داری کی خلش کا شاخسانہ بھی ہو سکتا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں لڑکی کا رشتہ نہ ملنے پر یا ٹھکرائے جانے پر ایسی ان ہونیاں عام تھیں، لیکن اسی دن جب میں نے اکرام صاحب کے ذریعے، بہانے سے سکینہ کے نانا نانی کو کریدا تو یہ بھی محض میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ ان کے بقول سکینہ بہت پہلے ہی اپنے شوہر رحیم بخش سے منسوب تھی اور بنا کسی الجھن کے دونوں کا رشتہ ہنسی خوشی طے پایا تھا۔ دھاگے مزید الجھتے ہی جا رہے تھے اور ہر جانب سے میرا راستہ ایک بند گلی میں آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ سارا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ شام کو عصر کے بعد میں انہی سوچوں میں گم مزار کے صحن میں بیٹھا، سورج کے جلتے گولے کو دھیرے دھیرے ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ سانول ہڑبڑایا ہوا سا مزار کے احاطے میں داخل ہوا۔ میں بھی اسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ ''خیریت تو ہے۔ تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے.....؟'' سانول نے سر پٹخا۔ ''یہ لوگ مجھے سکون سے کہاں رہنے دیتے ہیں۔ نوری کے باپ نے آج میرے ابا کو اپنے گھر بلایا تھا۔ انہوں نے رشتے کے لیے شرط لگا دی کہ اگر لڑکا کال گڑھ میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا، تو اسے شہر جا کر محنت مزدوری کرنی ہوگی، تاکہ وہ سال بھر میں اپنی بیٹی رخصت کر دیں۔ اب تم ہی بتاؤ، میں یہ صحرا چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتا ہوں۔ میری بانسری کا تو ہر ساز اسی ریت سے زندہ ہے اور میری ہر دھن اسی ''ایک'' کے لیے ہے۔ میں تو مر جاؤں گا، اس سے دور جا کر..... مجھے تو یہاں کی ہوا میں بھی اس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے، کسی دوسری فضا میں تو میری سانس ہی گھٹ جائے گی.....'' میں چپ چاپ سانول کو اپنے زخم ادھڑتے دیکھ رہا۔ ال کیمسٹ میں پاؤلو نے غلط لکھا ہے کہ ''جب تم کسی کو چاہتے ہو تو کائنات کی ہر چیز تمہیں ملانے میں جٹ جاتی ہے۔'' اگر آج وہ میرے سامنے موجود ہوتا، تو میں اسے بتاتا کہ جب ہم کسی کو چاہنے لگتے ہیں، تو پوری کائنات ہمیں جدا کرنے کی سازش میں جٹ جاتی ہے، ہمارے خلاف منصوبے بنانے لگتی ہے، ہمیں برباد کر دیتی ہے۔ سانول اور نوری کے خلاف بھی ہر طرف سے سازشیں شروع ہو چکی تھیں۔ محبت بھلا ہمیں کب چین کے دو سانس لینے دیتی ہے، جلد ہی ہماری سانسیں گھونٹنے کے لیے آس پاس کی فضا میں جدائی کا زہریلا دھواں بھر دیتی ہے۔ ہماری آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ اس عشق کو شاید خشک آنکھیں پسند ہی نہیں، وہ انہیں ہر لمحہ بہتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ آج سانول کی آنکھیں بھی عشق کی اس سدا سے پیاسی زمین کو سیراب کر رہی تھیں۔ میں نے اس سے آگے کے منصوبے کے بارے میں پوچھا، تو وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ صحرا میں کسی کا ریوڑ چرا کر گزارا کر لوں گا۔ کاش کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی کے علاوہ بھی کوئی دوسرا روزگار ہوتا، تو آج میں اتنا بے بس نہ ہوتا۔'' مغرب سے کچھ پہلے سانول واپس لوٹ گیا۔

اندھیرا ہونے سے کچھ دیر قبل ''کالا'' بھی مزار کے باہر آ کر اپنی مخصوص غراہٹ سے مجھے بلانے لگا۔ اس کا زخم اب دھیرے دھیرے بھرنے لگا تھا۔ چال میں بھی کچھ توازن آ گیا تھا۔ وہ انتہائی حد تک سدھایا ہوا کتا تھا۔ اس نے پہلے ہی دن محسوس کر لیا تھا کہ میں اس سے اپنے کپڑے مس کرنے میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ تب ہی شروع دن ہی سے وہ اپنی شکر گزاری کا اظہار بھی کچھ فاصلے سے کرتا تھا۔ کالے کے جانے کے بعد، میں پھر اس ویران مزار کی منڈیر کے قریب آ بیٹھا۔ جانے وہ کس کا مزار تھا۔ اندر کمروں میں بنی ایک گم نام قبر کے اوپر کسی نے پھولوں کی جو آخری چادر چڑھائی تھی، اب اس کے پھول بھی خشک ہو کر ہوا کے ساتھ ادھر ادھر بکھرے جاتے تھے۔ سلطان بابا اندر سے نکلے اور مجھے یوں گم صم بیٹھا دیکھ کر میرے طرف آ گئے ''کیا سوچ رہے ہو میاں! کبھی اپنے اندر کی اس وحشت کو لگام بھی دے دیا کرو۔ جنوں حد سے بڑھ جائے تو دیوانگی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔'' میں نے ان کی جانب براہِ راست دیکھنے سے گریز کیا۔ ''آپ میرے لیے دعا کیوں نہیں کرتے۔ نصف جنوں سے مکمل دیوانگی کہیں بہتر ہے۔ میں خود اپنے اندر کی اس پل پل بڑھتی بے چینی سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔'' سلطان بابا مسکرا دیے ''اپنے اپنے مقدر کی بات ہے، کسی کو خرد راس آئے، تو کسی کو جنوں۔ اب دیکھو، عبداللہ کے مقدر میں دیوانگی ہے یا فرزانگی؟'' انہوں نے میری نظروں کے تعاقب میں مزار کے گنبد پر نگاہ ڈالی اور پھر کچھ دیر بعد بولے ''بہادر شاہ ظفر کو پڑھا ہے؟'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا ''کون؟ وہ آخری مغل شہنشاہ..... نہیں۔ بس، اس کی شاعری کے بارے میں یونیورسٹی میں تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔'' سلطان بابا نے مزار کے گنبد کی طرف اشارہ کیا ''شاید اس کا یہ قطعہ بھی ایسے ہی کسی مزار کے لیے ہوگا۔ سنو اور اسے اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھو۔ یہ ہم سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے
میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
پے فاتحہ کوئی آئے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں
میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

جانے اس قطعے میں کیا بات تھی، مجھے یوں لگا، جیسے میرا دل بہت دیر کے لیے ڈوب سا گیا ہے۔ مجھے یوں لگا، جیسے بہادر شاہ ظفر نے خاص طور پر میرے لیے یہ اشعار کہے ہوں۔ خود میری حالت بھی تو دن بدن کسی ایسے مزار جیسی ہی ہوتی جا رہی تھی۔ رات ڈھلتے ہی صحرا کی طرف سے سانول کی بانسری کی آواز فضا کے دوش پر بکھرنے لگی، لیکن آج اس کی تان میں کچھ عجیب ہی کسک اور کرب تھا۔ یہ محبت کس قدر قابض اور زور آور ہوتی ہے کہ ہمارے ساز

اور ہماری تانیں بھی اسی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ آج میں سانول کو اس کی اپنی آگ میں جلنے کے لیے تنہا چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ یہ گرم حبس زدہ رات مجھ پر کسی نئے روپ میں کھلنے والی ہے۔ شاید میرے اندر کہیں یہ خواہش شدید طور پر انگڑائیاں لے رہی تھی کہ میں کسی بھی طرح ایک بار پھر سکینہ کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ اس بار میں نے پہلے ہی سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا کہ میں اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ میں اندھیرے میں باہر صحرا پر یوں نظریں گاڑے بیٹھا تھا، جیسے ابھی یہ سیاہ پردہ پھاڑ کر کوئی معجزہ رونما ہونے والا ہو، جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ کئی بار میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہوئیں اور ایک آدھ بار مجھے جھونک بھی آئی، لیکن رات کا کالا پردہ میرے مقدر کی طرح بند ہی رہا۔ صبح سے کچھ پہلے میں تھک کر اندر کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور تب ہی ایک عجیب سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، شاید اونٹوں کا کوئی قافلہ صحرا سے گزر رہا تھا۔ ہاں..... یہ قافلے کی بجتی جرس کی آواز ہی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت سے اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ یہ آواز قریب آنے لگی۔ میں دم بخود سا کھڑا انتظار کرتا رہا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ صحرا میں قافلے صبح منہ اندھیرے سے بھی پہلے روانہ ہوتے تھے، کیوں کہ ”مسافر شب کو اٹھتے ہیں ..... جو جانا دور ہوتا ہے.....“ لیکن یہ کیا..... قافلے کی آواز اب بالکل قریب آ چکی تھی اور مجھے اب تک کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھاگ کر مزار سے باہر کھلے صحرا میں ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ دور دور تک وہی ازلی ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا، لیکن میں اپنی سماعتوں کا کیا کرتا.....؟ میرے کانوں میں اب تک قافلے کا شور گونج رہا تھا اور ان آوازوں کی ہر باریک تفصیل، مجھے کسی ریڈیو پر پیش کیے جانے والے کھیل کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ دور کوئی بچہ رو رہا تھا، اونٹوں کے کوہانوں پر رکھا سامان حرکت کی وجہ سے کھڑک رہا تھا۔ کوئی دور سے ہانکا لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اونٹ خرخرا رہے تھے، حتیٰ کہ ان کے ریت پر پڑنے والے پاؤں کی دھمک بھی مجھے علیحدہ سنائی دے رہی تھی۔ کچھ پازیبوں کی جھنکار، کچھ شریر بچوں کے ہنسنے اور دوڑنے کی آوازیں اور قافلے کے پہرے داروں کی وقفے وقفے سے سب کو ہوشیار کرنے کے لیے نقارے پر چوٹ کی آواز تیز ہو گئی، ریت کا ایک طوفان سا اٹھا اور میں اسی ٹیلے پر کھڑا ریت کا حصہ بنتا گیا۔ میری آنکھیں ریت کی چبھن سے جلنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ قافلہ اس وقت میرے آس پاس، بلکہ میرے اندر سے ہو کر گزر رہا ہے۔ سرگوشیاں تیز ہو گئیں، جیسے لوگ مجھ سے بچ کر دائیں بائیں سے گزر رہے ہوں، لیکن میری جلتی ہوئی آنکھوں کے پردے پر اب بھی صرف میلوں دور پھیلا ہوا ویران صحرا ہی اپنا عکس بکھیر رہا تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یا خدا..... یہ کیا ماجرا تھا؟ یا تو میری سماعتیں ناکارہ ہو کر خود آوازیں تخلیق کرنے لگی تھیں یا پھر میری بصارت نے ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کیا میری دیوانگی کا آخری دور شروع ہو چکا تھا۔ قافلہ جانے کب کا گزر چکا تھا۔ ریت کا طوفان تھم گیا تھا، لیکن میرے اندر اٹھا طوفان کسی ریت کے جلتے بگولے کی طرح تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں کون تھا، یہاں کیا کر رہا تھا.....؟ میرے ساتھ ہی یہ ساری ان ہونیاں کیوں ہوتی تھیں۔ کیا واقعی میرا خرد سے جنوں کا سفر مکمل ہونے کو تھا۔ آخر کیا حد تھی، میرے اس سفر کی۔ میری وحشت کا اختتام کہاں تھا۔ میں دوسرے عام لوگوں کی طرح اپنی محبت کو پانے کے بعد اس کے ساتھ اپنی باقی زندگی آرام اور سکون سے کسی گھر کے آنگن میں کیوں نہیں گزار سکتا تھا۔ زہرہ کی روح نے تو کب سے اپنی سپردگی کا اختیار مجھے دے دیا تھا، پھر بھی میں ان ویرانوں کی خاک کیوں چھان رہا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اس ٹیلے پر کھڑا ریت میں گھلتا رہا اور مجھے اس بات کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ جانے کب سے تہجد کے لیے جاگے سلطان بابا مزار کے صحن میں نکلے اور مجھے یوں گم صم کھڑا دیکھتے رہے۔ میں تب چونکا، جب انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میں نے وہ سارے سوال، جو کچھ دیر پہلے میرا اندر کاٹ رہے تھے، ان کے سامنے اگل دیے اور قافلے کا سارا احوال بھی بیان کر دیا۔ میرے سوال سن کر سلطان بابا بہت دیر تک خاموش رہے، لیکن انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب کچھ جواب ناگزیر ہو چکے ہیں۔ بہت دیر بعد وہ بولے تو ان کا لہجہ تھما ہوا سا تھا ”میں جانتا ہوں تم کس دور سے گزر رہے ہیں، ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ کچھ رستے اور منزلیں صرف کچھ خاص لوگوں کے لیے ہوتی ہیں، قدرت نے تمہارے لیے عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی راہ چنی ہے، تو ضرور تم میں کچھ خاص ہو گا، لیکن قصرِ سلطانی کے گنبد کو چھوڑ کر ہمالے کی چوٹی پر بسیرا کرنے کے لیے اپنی اڑان بھی اونچی رکھنی پڑتی ہے۔ جان جوکھم میں ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ یاد رہے، ابھی تمہیں ایسے مزید کئی عذاب جھیلنے ہوں گے۔“ میں درد سے چلا اٹھا ”لیکن میں ہی کیوں.....؟ وہ مسکرائے ”میں نے کہا نا..... کچھ چناؤ قدرت صرف اپنے ہاتھوں میں رکھتی ہے۔ اس نے تمہیں کیوں چنا، اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے، لیکن فیصلہ تو اب بھی تمہارے اپنے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو ابھی اسی لمحے یہ سب کچھ ترک کر کے واپس پلٹ سکتے ہو۔ تم پر کوئی جبر نہیں۔ تم سے پہلے بھی جانے کتنے پلٹے ہوں گے۔ تم تو پھر بھی اس سفر میں بہت دور تک چلے آئے ہو، کئی ایسے بھی ہیں، جو قدرت کی طرف سے واضح اشارہ ملنے اور چنے جانے کے باوجود پہلا قدم تک نہیں اٹھا سکے اور روزمرہ کی بھیڑ میں گم ہو کر رہ گئے۔ یہ تمہاری ہی ہمت تھی کہ تم اس راہ کا ہر کانٹا چنتے ہوئے آج اس مقام تک آ پہنچے ہو۔ اتنا زادِ راہ بھی ایک زندگی کے لیے کافی ہے۔ جانا چاہو تو سلطان تمہیں خوشی سے رخصت کرے گا۔“ میں نے بے بسی سے سر پٹخا ”آپ جانتے ہیں، واپسی میرے بس میں نہیں ہے۔ نہ ہی میری ایسی کوئی خواہش ہے، لیکن میں خود کو اس بوجھ سے ٹوٹتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اتنا ظرف نہیں ہے مجھ میں، جس کی توقع قدرت کیے بیٹھی ہے۔“ انہوں نے میرا کاندھا دبایا ”اپنے ظرف کے پیمانے کا حساب خود نہیں کیا جاتا۔ اسے آزمانے والے پر چھوڑ دو۔“ میں نے تھک کر ہتھیار ڈال دیے ”لیکن یہ بھرے پُرے قافلے کی صدائیں، یہ کیا ماجرا تھا.....؟“ سلطان بابا نے گہرا سا سانس لیا ”صحرا کا اپنا فسوں اور اپنا ہی جادو ہوتا ہے، البتہ ہو سکتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے واقعی کوئی قافلہ گزرا ہو، جب سے انسانی بستیاں بے تحاشا بڑھنے لگی ہیں، تو ایسے صحرا اور ویرانے ہی جنات اور دوسری مخلوقات کی آماج گاہ بنتی گئیں۔ ہماری بصارت کا پردہ کسی مادے سے روشنی کی لہر ٹکرانے کا محتاج ہے، لیکن اگر دوسری مخلوق کثیف نہ ہو، بلکہ لطیف ہو، یعنی ایسے مادے سے بنی ہو کہ جس کے اندر سے روشنی بنا ٹکرائے گزر جائے، تو ہماری آنکھ کے پردے پر اس شے کی تصویر نہیں بن پائے گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تمہارا واسطہ بھی کسی ایسی ہی مخلوق کے قافلے سے پڑا تھا۔ عام حالات میں ہم انسانوں کی سماعت بھی ان کی آواز کی لہروں کو پکڑ نہیں سکتی، لیکن تم نے اگر ان کی دنیا کی آوازیں سنی ہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ خاص اس لمحے قدرت نے تمہاری سماعت کا پردہ اتنا حساس کر دیا تھا کہ تم نے ان غیر مرئی صداؤں کو بھی سن لیا۔ دھیان رہے کہ یہ سارا معاملہ فریکوئنسی کا ہے۔ ہماری بصارت اور سماعت کی فریکوئنسی ان کی دنیا کی فریکوئنسی سے جدا ہے، لہٰذا ہم انہیں عام حالات میں دیکھ یا سن نہیں سکتے۔ ہاں البتہ، کچھ خاص لوگ اس ارتعاش تک بھی پہنچ جاتے ہیں، جہاں ان کے لیے وہ خاص فریکوئنسی پکڑنا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ دو جہانوں کا مالک تمہیں اپنے خاص بندوں میں ہمیشہ کے لیے شامل کر دے۔“ میں حیرت سے سلطان بابا کی بات سنتا رہا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی سے لپکی ”اگر تصویر کا تعلق ہماری بصارت کے پردے پر روشنی کی لہر کے کسی کثیف مادے سے ٹکرانے ہی سے ہے، تو پھر اس کا مطلب ہے کہ سکینہ کا وجود بھی اسی صحرا میں کہیں موجود ہے، کیوں کہ میں نے اس کی واضح تصویر دیکھی ہے، دھندلی، لیکن واضح انسانی خدوخال کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ سکینہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے.....؟“ ”ہاں..... ہو بھی سکتا ہے کہ یہ وہی سکینہ ہو، لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو کہ ٹھیک اسی وقت تمہارے ساتھ سانول بھی تھا، جسے وہ دکھائی نہیں دی۔ خود میں بھی ریلوے اسٹیشن پر اس کی جھلک سے چوک گیا تھا۔ اگر اس سارے معاملے سے پھولوں والی وہ خاص چادر نکال دی جاتی، تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی عام صحرائی لڑکی کا ہیولا ہو، جو صحرا میں بھٹک رہی ہے، لیکن اطمینان رکھو، جلد یا بدیر، تم اس ہیولے کی حقیقت تک بھی پہنچ جاؤ گے۔ یاد رہے، ایک بار تم نے خود ہی ایک مفروضے کا ذکر کیا تھا۔ اگر خلا میں ماضی کی آوازوں کی لہر زندہ رہ سکتی ہے، تو پھر ماضی کی تصویر کی جھلک کیوں نہیں؟ ہو سکتا ہے جو تمہیں نظر آ رہا ہو، وہ بھی اس حال کی نہیں، بلکہ ماضی کی کسی تصویر کی جھلک ہو۔ قدرت ہی نے تمہاری سماعت کی طرح تمہاری بصارت کے پردے کو بھی چند لمحوں کے لیے یہ طاقت عطا کی ہو کہ تم نے اس صحرا کے ماضی کی کوئی جھلک اس لڑکی کی تصویر کی صورت دیکھ لی ہو۔ یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں کہ اس قدرت کے کارخانے میں، جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے.....“ سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے اندر پلٹ گئے اور میں اپنی جگہ گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ میرا سارا وجود ایک ارتعاش سے کانپ رہا تھا اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ سوال تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور جواب تھے کہ مستقل دامن بچائے جاتے تھے۔

اچانک صحرا کی جانب سے ایک تیز نسوانی چیخ نے میرے سارے خیالات کے تار بکھیر دیے۔ میں گھبرا کر پلٹا، چیخ دوسری مرتبہ بلند ہوئی۔ سامنے مزار کے صحن میں نماز پڑھتے سلطان بابا بھی سلام پھیر کر چونکے تو مجھے جھٹکا سا لگا۔ مطلب یہ صرف میرا ہی واہمہ نہیں تھا، آواز سلطان بابا نے بھی سنی تھی۔ تیسری چیخ نے مجھے جگہ کا تعین کرنے کے بارے میں ہر شک سے آزاد کر دیا۔ آواز اسی جانب سے بلند ہو رہی تھی، جہاں سانول رات بھر بیٹھ کر بانسری بجایا کرتا تھا۔ میں بے تحاشا اس جانب دوڑ پڑا۔ صحرا کی ریت میں میرے پاؤں دھنسے جا رہے تھے، دور سے میں نے اس اونچے ٹیلے پر فجر کے جھٹپٹے میں کسی عورت کا ہیولا دیکھا، جو مسلسل نیچے کی طرف دیکھ کر چیخ رہی تھی اور اپنی صحرائی زبان میں کسی سے مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ ٹیلے کو دیکھتے ہی میری سانس رکنے لگی۔ یہ وہی ٹیلہ تھا، جہاں سانول گزشتہ رات بانسری بجا رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

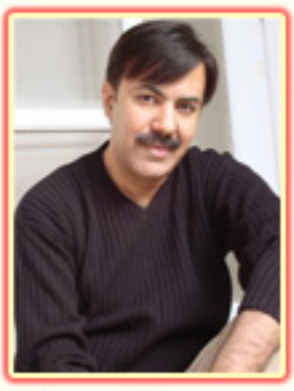

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

کچھ لمحے کے لیے تو جیسے میرے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ جب تک میں دوڑ کر ٹیلے تک پہنچا، اس پکی عمر کی چرواہن کے ہاتھوں کے اشارے مجھے سمجھ میں آ چکے تھے۔ ٹیلے کی پرلی جانب سانول بے سدھ پڑا تھا اور اس کے سر سے بہتا ہوا خون نہ جانے کب سے جم کر ریت کو سیراب کر رہا تھا۔ سلطان بابا بھی شاید میرے پیچھے ہی صحرائی جانب لپکے تھے، جس وقت میں سانول کی سانسیں ٹٹول رہا تھا، تب تک وہ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زندگی اگر صرف سانس لینے کا نام ہے، تو سانول ابھی زندہ تھا، لیکن اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ جب میں اور سلطان بابا اسے لے کر بستی پہنچے تو سب سے پہلے بستی کے مضافات میں بکریوں کا دودھ دوہتے، اس صحرائی گوالے کی نظر ہم پر ہی پڑی، جسے میں پہلے بھی ریچھ کے مقابلے کے دوران جبروت کے قلعے میں دیکھ چکا تھا اور پھر چند لمحوں ہی میں پورا کال گڑھ سانول کے کچے آنگن میں جمع ہو چکا تھا۔ بستی کے واحد طبیب نے فوراً ہی سانول کا زخم دھو کر مرہم پٹی تو کر دی اور کچھ دوائیں بھی اس کے حلق سے نیچے انڈیل دیں، لیکن فی الحال سانول بے ہوش ہی تھا۔ بڑی مشکل سے سانول کے باپ، مجید مستری اور طبیب کی درخواست پر لوگوں کا جمگھٹا چھٹا۔ سانول کو ہم نے آنگن سے اندر کمرے میں پہنچایا ہی تھا کہ اکرام اللہ صاحب اور ان کے پیچھے نوری کا باپ ہڑبڑائے ہوئے سے سانول کے گھر داخل ہوئے۔ وہی چند روایتی سوال ''کیا ہوا..... کیسے ہوا.....؟ کس نے کیا.....؟'' اور وہی ایک جواب کہ ''اللہ جانے.....؟''

کچھ ہی دیر میں نوری بھی چند دوسری عورتوں اور اپنی ماں سمیت صحن میں داخل ہوئی اور تیزی سے عورتوں والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ پریشانی میں وہ سانول کے باپ کو سلام کرنا بھی بھول گئی تھی اور پھر برآمدے کے قریب ماں کے کہنی مارنے پر چونکی تو جلدی سے صحن میں بیٹھے مجید کو سلام کر کے اندر پلٹ گئی۔ سچ ہے کہ محبت آداب بھلا دیتی ہے۔ طبیب اپنا کام کر کے جا چکا تھا اور اس کے بقول اب سانول کو دوا کے ساتھ دعا کی بھی اتنی ہی ضرورت تھی۔ سانول کی دعا تو نوری تھی اور نوری خود سراپا دعا بنی، اسی کے گھر کے آنگن میں ماتھا ٹیکے سجدے میں پڑی تھی۔ پھر بھی قدرت کو رحم آتے آتے تین راتیں بیت گئیں۔ سانول کی طویل بے ہوشی تیسری فجر سے کچھ پہلے ٹوٹی، اسی اثناء میں، میں اور سلطان بابا باری باری مزار سے ہو کر آتے رہے۔ اس وقت اتفاق سے میں ہی سانول کے سرہانے موجود تھا، جب اس نے دھیرے دھیرے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ نوری کی دعا آخر کار فلک میں چھید کرتی ہوئی مقامِ قبولیت سے جا ٹکرائی تھی۔ سانول کو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اس رات بھی حسبِ معمول اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا بانسری کی تانوں سے کھیل رہا تھا کہ اچانک ہی اندھیرے سے چار نقاب پوش سائے اس کی جانب لپکے اور پھر کھینچا تانی کے دوران کوئی کند فولادی چیز اس کے سر سے ٹکرائی، جس کے بعد سانول اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ ان نقاب پوشوں کی تکرار سے صرف اتنا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سانول کو کال گڑھ میں مزید ایک لمحہ بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ بہرحال، اس وقت تو سانول کا ہوش میں آ جانا ہی اس کے پیاروں کے لیے غنیمت تھا۔ سانول کی دگرگوں حالت اس بات کا اشارہ تھی کہ اسے فی الحال بستر سے اٹھنے میں چند دن مزید لگیں گے، لیکن میں جانتا تھا کہ سانول زیادہ دن تک خود کو پابند نہیں رکھ پائے گا۔ شام کو جب میں مزار واپسی کے لیے اٹھنے لگا، تو اس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے کچھ دیر مزید رکنے کا اشارہ کیا۔ عیادت کے لیے آئے ہوئے چند دیہاتی جب کمرے سے باہر نکل گئے، تو اس نے دھیرے سے پوچھا ''وہ آئی تھی.....؟'' مجھے اس کی حالت سے زیادہ اس کے سوال پر ہنسی آ گئی ''کہیں اسے بلانے کے لیے خود ہی تو اپنا سر نہیں پھوڑ ڈالا؟'' میری بات سن کر وہ بھی ہنس پڑا ''اسے بلوانے کے لیے تو یہ سر کاندھوں سے اتار کر نیچے بھی رکھ سکتا ہوں۔'' پھر اس نے صحرائی زبان میں ایک مصرع پڑھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سانول کی طرف دیکھا، تو اس نے لمبی سی آہ بھرتے ہوئے مجھے ترجمہ سنایا کہ ''عاشق چاہے جیسا بھی درد اٹھا لے..... کتنی ہی گہری چوٹ کیوں نہ کھا لے، دنیا والے اس کے زخموں کو ایک ڈھونگ ہی سمجھتے ہیں، لیکن پھر بھی عاشق جسم پر زخموں کے داغ سجاتا ہی رہتا ہے، تاکہ جب کبھی محبوب سے ملاقات ہو، تو وہ اس سے داد پا سکے۔'' میں حیرت سے سانول کی زبانی اس صحرائی قطعے کا ترجمہ سنتا رہا۔ کچھ چیزیں اس پوری کائنات میں کس قدر یکساں ہوتی ہیں۔ ہوا، پانی، دھوپ، بارش اور یہ محبت کا جذبہ..... صرف لفظ اور لہجہ ہی بدلتا ہے۔ باقی ہر کسک ایک سی ہی رہتی ہے۔ کائنات کے ہر ذرے کی طرح محبت بھی شاید وحدت ہی کی قائل ہوتی ہے۔ درد، تڑپ، چبھن اور کسک کی وحدت۔ روح کو آری سے دو حصوں میں چیر دینے کی یکسانیت، قطرہ قطرہ کر کے جان نکالنے کی مماثلت۔ جانے ہم نے دنیا کی ہر اذیت اور درد دینے والی چیزوں کے اتنے مختلف نام کیوں رکھ ڈالے ہیں۔ ہم ایسی سب ہی اذیتوں کا ایک ہی نام ''محبت'' کیوں نہیں رکھ دیتے؟ سانول بھی اس وقت اپنے سر کے زخم اور گھائل وجود کے درد سے زیادہ، عشق کے زہریلے ڈنک کے اثر سے تڑپ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے زندگی کی طرف لوٹنے میں نوری کی منت ہی کا سب سے زیادہ دخل ہے۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ اپنی ماں سمیت کسی نہ کسی بہانے سے سانول کے کمرے کے آس پاس ہی بھٹک رہی ہے۔ اگرچہ مَردوں کی موجودگی کے سبب وہ سانول کے پاس تو نہیں آ سکی، لیکن میں نے ہر لمحہ اس کی بے چین آنکھوں اور بے تاب روح کو سانول کے سرہانے

ہی موجود پایا۔ شاید اب بھی یہیں قریب کسی دیوار سے پرے، اپنے من کے ہاتھ اپنے مالک کے سامنے پھیلائے بیٹھی ہو۔ سانول دم بخود سا میری بات سنتا رہا۔ اس کا محبوب اس قدر قریب موجود تھا، یہ سن کر اس کی حالت مزید ہیجانی سی ہوگئی۔ دیواروں سے پار جھانکنے کی اتنی شدید خواہش اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کی آنکھوں سے جھلکتی نہیں دیکھی تھی، لیکن دیوار کا تو دوسرا نام ہی رکاوٹ، پابندی ہے اور ہم انسان خود ہی تو ایسی کئی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ اپنے لیے، اپنے جذبوں کے لیے.....

سانول کے گھر سے مزار کی جانب لوٹتے ہوئے جانے کیوں مجھے سکینہ کو اٹھالے جانے والے چار نقاب پوش یاد آتے رہے۔ ان میں اور سانول پر حملہ کرنے والے نقاب پوشوں میں کوئی ایسی مماثلت تھی، جو میرے ذہن کی کنڈی ہلاتی رہی۔ کہیں وہ سانول کو بھی سکینہ کے معاملے میں میری رہنمائی کرنے کی سزا دینے تو نہیں آئے تھے۔ یہ کیسا معما تھا، جو سلجھنے ہی میں نہ آتا تھا۔ مزار کے صحن میں سلطان بابا تسبیح پڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد فراغت پائی تو کہنے لگے ''تمہارا دوست آیا تھا..... میں نے اسے روٹی ڈال دی تھی، لیکن شاید اسے تمہاری عادت پڑ گئی ہے۔ ناراض ہو کر پلٹ گیا۔'' وہ شاید کالے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سانول پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں اپنے خدشے سے آگاہ کیا تو بولے ''ہاں..... ایسا ممکن ہے..... سانول کو بھی اب احتیاط کرنی چاہیے۔ تقدیر شاید پھر بھی ایک موقع اور دے دیتی ہے، لیکن سچا دشمن کبھی نہیں۔'' میں نے اس عجیب اصطلاح پر انہیں حیرت سے دیکھا ''کیا دشمنی بھی خالص اور ناخالص کے پیمانے پر تولی جاتی ہے۔ کیا دشمن بھی کبھی سچا یا جھوٹا ہوتا ہے.....؟'' انہوں نے دوسری تسبیح ختم کر کے مجھ پر پھونک ماری ''سچائی اور خالص پن کی جتنی ضرورت دشمنی کے جذبے میں ہوتی ہے، اتنی تو شاید دوستی میں بھی نہ ہوتی ہو۔ دشمن خالص اور معیاری نہ ہو تو اعلیٰ ظرف حریف کے لیے مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ قدیم منگول نسل کے کچھ لوگ شاید آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں، جو دشمنی اور انتقام کو ایک اعلیٰ جذبہ سمجھتے ہیں اور دشمن ان کے لیے جینے اور آگے بڑھنے کی تحریک کا باعث ہوتا ہے، اسی لیے ان کا ایک قول ان میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔'' سلطان بابا کسی آہٹ کی آواز سن کر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو کر باہر صحرا کی جانب متوجہ ہو گئے۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی ''کون سا قول.....؟'' سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا اور قول دہرایا ''دشمن زندہ رہے.....'' وہ اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں یونہی ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔ برآمدے کے قریب رک کر وہ میری جانب پلٹے ''لیکن یاد رہے..... یہاں اس بستی میں ہمارا واسطہ شاید کسی اعلیٰ ظرف دشمن سے نہ پڑے، لہٰذا اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔'' سلطان بابا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور میں ہمیشہ کی طرح ان کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ میں آج تک محبت ہی کو طاقت ور ترین انسانی جذبوں میں شمار کرتا تھا، لیکن آج میرے اندر کئی دروازے مزید کھل گئے تھے۔ واقعی، کتنی بڑی بات کہہ گئے تھے، سلطان بابا، دشمن زندہ رہے۔ جانے یہ قول دعا تھا یا بددعا۔ حسرت تھی یا نفرت کی انتہا۔ میں ساری رات کالے کا انتظار کرتا رہا، لیکن وہ واپس نہیں پلٹا۔ صبح کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی تو بھی نیند میں بے چینی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کسی ان ہونی کا خوف مجھ پر طاری ہونے لگا تھا۔ صبح نہ جانے سلطان بابا کو کیا سوجھی کہ خود ہی بول پڑے۔ ''چلو میاں! تمہارے دوست کی عیادت کر آئیں۔ اسی بہانے وہاں اکرام صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' زیادہ تر سلطان بابا کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہمہ وقت مزار پر موجود رہے اور ویسے بھی وہ زیادہ تر بستی کی جانب جانے سے گریز ہی کیا کرتے تھے، لیکن آج نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ انہوں نے خود ہی سانول کے گھر چلنے کی فرمائش کر دی۔

ہم سانول کے گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو کافی بھیڑ تھی۔ پتا چلا کہ سانول کے باپ نے اس کے ہوش میں آنے کی خوشی میں شکرانے کے طور پر نیاز بانٹنے کا ارادہ کیا ہے اور اسی لیے بستی کے سب ہی مرد وہاں چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ''بڑے اور چھوٹے پیر صاحب'' کو بہ یک وقت اپنے درمیان پایا تو سب ہی خوش ہو گئے۔ کال گڑھ کی واحد جامع مسجد کے مولوی صاحب بھی کچھ دیر میں آ پہنچے۔ نیاز کے چاول ابھی دم پر تھے اور بٹنے میں کچھ دیر باقی تھی کہ بستی کے چند بزرگوں میں کال گڑھ کے سدا کے کال اور سوکھے کی بات چل پڑی۔ کسی جانب سے ایک بوڑھے نے تشویش زدہ انداز میں سب کی توجہ اس جانب دلائی کہ بستی کے آس پاس قریبی جوہڑ اور تالاب تو تین سال پہلے ہی خشک ہو چکے تھے، لیکن اب دور دراز کے پانی کے ذخیرے بھی دھیرے دھیرے خالی ہوتے جا رہے ہیں اور اگر چند ایک دن میں علاقے میں بارش نہ ہوئی، تو کال گڑھ میں پینے کے پانی کا شدید بحران پیدا ہو جائے گا۔ بوڑھے کی بات سن کر محفل میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور پھر سب ہی اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قلعہ داروں کی منت کر کے ان سے مزید کچھ قرض لیا جائے اور ایک آخری کوشش کے طور پر مشرقی سمت، جہاں پانی ملنے کی کچھ امید ہے، وہاں پھر سے کنواں کھود کر پانی تلاش کیا جائے، لیکن اکثریت نے اس مشورے کو یکسر رد کر دیا کہ ایسی بارہا کوششیں پہلے ہی ناکام ہو چکی ہیں اور قرض کا بوجھ پہلے ہی اتنا بڑھ چکا ہے کہ مزید ایسی کوئی سعی لاحاصل، صرف وقت کے زیاں ہی کا باعث ہوگی۔ اچانک کوئی کسی کونے سے بولا ''تو پھر بڑے پیر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بارش کی دعا کریں..... اب اور کوئی چارہ نہیں ہے۔'' اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ سب ہی جانب سے سلطان بابا کے سامنے فریاد پیش کی جانے لگی۔ ایک شور سا مچ گیا۔ مولوی صاحب نے بھی بارش کے لیے دعا کی درخواست دائر کر دی۔ سلطان بابا نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کروایا اور دھیمے لہجے میں بولے ''اگر آپ سب کا یہی مشورہ ہے، تو پھر دعا بھی ہم سب اجتماعی طور پر ہی کریں گے۔ آج عصر کی نماز کے بعد بڑے میدان میں پوری بستی کے مرد نمازِ استسقاء کے لیے جمع ہو جائیں۔ ہم سب پیش امام صاحب کی معیت میں باجماعت نماز ادا کر کے اللہ کے حضور اپنی درخواست پیش کریں گے۔'' سلطان بابا کی بات سن کر نوجوان طبقے نے تو زور و شور سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن بزرگ کچھ خاموش ہی رہے۔ میں نے پاس بیٹھے اکرام صاحب سے آہستہ سے اس خاموشی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواباً میرے کان میں جو سرگوشی کی، اس سے میں صرف اتنا ہی مطلب اخذ کر سکا کہ جبروت کے علم میں لائے بنا بستی کے باہر ایسا کوئی بھی عوامی جمگھٹا، اس کی ناراضی کا سبب بن سکتا ہے، لہٰذا بزرگ یہی چاہتے ہوں گے کہ قلعے داروں کو بھی باقاعدہ دعا میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ تب تک سلطان بابا مجھے وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کر چکے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ بستی کے تمام مرد عصر کے وقت باہر والے بڑے میدان میں جمع ہو جائیں گے۔ ہم محفل کو مکھیوں کی طرح بھنبھناتے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے چھوڑ کر وہاں سے نکل آئے، جانے ان میں سے کوئی بعد میں جبروت سے باقاعدہ اجازت لینے یا دعا میں شرکت کرنے کی درخواست لے کر قلعے کی جانب گیا یا نہیں۔ ہم بہرحال، عصر سے کچھ پہلے بستی کے مضافاتی میدان میں پہنچے تو دعا کے لیے اچھے خاص لوگ موجود تھے۔ مجھے اسی دن راستے میں سلطان بابا نے بارش کے لیے خصوصی طور پر مانگی جانے والی دعا اور نمازِ استسقاء کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ شاید یہی وہ واحد اور منفرد التجا ہے، جو سیدھی ہتھیلیوں کے بجائے ہاتھ کی پشت آسمان کی جانب بلند کر کے دعا کی صورت میں کی جاتی ہے۔ میرے لیے یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ بستی کے لوگوں، بشمول امامِ مسجد نے سلطان بابا سے کئی بار درخواست کی کہ وہ جماعت کی امامت کریں، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ بستی کی جامع مسجد کے امام کا حق ہے۔ بالآخر امام صاحب ہی امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلام کے بعد سب نے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کر کے دعا مانگی اور مولوی صاحب نے اپنی چادر پلٹ دی۔ دعا کے بعد نمازی رخصت ہونے لگے، تب اچانک میری نظر بے ساختہ دھوپ کا قہر برساتے آسمان کی جانب اٹھ گئی۔ سورج اب بھی اپنی اسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دور دور تک کسی بدلی تو کیا، کسی مٹی یا ریت کے بگولے کے آثار بھی نمایاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی، لیکن وہاں

حسب معمول صرف سکون کا ڈیرہ تھا۔ وہ تو دعا مانگنے کے بعد اس طرح بے فکر اور لاپروا ہو گئے تھے، جیسے خدا ان کی ہر دعا سن ہی تو لے گا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا، کہیں یہ اٹل یقین ہی تو کسی دعا کی قبولیت کا اصل کلیہ نہیں۔ کہیں ہماری دعائیں اسی لیے تو رد نہیں ہو جاتیں کہ ہم اندر سے بے یقین اور بددل ہوتے ہیں۔ ہم جس سے مانگ رہے ہوتے ہیں، خود اسی کی سخاوت اور خزانے پر ہمارا اعتماد متزلزل ہوتا ہے، تو پھر دعا قبول نہ ہونے کا شکوہ کیسا۔ یہ تو اعتبار اور توکل کا سودا ہے، اور سچ ہی تو ہے کہ انسان ہی سدا کا خسارے میں ہے۔

رات کو بھی کئی بار میں نے اٹھ کر آسمان کو دیکھا، میرے اندر کا تول مول کرنے والا سوداگر، آج بھی یقین اور بے یقینی کے پلڑے دلیل اور جواز کے پتھروں سے برابر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب جب مجھے پہلی جھپکی آئی، تب تک آسمان بالکل صاف تھا۔ ایمان اور بے یقینی کی جنگ میں سوداگر کے شک کی جیت ہوئی اور میں تھک کر سو گیا، لیکن صبح بہت سے بچوں کے شور سے میری آنکھ اچانک کھلی، تو پہلی نظر سیدھی آسمان پر پڑی۔ پورا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بستی کے تمام بچے کاغذ اور پلاسٹک کی پتنگیں، لمبی لمبی ڈوروں سے باندھے صحرا میں چلتی تیز ہوا کے دوش پر اڑائے پھر رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، صحرا میں بادل..... کتنا عجیب، تضاد آمیز، لیکن خوش گوار تجربہ تھا۔ سلطان بابا بھی صحن میں نکل آئے۔ میں نے ان سے پوچھ ہی لیا ''آپ کو اس قدر یقین کیسے تھا۔ مجھے تو جو نعمت میری دسترس میں، میرے سامنے موجود ہوتی ہے، اس کے پانے کا بھی کامل یقین نہیں ہوتا، اور آپ ایک ان ہونی پر بھی اس قدر اعتبار کیسے جمع کیے رکھتے ہیں۔'' انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا ''سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں..... اور یقین جانو کہ تم اس کامل یقین کے بہت آس پاس ہو۔ بس، ثابت قدمی ہی آخری شرط ہے۔'' سلطان بابا کی بات ختم ہوتے ہی پہلی بوند نے میری پیشانی چوم کر سلامی دی اور پھر تو چند ہی لمحوں میں وہ جل تھل ہوئی کہ کال گڑھ کی برسوں سے پیاسی اور سوکھی زمین کے ساتھ ساتھ میرا اندر بھی پوری طرح دھل گیا۔ کچھ بارشیں ہمارے اندر بھی تو برستی ہیں۔ کال گڑھ کے لوگوں کو خوشی سے چلاتے اور اچھلتے کودتے دیکھ کر میرے من میں بھی بوندوں کا جلترنگ بجنے لگا۔ کال گڑھ کی بارش صرف بیس منٹ کے لیے تھی، لیکن میرے اندر کا ساون بہت دیر تک برستا رہا۔ کچھ ہی دیر میں بستی کے تمام لوگ مزار کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ وہ سلطان بابا کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آئے تھے کہ ان کی دعا سے کال گڑھ کے نصیب کی بدلی آج کھل کر برسی تھی، لیکن سلطان بابا نے مسکراتے ہوئے بات انہیں پر الٹ دی ''میں نے تو اللہ سے صرف اتنی دعا کی تھی کہ کال گڑھ میں جو بھی تجھے سب سے زیادہ عزیز ہے، اس کے صدقے بارش بھیج دے۔ اب تو یہ تم ہی سب مل کر کھوجو کہ تم میں سے اللہ کا وہ سب سے پیارا کون ہے؟'' یہاں بستی میں سب ہی کے من کی کلی کھل رہی تھی، مگر کوئی ایسا بھی تھا، جو قدرت کو اپنی سلطنت میں دخل اندازی کرتے دیکھ کر تلملا رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے اسی روز احساس ہو گیا تھا کہ جبروت کبھی سلطان بابا کے لیے لوگوں کی آنکھوں کی یہ محبت و عقیدت برداشت نہیں کر پائے گا اور اسی خدشے کا اظہار اسی شام سانول نے بھی کر دیا۔ جب میں اس سے ملنے اس کے گھر پہنچا، تو مغرب کا وقت ڈھل چکا تھا، گھر میں چہل پہل بھی کم تھی۔ سانول نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے سرہانے بٹھا لیا۔ اس کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی اور زخم بھی بھر رہا تھا، لیکن اس کے باپ نے اسے اپنی قسم دے رکھی تھی کہ اب وہ تنہا صحرا میں بانسری بجانے کبھی نہیں جائے گا۔ سانول اس بات پر بھی کافی جھنجلایا ہوا تھا، لیکن فی الحال اس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جس دن سے اس پر حملہ ہوا ہے، بستی کا بوڑھا کھوجی بھی اپنے گھر سے غائب ہے۔ اس کے گھر کو بھی تالا لگا ہوا ہے اور بستی میں کوئی نہیں جانتا کہ کھوجی کہاں چلا گیا ہے۔ میں بھی چونکا، تب ہی وہ بوڑھا اتنے دنوں سے مجھے بھی دکھائی نہیں دیا تھا، نہ ہی وہ سانول کی مزاج پرسی کے لیے اس کے گھر آیا تھا۔ مطلب، میرا شک ٹھیک تھا کہ ان نقاب پوشوں کا تعلق ضرور سکینہ کے اغوا سے بھی رہا ہوگا۔ سانول نے میرے خدشات دو چند کر دیے تھے، لیکن میں اسے اپنی پریشانی بتا کر مزید الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں گھنٹہ بھر اس کے پاس بیٹھنے کے بعد اٹھنے لگا، تو سانول نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جاؤں۔ آج نوری کے گھر سے اس کے لیے خاص طور پر گڑ کے چاول بن کر آئے تھے۔ میں نے مسکرا کر اسے چھیڑا کہ تب ہی آج وہ باتیں بھی گڑ کے شیرے جیسی میٹھی کر رہا ہے۔ ہائے یہ جذبے..... پل میں ہمیں کتنا کڑوا اور دوسرے پل ہی کتنا شیریں کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسی الٹ پلٹ مچاتے ہیں ہمارے اندر کہ ہم خود اپنا اصل بھی بھول جاتے ہیں۔ میں بھی سانول کی آنکھوں سے پھوٹتی محبت کی وہ میٹھی آنچ پورے کمرے میں پھیلتی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ سانول کو میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ سلطان بابا مزار پر میرا انتظار کرتے ہوں گے، لہٰذا میں کل پھر آؤں گا اور نوری کے گھر سے آئے گڑ کے چاول بھی ضرور کھاؤں گا۔ میں سانول کے کمرے سے باہر نکلا، تو چند عورتیں لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے، گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ سانول کی ماں بھی تھی۔ میں سر جھکا سلام کر کے آگے بڑھنے لگا، تو سانول کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ''شالا چھوٹا پیر جیوے.....'' کائنات کی ساری مائیں شاید ایک ہی مٹی سے گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آنسوؤں، دعاؤں اور خدمت کی مٹی سے..... مجھے مما یاد آ گئیں اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ میرے عقب سے ایک سہمی اور ڈری ہوئی سی نازک سی آواز ابھری۔ ''چھوٹے پیر جی.....!!'' میں ٹھٹھک کر پلٹا اور حیرت سے برآمدے کے ستون کی آڑ میں نوری کو اپنا سراپا سمیٹتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بھی علاقے کی ریت کے مطابق لمبا سا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا اور میں اس کے وجود کی لرزش اتنی دور سے بھی محسوس کر سکتا تھا۔ باقی عورتیں اندر کی جانب بڑھ چکی تھیں۔ اور اس وقت صرف ہم دونوں ہی صحن میں موجود تھے۔ اس نے مجھے روک تو لیا تھا، پر خود اس کا بس چلتا تو اگلے لمحے ہی وہاں سے ہوا ہو جاتی۔ میں نے ہلکے سے کھنکار کر اسے متوجہ کیا، وہ ہڑبڑا سی گئی ''وہ جی..... چھوٹے پیر جی..... آپ اس سے کہیں نا کہ وہ شہر چلا جائے۔ یہاں اس کی جان کو بہت خطرہ ہے۔ آپ کہو گے تو نہ نہیں کرے گا۔ بہت سنتا ہے آپ کی۔'' مجھے نوری کی تشویش کا اندازہ تھا ''آپ اطمینان رکھیں، میں سانول سے بات کروں گا۔'' میں بات ختم کر کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ عورت کا دامن کچھ یوں بھی سدا ہی سے کورا ہوتا ہے، لیکن ان علاقوں میں تو زور سے چلتی ہوا بھی اسے داغ دار کر دیتی ہے۔ وہ معصوم لڑکی سانول کی محبت میں شاید چند لمحوں کے لیے یہ بھول گئی تھی، لیکن مجھے ریت اور رواج کی حدیں یاد تھیں۔ ساری بستی ہی کو چند دن میں اندازہ ہو گیا تھا کہ سانول کی مجھ سے گاڑھی چھنتی ہے اور وہ ضدی لڑکا، میری بات کا بہت مان رکھتا ہے۔ یہ اسی مان کا بھروسا تھا، جس نے نوری کو آج مجھ سے بات کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ سانول سے کہوں کہ کچھ عرصے کے لیے یہاں سے دور چلا جائے۔ دشمن اگر ان جانا ہو تو وہ دہرا خطرناک ہو جاتا ہے اور ہمیں اس وقت ایسے ہی کسی چھپے ہوئے دشمن کا سامنا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم صحرا کے اونچے نیچے ٹیلے پار کرتا ہوا مزار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے داہنی طرف کے ٹیلے کے پیچھے سے چند غراہٹیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ غراہٹ بھی رک گئی۔ میں نے کالے کو آواز لگائی، لیکن کالا ہوتا، تو ایسے چھپتا ہی کیوں۔ میں نے پھر قدم بڑھائے ہی تھے کہ ٹیلے کے پیچھے سے دو خوف ناک قسم کے کتے ایک دم ہی میرے سامنے آ گئے۔ یہ جبروت کے کتوں کے ٹولے میں سے تو نہیں تھے، لیکن ان کے تیور بھی اس وقت کچھ ویسے ہی تھے۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ بچپن سے میرے اندر چھپا کتوں کا خوف ایک دم ہی میرے پورے وجود پر طاری ہو گیا ہے اور میں ٹھیک اسی طرح اپنی جگہ منجمد ہو گیا، جیسے بچپن میں کسی کتے کے غرانے پر اپنے پیروں سے جان نکل جانے پر ہو جاتا تھا۔ کتوں نے زقند بھرنے کے لیے اپنے جسم کو تولا، میری رگوں میں بہتے گرم خون نے پل بھر ہی میں میرے سر سے لے کر میرے پاؤں کے تلوؤں تک کا دورانیہ طے کر لیا اور تب اچانک ہی کسی طرف سے کالا دوڑتا ہوا آیا اور میرے پیروں کے قریب آ کر لوٹنے لگا۔ میں ابھی تک ساکت ہی کھڑا تھا۔ کالے کو یوں میرے پاس قلابازیاں کھاتے دیکھ کر دوسرے دو کتوں کے تنے جبڑے بھی کچھ ڈھیلے ہو گئے۔ شاید کالے نے صحرا میں بھی اپنا گروہ بنا لیا تھا اور باقی دو بھی اسی کے ساتھی تھے۔ میں نے ایک گہری سی سانس لی اور آگے بڑھ گیا، جانے یہ جانور آپس میں کون سی بولی بولتے ہوں گے، کیسے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہوں گے۔ ان کے لفظ کیسے ہوتے ہوں گے۔ ابھی ابھی کالے نے میری جان کے دشمن بنے ان دو خوف ناک کتوں کو یہ کیسے سمجھایا ہوگا کہ یہ تو میرا دوست ہے..... تم بھی اسے کچھ نہ کہنا اور کتنی جلدی وہ کالے کی بات مان بھی گئے، ہم انسانوں کی طرح کسی کج بحثی یا تکرار میں پڑے بنا، انہوں نے کیسے اپنے دوست کی بات مان لی، شاید اس دور کے انسانوں کو بہت سی باتیں ان جانوروں سے سیکھنے کی ضرورت تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا، کہیں یہ لفظ صرف ہم انسانوں ہی کی مجبوری تو نہیں ہوتے۔ رابطے کے کئی اور ذرائع بھی تو ہوتے ہوں گے، جیسے ان جانوروں کا آپس میں رابطہ، اور پھر وہ رابطہ، وہ جذبہ اور وہ پیام ہی کیا، جسے لفظوں کی یا زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہو؟ بات تو تب ہے، جب بنا کچھ کہے ہی وہ ہمدم، سب جان لے۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کالے کا اپنے ساتھیوں کو بھیجا گیا، وہ خاموش پیام تھا۔ شاید یہ لفظ ہم کم ظرفوں ہی کی پہچان ہوتے ہیں۔ انہی خیالوں میں گم میں مزار کے سامنے والا بڑا ٹیلہ طے کر کے جیسے ہی نیچے اترا تو میرے پاؤں جیسے ریت میں گڑ کر رہ گئے۔ مزار کے باہر جبروت کی جیپ کھڑی تھی۔ اتنی رات گئے جبروت یہاں کیا لینے آیا تھا۔..... (باقی آئندہ)

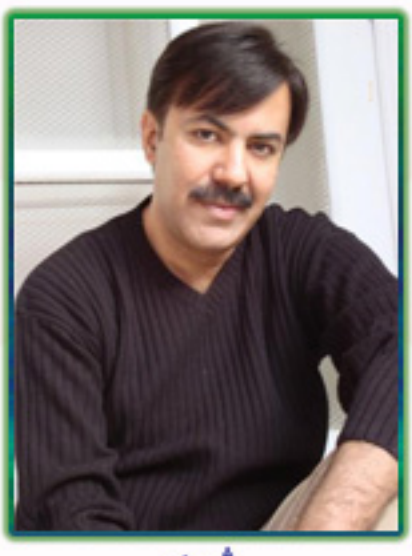

.....ہاشم ندیم.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

مجھے جبروت کی جیپ مزار کے باہر کھڑی دیکھ کر جو پہلا جھٹکا لگا تھا، میں اسی کے زیرِ اثر تقریباً دوڑتے ہوئے مزار کے بیرونی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے جبروت کا خاص کارندہ، اکرم لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکلا اور مجھ پر ایک نگاہِ غلط ڈالتا ہوا، جیپ میں سوار ہو گیا، جہاں ڈرائیور سمیت ایک دوسرا محافظ پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔ سلطان بابا صحن ہی میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تسبیح گھما رہے تھے۔ میں پھولی ہوئی سانسیں لیے ان کی جانب بڑھا ''یہ لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''، ''دھمکانے آئے تھے..... لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں.....'' میں مزید الجھ گیا ''پوری بات بتائیں.....؟'' سلطان بابا اٹھ کھڑے ہوئے ''جبروت کا پیغام لائے تھے کہ یہاں اس کا سکہ چلتا ہے، لہٰذا آئندہ کوئی بھی اجتماع کرنے سے پہلے اس سے اجازت ضرور لے لی جائے۔'' میں نے تشویش بھری نظروں سے سلطان بابا کی جانب دیکھا، گویا میرے خدشات ایک ایک کر کے سچ ثابت ہو رہے تھے ''تو آپ نے کیا جواب دیا.....؟''، ''وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ ہم فقیر لوگ ہیں۔ ہمارا تو گزارا ہی مانگ کر ہوتا ہے۔'' گویا انہیں سانول کا مجھ سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں تھا۔ سلطان بابا کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ طبلِ جنگ بج چکا ہے اور اب جلد یا بدیر ہماری جبروت سے حتمی ملاقات ہونے والی ہے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سلطان بابا کمرے میں آرام کے لیے چلے گئے، لیکن میری قسمت میں آرام کہاں..... پھر وہی رات، وہی بے خوابی، وہی میری جگ راتوں کی محفل اور وہی میرے ساتھی تارے..... کہتے ہیں، پرانے زمانوں میں کاہن اور جادوگران تاروں کی چال سے حال اور مستقبل کی کروٹ کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ میں بھی بہت دیر تک ان شرارتی تاروں میں اپنے مقدر کا تارا کھوجتا رہا، لیکن وہ مجھے کیسے دکھائی دیتا، جو گردش میں سدا رہتے ہوں، انہیں تو فلک بھی اپنے دامن میں جگہ نہیں دیتا۔ ایسے ستاروں کا آسمان بھی شاید کوئی دوسرا ہی ہوتا ہوگا۔

اگلے روز میں مزار سے باہر سانول کی زور زور سے باتوں کی آواز سے چونکا، جلدی سے اٹھ کر مزار کی منڈیر سے باہر جھانکا، تو سانول اپنے باپ کے ساتھ لڑتا جھگڑتا اور بحث کرتا مزار کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کے باپ نے صحن میں داخل ہوتے ہی سلطان بابا کو سلام کے بعد اپنا دکھڑا سنانا شروع کر دیا کہ ''وہ اپنے لڑکے کے ہاتھوں بے حد پریشان ہے۔ ابھی کل ہی اس کی حالت کچھ سنبھلی ہے اور آج ہی سے اس نے دوبارہ گھر سے نکلنے کی ضد شروع کر دی ہے۔ اب بڑے پیر جی ہی اسے کچھ سمجھائیں کہ اپنے بوڑھے باپ کو اس عمر میں یوں آزار نہ کرے اور اس کی بات مان کر شہر چلا جائے۔'' سانول نے اپنے باپ کو سلطان بابا کے سامنے فریاد سناتے چھوڑ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مزار کی منڈیر کی طرف چلا آیا۔ میں نے سب سے پہلے اسے جبروت کے رات والے پیغام کی روداد سنائی، جسے سن کر وہ مزید پریشان ہو گیا۔ ''اوہ..... یہ تو بہت فکر کی بات ہے، پھر بڑے پیر صاحب نے انہیں کیا جواب دیا''، ''وہی جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ سلطان بابا جس مقصد سے کالی گڑھ آئے ہیں۔ اسے پورا کیے بنا، وہ یہاں سے کوچ نہیں کریں گے۔'' سانول نے وہی سوال کیا ''لیکن ایسا کیا مقصد ہے ان کا۔ اس ویران بستی میں ان درندوں سے دشمنی مول لے کر کیا ملے گا انہیں؟'' میں نے لمبی سی سانس لی۔ ''یہ تو وہی جانیں۔ ویسے بھی میں ان سے زیادہ سوال نہیں کرتا۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف ان ہی کو دے رکھا ہے میں نے، لیکن تم اپنے گھر والوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ وہ سب تمہاری بھلائی کے لیے ہی تو کہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ اسی میں تمہارے اپنوں کی خوشی ہے۔'' سانول نے تنک کر سر پٹخا ''تم جانتے ہو، میں ایک پل کے لیے بھی اس سے دور نہیں جا سکتا۔ اس کے بنا تو میری بانسری سے بھی سُر نہیں نکلتا''، ''اور اگر تمہاری دھن اور تمہارے من کی تان بھی تم سے یہی التجا کرے تب.....؟'' سانول نے چونک کر میری جانب دیکھا ''کیا مطلب.....؟'' میں نے گزشتہ شام نوری سے ہوئی ساری بات بتا دی۔ سانول مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ دل گیر بھی ہو گیا۔ ''وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ میں بستی چھوڑ کر چلا جاؤں۔ وہ جس کے لیے میں سارے زمانے سے لڑتا پھرتا ہوں۔ وہ بھی زمانے کے ساتھ مل گئی ہے.....'' میں نے سانول کو ڈانٹا ''بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے، تب ہی تمہاری فکر میں گھلتی رہتی ہے۔ اب اور ضد نہ کرو۔ اور پھر تم خود بھی تو یہاں قلعہ داروں کی غلامی سے چڑتے ہو، تو پھر اپنی نوری کو پانے کے لیے یہ عارضی جدائی تو برداشت کرنی ہی پڑے گی۔ سوچو وہ بھی تمہاری جدائی میں اتنی ہی پریشان ہوگی جتنا تم، لیکن وہ بے چاری تو لڑکی ہونے کی وجہ سے کسی سے اپنا درد بھی نہیں کہہ سکتی۔ تم ہی کچھ احساس کرو۔'' سانول نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔ آخر کار گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیے اور میں اس کا ہاتھ پکڑے، اس کے باپ کے پاس چلا آیا۔ ''آپ کو مبارک ہو۔ سانول نے شہر جانے کی ہامی بھر لی ہے۔'' سانول کے باپ کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ پہاڑ اتنی آسانی سے سَر ہو گیا ہے۔ اس نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ سلطان بابا مسکرائے ''حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے عبداللہ میاں ایسے کرشمے دکھاتے رہتے ہیں۔''، ''بھئی میں تو کہتا ہوں کہ اس کا نام عبداللہ کی جگہ ساحر ہونا چاہیے تھا۔ لگتا ہے، تمہارے بیٹے پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔'' سلطان بابا کی اس شرارت پر مجھ سمیت سانول اور اس کا باپ بھی مسکرا دیے۔ مزار سے نکلتے ہوئے

سانول نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ''لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ میں نوری سے ملاقات کیے بنا، یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اور یہ ملاقات کل شام ہی ہوگی۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ کل کسی طرح مجھے گھر سے تنہا نکلنے کی اجازت دلوا دو۔ باقی انتظام میں خود کرلوں گا۔'' میں نے مسکرا کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ''تو تم نے بھی سودے بازی سیکھ لی ہے۔ ٹھیک ہے، کل عصر کے بعد تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔''

سانول کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی مزار کی بیرونی دیوار سے پرے کالے کی مخصوص غراہٹ گونجی۔ میں روٹی اور پانی لے کر باہر آیا تو دور کالے کی پشت پر، میں نے اس کے دونوں دوستوں کو بھی ٹیلے کے اوپر کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے لیے روٹی ڈالی اور انہیں بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی آ کر اپنے دوست کے ساتھ شریک ہو جائیں، لیکن شاید فی الحال وہ دونوں کچھ شرمیلے تھے۔ میں اندر سے اور روٹی لے آیا اور پانی میں بھگو کر خود دور مزار کی دیوار کے پاس چلا گیا۔ مجھے مزار کی طرف بڑھتے دیکھ کر کالے کے دوست بھی ٹیلے سے اتر آئے۔ اگلے روز عصر کے بعد میں سانول کے گھر پہنچا، تو وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ سانول کو میرے ساتھ گھر سے باہر نکلتے دیکھ کر اس کے ماں باپ کے دل میں جو تھوڑا بہت تذبذب تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے بستی سے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا ''اب کیا ارادہ ہے۔ کیا سیدھے نوری کے دروازے پر جا بیٹھو گے؟'' سانول زور سے ہنس پڑا ''نہیں! جو سودا میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا، وہی نوری کے سامنے بھی اس کی سہیلی کے ذریعے پیغام کی صورت بھیج دیا تھا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ میں شہر جا کر محنت مزدوری کروں، تو آج شام اسے مجھ سے ملنے کے لیے مزار کے پچھلے بڑے ٹیلے پر آنا ہی ہوگا۔'' میں نے حیرت سے سانول کو دیکھا۔ ''تو کیا وہ مان گئی۔ اس نے تمہیں کوئی جواب بھی دیا کہ نہیں.....؟'' سانول مسکرایا ''نہیں..... جواب تو کوئی نہیں آیا اس کی طرف سے، لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ضرور آئے گی۔'' میں نے غور سے سانول کی جانب دیکھا۔ ''تمہیں اتنا یقین کیسے ہے'' سانول اپنی ہی دھن میں مگن تھا ''ساری بات ہی یقین کی ہے چھوٹے پیر جی.....'' میں زور سے چونکا..... میرے ذہن میں سلطان بابا کا جملہ گونجا ''سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں.....'' کیا ہمارے یقین میں واقعی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ہمارے مجبور اور معاشرے کے قیدی محبوب کو بھی گھر سے نکال کر اس ویران تپتے صحرا میں ہمارے سامنے کھڑا کر سکتا ہے.....؟ اگر زمین والوں پر اس یقین کا اتنا گہرا اثر ہے، تو پھر عرش بریں والے کی آمد کا کیا حال ہوگا، جو ہمارے ایک قدم کے بدلے ستر قدم ہماری جانب بڑھاتا چلا آتا ہے.....؟ اور پھر میں نے دور ہی سے مزار سے پرے ٹیلے پر نوری کی سرخ اوڑھنی کو سانول کے کامل یقین کی صورت میں لہراتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ شاید اپنی کسی سہیلی کے ساتھ آئی تھی، جو بہ ظاہر ٹیلے پر اگی ایک خاص جنگلی بوٹی چننے میں مشغول تھی، جسے جوڑوں کے درد کی دوا میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ محبت بھی ہمیں کتنے بہانے سکھا دیتی ہے۔ شاید محبت خود دنیا کی سب سے بڑی ''بہانے باز'' ہوتی ہے۔ میں مزار کی منڈیر کے قریب ہی رک گیا۔ سانول کو نوری کی جانب آتے دیکھ کر اس کی سہیلی نے نوری کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور ہنستی ہوئی کچھ فاصلے پر چلی گئی۔ ٹیلے اور مزار کی منڈیر میں کافی فاصلہ تھا۔ اچانک تیز ہوا نے ریت کے چند شریر بگولوں کو چھیڑ دیا اور وہ نیند سے جاگ کر صحرا میں ایک دوسرے کے پیچھے لپک کر ''کولا چھپا کی'' کھیلنے لگے۔ سانول ریت میں پیر دھنساتا نوری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نوری سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھ سے ریت کے ایک شریر بگولے نے کہا ''جانتے ہو، وہ آپس میں کیا بات کر رہے ہیں؟'' ''ہاں..... میں جانتا ہوں۔ سب ہی بچھڑنے والوں کی بولی ایک جیسی ہوتی ہے۔ کچھ گلے، کچھ شکوے..... کچھ دعوے اور کچھ وعدے، کبھی نہ پورے ہونے والے وعدے.....'' سانول بھی نوری سے کچھ ایسے ہی وعدے کر رہا تھا۔ جانے مجھے اتنی دور سے بھی ایسا کیوں محسوس ہوا کہ جیسے نوری رو رہی ہو۔ سانول اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ یہ لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ پہلے تو خود ہی اپنے سے دور بھیجنے کے جتن کرتی ہیں اور پھر خود ہی جدائی کا سوچ کر رو پڑتی ہیں۔ اچانک ہی زہرا کی یاد نے میرے وجود کے ہر رویں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ وہ پورا صحرا جیسے زہرہ کی یاد کا اک دریا بن گیا۔ کیا اسے بھی میری یاد آتی ہوگی۔ کیا وہ بھی نوری کی طرح آنسو بہاتی ہوگی۔ زمانہ چاہے صدیوں ہی پر محیط کیوں نہ ہو۔ محبوب سے ہوئی ملاقات ہمیں ہمیشہ پل بھر ہی کی لگتی ہے۔ سو، نوری اور سانول کی ملاقات کے وہ چند پل بھی پلک جھپکتے ہی بیت گئے۔ نوری اپنی سہیلی کے ساتھ ٹیلے سے اتر کر بستی کی جانب چل پڑی اور جاتے جاتے پلٹ کر ٹیلے پر کھڑے گم صم سے سانول کو دیکھتی رہی، جس کی آنکھ سے ٹپکتے اس آنسو کی چمک، میں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں یہاں اتنی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ خود نوری بھی بار بار پلو سے اپنی بھیگی پلکیں پونچھ رہی تھی۔ ایک اور الوداع..... ایک اور عذاب..... جو سانول اور نوری کی جدائی کی صورت میں میری روح کو جھیلنا پڑ رہا تھا۔

نوری کے جانے کے بعد بھی سانول وہیں ٹیلے پر کھڑا اس جانب دیکھتا رہا، جہاں ریت پر نوری کے قدموں کے نشان گئے تھے۔ میں نے اس کی تنہائی میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت صرف اس کا جسم ہی اس ٹیلے پر موجود ہے۔ اس کی روح تو نوری کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں کو چننے، ان سے وضو کرنے کے لیے نوری کے ساتھ ہی صحرا پار کر گئی تھی۔ سورج ڈھلنے کے بعد سانول بھی اپنی محبت کے غروب ہوتے آفتاب کی طرح ٹیلے سے نیچے اتر آیا۔ وہ بہت مضمحل لگ رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ دائمی وصل کے لیے کبھی کبھی یہ عارضی جدائی ضروری ہوتی ہے۔ سانول کو اگلی صبح روانہ ہونا تھا۔ وہ رات دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں اسے گھر تک چھوڑ آیا، لیکن اگلی صبح میرے بے حد اصرار کے باوجود اس نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک ساتھ چل کر اسے وداع کرنے سے منع کر دیا۔ بقول اس کے، وہ پہلے ہی بہت اداس تھا اور اگر میں اسٹیشن تک ساتھ آیا، تو کہیں وہ اپنا ارادہ ہی نہ بدل دے۔ وہ صبح سویرے ہی مزار پہنچ گیا تھا۔ اس کی گاڑی دوپہر کی تھی۔ میں خود اسے رخصت کرتے ہوئے بہت اداس تھا۔ اس کے ساتھ کال گڑھ میں اتنے دن کیسے کٹ گئے، کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ جاتے ہوئے مجھ سے گلے مل کر وہ رو پڑا۔ میں نے جلدی سے اس کے آنسو پونچھے ''ارے..... یہ کیا.....؟'' ''تم مجھے بہت یاد آؤ گے عبداللہ، میں روز تمہیں ایک خط لکھا کروں گا اور تم جواب میں مجھے اس بستی، اس صحرا اور نوری کی خبر لکھنا۔'' میں نے ماحول بدلنے کے لیے اسے چھیڑا۔ ''اچھا تو گویا خط میں بھی اسی کی باتیں..... میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تم میرے لیے خط لکھا کرو گے، پر اپنے ایسے نصیب کہاں؟'' سانول میری بات سن کر مسکرا دیا۔ ''اگر میرا خط اس تک پہنچ پاتا، تو یقین کرو میں اسے ہر خط میں عبداللہ کی باتیں لکھا کرتا۔ میں نے نوری کو پیغام کروا دیا ہے کہ تم سے اسے میری خیر خیریت پتا چلتی رہے گی اور اگر اسے کوئی ضروری پیغام دینا ہو، تو وہ بھی تمہارے ذریعے مجھے دے سکتی ہے۔ میں ڈاک بابو سے بھی خاص التجا کر کے آیا ہوں کہ مزار والی ڈاک کا خاص خیال رکھے۔'' میں نے سانول کو اطمینان دلایا کہ وہ فکر نہ کرے۔ میں اس کے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔ جانے سے پہلے وہ خصوصی طور پر سلطان بابا کے کمرے میں جا کر ان کی دعا بھی وصول کر آیا تھا۔ سانول کے جانے کے بعد ایک دم ہی جیسے ساری فضا اداس اور میری تنہائی اور وحشت دوچندی ہو گئی تھی، دل پھر سے ہُوکنے لگا تھا۔ گاہے دل سے دھواں اٹھتا ہے..... ابھی رہتا ہے اس مکاں میں کوئی.....

اگلے روز سکینہ کے بوڑھے نانا نانی سلطان بابا سے ملنے چلے آئے۔ جانے کیوں انہیں دیکھ کر اب میرا کہیں چھپ جانے کو دل کرتا تھا۔ مجھ سے اب ان کی فریاد برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بڑھیا کا آج یہ اصرار تھا کہ اگر سلطان بابا سکینہ کی اوڑھنی پر تین بار دم کر کے اور دعا کر کے پھونکیں گے، تو وہ ضرور واپس لوٹ آئے گی۔ سلطان بابا نے شاید اسی کے اطمینان کی خاطر، اس سے کہا کہ وہ سکینہ کی وہ پھولوں والی چادر یہیں چھوڑ جائے، وہ ضرور سکینہ کی بازیابی کی دعا کریں گے۔ وہ دونوں یوں خوش ہو گئے، جیسے واقعی انہیں سکینہ مل گئی ہو۔ مزار سے نکلتے ہوئے بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی، تو اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی کہ خدا میری ہر مراد پوری کرے اور ٹھیک اسی لمحے، میرے من کی صرف ایک ہی مراد تھی ''یا خدا اس لاچار بڑھیا کو اس کی نواسی سے ملا دے.....''

کچھ دیر میں سورج ڈوب گیا۔ آج میں کالے اور اس کے دوستوں کے لیے پہلے ہی پانی اور روٹی باہر رکھ آیا تھا، تاکہ اس کے دوست میری وجہ سے کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان کی غراہٹوں کی آوازیں بھی باہر سے بلند ہونے لگیں، لیکن خلافِ معمول ''کالا'' مزار کے سامنے آ کر بھونکنے لگا۔ اس نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، جانے کیا بات تھی۔ جب تواتر سے آتی آواز نہ رکی تو مجبوراً مجھے اٹھ کر مزار سے باہر جانا پڑا۔ وہ مزار کے مرکزی دروازے سے کچھ ہٹ کر کھڑا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ مسئلہ کیا ہے؟ پھر اندھیرے میں اس کے سامنے ریت پر پڑے سفید کپڑے پر میری نظر پڑی، تو میں چونک کر آگے بڑھا۔ وہ شاید کہیں سے یہ کپڑا اٹھا لایا تھا اور مجھے یہی دکھانے کے لیے بار بار بھونک کر باہر بلا رہا تھا۔ ارے، یہ تو میرا ہی

کرتا تھا، جو دو دن پہلے ریت کے شدید طوفان کی وجہ سے مزار کی الگنی سے اڑ کر نہ جانے صحرا میں کہاں کھو گیا تھا، لیکن یہ کالے کو کہاں سے ملا۔ مجھے سانول نے بتایا تھا کہ جبروت کے سب ہی پالتو کتے انتہائی حد تک سدھائے ہوئے اور اپنی حسیات میں کمال حد تک ہوشیار ہوتے ہیں۔ اوہ..... تو پھر ضرور کالے نے کرتے میں میرے جسم کی باس پائی ہوگی، تب ہی وہ یہ کرتا یہاں اٹھا لایا۔ کہتے ہیں، کتے کی سونگھنے کی حس اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وہ سیکڑوں لوگوں میں سے اپنے مالک کے جسم کی بُو شناخت کر لیتا ہے۔ آج میں نے اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور میں اندر کی جانب دوڑا، ایک مبہم سی امید نے میرے اندر جیسے بجلیاں سی بھر دی تھیں۔ میرے کمرے میں ابھی تک سکینہ کی وہ اوڑھنی پڑی تھی، جو آج اس کی نانی سلطان بابا کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اگر سکینہ اسی صحرا میں کہیں بھٹک رہی ہے، تو شاید کالا اس کے دوپٹے میں بسی، خوش بو کو پا کر اس کا بھی کوئی کھوج نکال لائے۔ میں اوڑھنی لے کر اسی رفتار سے دوبارہ بھاگتا ہوا باہر آیا اور کالے کے سامنے اس پھٹی ہوئی چادر کو ڈال دیا۔ وہ کچھ دیر چاروں طرف گھوم کر اسے سونگھتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں کہ ہمیں اس اوڑھنی والی کی تلاش ہے۔ کالا اوڑھنی سونگھ کر پھر سے میرے اردگرد چکر لگانے لگا، شاید اسے میری بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے چادر زمین سے اٹھا کر اس کا ایک گولا سا بنایا اور اسے دور صحرا میں اچھال دیا۔ کالا فوراً بھاگا اور چادر کے قریب پہنچ کر بھونکنے لگا۔ اس بار شاید وہ میرا مدعا جان گیا تھا۔ اب وہ زور زور سے بھونک کر چادر کے گرد چکر کاٹ کر صحرا کی جانب دوڑ جاتا اور پھر واپس اپنی جگہ آ کر بھونکنے لگتا۔ میری رگوں میں خون کا دورانیہ بڑھنے لگا، گردش تیز ہو کر میری نسوں میں انگارے سے بھر گئی۔ میں صحرا میں کالے کے پیچھے لپکا۔ وہ جس طرح خاص سدھائے ہوئے کتوں کی طرح کچھ قدموں کے بعد رک کر میرا انتظار کرتا اور پھر بھاگنے لگتا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس اوڑھنی والی کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ میں اس کے نقشِ قدم پر دوڑتا ہوا صحرا پار کر رہا تھا۔ کالے کا رخ بستی کی جانب تھا اور کچھ ہی دیر میں ہم نصف شب کے وقت خوابِ خرگوش کے مزے لیتے ہوئے کال گڑھ کی ویران گلیوں میں دھول اڑا رہے تھے۔ کالا بنار کے آگے بڑھتا گیا۔ میرا سانس پھول چکا تھا اور قدم جواب دے رہے تھے۔ پھر بھی میں ایک ان جانی قوت کے زیرِ اثر، کالے کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر بستی کے آخر میں کالے کے قدم ایک جگہ جم سے گئے اور اس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں بھی اپنی جگہ ساکت سا ہو گیا۔ کالا اپنے پنجوں سے جس دیوار کو بار بار کھرچ رہا تھا، وہ جبروت کے قلعے کی چار دیواری تھی۔ مطلب سکینہ دیوار کے اس پار موجود تھی۔ اس وقت میرا بھی دل شدت سے یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش میرے ناخن بھی بڑھ جائیں اور میں کالے کے ساتھ مل کر اس پتھر کی دیوار کو کھرچ کھرچ کر ڈھا دوں یا اس میں نقب لگا کر اس آہنی قلعے کے اندر گھس کر سکینہ کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالوں، لیکن اس وقت ہم دونوں ہی شدید بے بس تھے، بلکہ شاید ٹھیک اسی لمحے اس جانور کے اختیار کی حدیں مجھ سے کہیں بڑھ کر ہی تھیں۔ تھکے قدموں سے ہم دونوں صحرا کی طرف لوٹ گئے۔ میں جب مزار کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا، تب سلطان بابا تہجد کی نماز ادا کر کے اٹھ ہی رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں سکینہ کی چادر دیکھ کر کچھ چونکے ”کیوں میاں؟ کس کھوج میں رہے رات بھر؟“ میں نے انہیں ساری روداد سنا دی۔ پوری بات سن کر انہوں نے گہری سانس لی ”لگتا ہے کوئی بڑا امتحان سر پر ہے..... یا اللہ ہمیں ثابت قدمی عطا کر۔“ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور میں یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ اگر سکینہ واقعی جبروت کے قلعے میں کہیں قید ہے، تو اسے نکالنے کے لیے پوری فوج درکار ہوگی، کیوں کہ اس علاقے میں پتا ہلانے کے لیے بھی جبروت کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اسی سوچ میں خبر ہی نہیں ہوئی کہ جانب کب سورج نکلا اور میرے وجود میں دھوپ کے نیزے گڑنے لگے۔ میں تب چونکا، جب میرے ماتھے سے بہتا پسینہ ٹپ ٹپ مزار کے صحن میں بچھی ریت پر گر کر جذب ہونے سے پہلے ہی فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ سلطان بابا کے ٹوکنے پر میں تپتی دھوپ سے ہٹ کر گرم سائے میں جا بیٹھا، لیکن ابھی شاید میرے مقدر میں بہت کڑی دھوپ باقی تھی۔

کچھ ہی دیر میں مزار کے باہر کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور اکرام صاحب اور نوری کے والد، کسی دوسرے بزرگ کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان سب کے چہرے سُتے ہوئے تھے اور ماتھے پر پڑی شکنیں اندر کا حال بتا رہی تھیں۔ سچ ہے کہ چہرے کا آئینہ شیشہ ہوتا ہے اور دل کا آئینہ چہرہ، لیکن آج ان سب کا آئینہ دھندلایا ہوا تھا۔ نوری کا باپ بے حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان بابا کے استفسار پر مشکل اس کے منہ سے صرف ایک جملہ نکلا ”جبروت نے نوری کا رشتہ مانگ لیا ہے۔“ میرے ہاتھ میں اکرام صاحب کو دینے کے لیے پکڑا، پانی کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ جملہ کیا تھا، ایک ایسا شدید دھماکا تھا، جو پل بھر میں پورے صحرا کو تہس نہس کر گیا۔ میں نے بے ساختہ چلا اٹھا۔ ”لیکن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ساری بستی جانتی ہے کہ نوری، سانول کی منگیتر ہے اور سانول صرف اسی رشتے کی تکمیل کی خاطر ابھی کل ہی محنت مزدوری کے لیے شہر گیا ہے، پھر یہ سب کچھ.....“ میرے لفظ میرے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے۔ نوری کا باپ تو اس قدر روہانسا ہو چکا تھا کہ اس سے جواب میں کچھ کہا ہی نہیں گیا، البتہ کچھ لمحوں بعد اکرام صاحب ایک لمبا سا سانس لے کر بولے۔ ”کاش ہم سانول کے ساتھ ہی نوری کو بھی دو بول پڑھا کر شہر رخصت کر دیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نوری کو سانول کے گھر والوں نے اس کے لیے مانگ رکھا تھا، لیکن ابھی تک باقاعدہ کوئی رسم تو ادا نہیں کی گئی تھی، ان کی تو منگنی بھی نہیں ہوئی اور ایسی صورت میں کسی بھی طرف سے لڑکی کے لیے رشتہ آ سکتا ہے، ہاں بستی والے تو اس زبانی رشتے کا بھی سدا احترام کرتے، لیکن کسی کی نیت ہی اگر بری ہو ہو، تو پھر اس کا کیا علاج.....؟“ میں نے چونک کر اکرام صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے سلطان بابا کو جو تفصیل بتائی، اس کے مطابق جبروت شاید بہت پہلے سے اس رشتے کی تاک میں تھا اور اس نے مناسب موقع پر یہ تیر چلایا تھا۔ ویسے بھی وہ یہ تکلف صرف نوری کے ماں، باپ کے اطمینان کے لیے کر رہا تھا، ورنہ بستی میں جس کسی گھر میں جب کبھی قلعے کی طرف سے کوئی رشتہ آیا تھا، تب اس کے بعد نہ تو کسی کو انکار کی جرأت ہوئی اور نہ ہی کبھی بستی میں سے کسی دوسرے گھر نے جبروت کے مانگے ہوئے رشتے پر کمند ڈالنے کی ہمت کی تھی۔ اس لیے اگر کبھی جبروت کی طرف سے بستی میں کسی گھر کی بیری کی طرف پتھر آتا، تو وہاں ماتم اپنے ڈیرے ڈال دیتا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے اس گھر میں موت کا سناٹا چھا جاتا تھا، میں نے جلدی سے اکرام صاحب سے پوچھا ”سانول کے باپ کا کیا کہنا ہے.....؟“ ”وہ بے چارا کیا کہے گا۔ اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے یہ سنتے ہی۔ غریب کا احتجاج کیا ہوتا ہے، صرف بددعا اور جل کڑھ کر اپنے اندر ہی کو مار دینا، وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی اسے اپنے بیٹے کی فکر بھی کھائے جا رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سانول یہ سنتے ہی الٹے پاؤں بستی دوڑا چلا آئے گا اور سانول کا باپ یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو لے، لہٰذا اس کی پوری کوشش ہوگی کہ یہ خبر سانول تک کبھی نہ پہنچے، کیوں کہ یہاں جس نے بھی قلعے داروں سے جھگڑا مول لیا۔ اس کے کاندھے ہمیشہ کے لیے سر کے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔“ اکرام صاحب کی بات ختم ہوتے ہی مزار میں سناٹا سا چھا گیا۔ صرف آس پاس چلتی لُو کی سائیں سائیں اور ریت کے بگولوں کے رقص کا شور فضا میں باقی رہ گیا۔ کچھ باتوں کی سنگینی کا احساس ہمیں یک دم نہیں ہوتا، لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، اعصاب کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور ہمیں دھیرے دھیرے اپنی بے بسی اور اس حادثے کے مضمرات کا پتا چلتا ہے۔ ٹھیک یہی حال اس وقت میرا بھی تھا۔ میرے پاس سانول کا پتا نہیں تھا اور اس کے گھر والے اب کسی حال میں مجھے اس کی کوئی خبر نہ دیتے۔ شاید نوری کو شہر میں سانول کے رہنے کی جگہ کی کچھ خبر ہو، لیکن میں نوری سے اس کا پتا کیسے لے سکتا تھا، وہ تو سات پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔ میں تو صرف سانول کے پہلے خط ہی کا انتظار کر سکتا تھا، جس کا اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، لیکن تب تک کو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ جانے نوری کا کیا حال ہوگا۔ وہ بھی تو کسی بے بس چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہوگی۔ میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ سلطان بابا کی آواز نے مجھے ڈرا ہی دیا۔ ”آپ لوگوں نے اب کیا سوچا ہے۔ کیا پوری بستی میں کوئی بھی ایسا نہیں، جو اس ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کر سکے؟“ ان تینوں بزرگوں کے سر ندامت سے جھک گئے۔ ”کاش کسی میں اتنی جرأت ہوتی۔ ہم تو بس آپ سے دعا کی التجا کرنے آئے ہیں۔ آپ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں اس ظالم شخص کے قہر سے بچا لے۔“ سلطان بابا کی آواز بلند ہو گئی۔ میں نے انہیں اتنی تیز آواز میں بات کرتے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ ”یہ دعا کا نہیں، عمل کا وقت ہے۔ خدا بھی ان کی حالت کبھی نہیں بدلتا، جو خود کو بدلنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔“ تیسرے بزرگ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں دخل دیا۔ ”آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن اس بستی کی تیسری نسل تک قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان کی روحیں تک جبروت کی غلام ہیں۔ ان بوسیدہ جسموں سے آپ ایسی کوئی توقع نہ رکھیں۔ شاید ہم سے زیادہ بے بس کوئی اور نہ ہو۔“ سلطان بابا نے تسبیح رکھ دی اور گرج کر بولے ”ٹھیک ہے..... اگر ساری بستی کی روح غلام اور جسم بوسیدہ ہو چکے ہیں، تو پھر یہ فریضہ بھی اب مجھے ہی انجام دینا ہوگا۔ چلو عبداللہ..... مجھے جبروت کے قلعے لے چلو۔ وقت آ گیا ہے کہ اس سے دو بدو بات کر لی جائے۔“ سلطان بابا نے پاؤں اپنی کھڑاؤں میں ڈالے اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں بزرگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟“

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

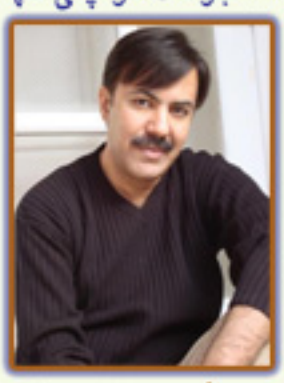

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

اکرام صاحب نے، جواب تک سلطان بابا کے اس اچانک فیصلے سے بوکھلائے ہوئے تھے، مدد مانگنے کے انداز میں یوں میری جانب دیکھا، جیسے میں واقعی سلطان بابا کو روک ہی تو لوں گا، لیکن میں خود اپنے حواس میں کب تھا اور پھر میرا کام تو صرف تعمیل تھا، لہٰذا میں سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں ان کے پیچھے پیچھے مزار سے نکل پڑا۔ راستے میں نوری کے والد نے ایک بار پھر سلطان بابا سے درخواست کی کہ اس طرح براہِ راست جبروت کی مخالفت میں کھڑے ہو جانا شاید ٹھیک نہ ہو، لیکن سلطان بابا کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا کہ آج نہیں تو کل، اس سے کسی نہ کسی کو تو بات کرنی ہی ہوگی، تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔ بستی قریب آئی تو سلطان بابا نے رک کر ان تینوں بزرگوں کو مخاطب کیا۔ ''میں آپ لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں، لہٰذا بستی کی اس سرحد سے آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ تینوں کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ نوری میرے لیے بھی بیٹی ہی کی طرح ہے، لہٰذا آپ سب یہ اطمینان رکھیں کہ میرا کوئی بھی فیصلہ میری اپنی ذات کے لیے ہوگا اور نہ ہی آپ کو مزید کسی مشکل میں ڈالے گا، البتہ جو مشکل پہلے سے سر پر آن پڑی ہے، اس کا تدارک اب ضروری ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ ظلم کو چپ چاپ سہنے والا ظالم سے بھی بدتر ہے۔'' کچھ دیر کے لیے ماحول پر سناٹا سا چھا گیا، صرف فضا میں اڑتی چیلوں اور کال گڑھ کے نارنجی آسمان میں بھٹکتے گدھوں کا شور باقی رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اکرام صاحب ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آخر کسی کو تو پہل کرنی ہی ہوگی۔ آپ بستی کے سگے نہیں، لیکن پھر بھی آپ صرف ہم سب کی خاطر یہ زبان بندی توڑنے کے لیے یہاں تک چلے آئے۔ میں اور لڑکی کا باپ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔'' تیسرے بزرگ کو انہوں نے بڑی مشکل سے بستی کے باہر ہی سے رخصت کر دیا اور کچھ دیر بعد ہم سب کال گڑھ کے بازار میں جبروت کے قلعے کے سامنے کھڑے تھے۔ بازار میں لوگوں نے نوری کے باپ کو ہمارے ساتھ جاتے دیکھا، تو وہ تجسس کے مارے ہمارے ساتھ ہی چل پڑے۔ کال گڑھ کی آبادی مختصر سی تھی اور ظاہر ہے کہ جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے کی ان سب ہی کو خبر ہوگی، لیکن جب انہوں نے سلطان بابا کو قلعے کے سامنے رکتے دیکھا، تو ان سب کے قدم وہیں اپنی اپنی جگہ جمتے چلے گئے اور کچھ ہی دیر میں، میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے باپ سمیت ایک ایسے گول مجمع کے درمیان گھرے ہوئے تھے، جو ہم چاروں سے کچھ فاصلے پر یوں کھڑا تھا، جیسے ان سب کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ اندر سے قلعے کے دیوہیکل چوبی دروازے کے دربان نے بھی باہر کوئی غیر معمولی بات محسوس کر کے دروازے کے ایک پٹ میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کی درز سے باہر جھانکا اور پھر ہمیں یوں راستے میں کھڑا دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ''کیا بات ہے، یہ بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے یہاں.....؟'' دربان کی جھاڑ سن کر مجمع میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا ایک شور گونجا اور سب ہی لوگ چند قدم مزید پیچھے ہٹ گئے۔ سلطان بابا ٹھہری ہوئی آواز میں بولے ''مجھے تمہارے مالک سے بات کرنی ہے۔ جا کر اسے اطلاع کرو کہ باہر کچھ ملاقاتی آئے ہیں۔'' دربان کے چہرے پر حیرت کا تاثر ابھرا، اسے شاید اس لہجے اور اس بے باکی کی عادت نہیں تھی۔ ''مالک سے ہر کوئی یوں نہیں مل سکتا۔ مالک اسی سے ملتا ہے، جس سے اس کی مرضی ہو۔ ویسے بھی وہ اس وقت یہاں نہیں ہے، شکار کے لیے صحرا کی طرف گیا ہوا ہے، شاید کل تک واپسی ہوگی۔ تم لوگوں کو اگر ملنا بھی ہے، تو پہلے مالک سے وقت طے کرنا ہوگا، پھر آنا.....'' دربان اپنی بات ختم کر کے نخوت سے منہ بناتا ہوا واپس اندر پلٹ گیا۔ بھیڑ کے لیے اب مزید کوئی دل چسپی یہاں باقی نہیں رہ گئی تھی، لہٰذا لوگ بھی اِدھر اُدھر چھٹنے لگے۔ بہرحال، ہماری آمد کا نصف مقصد تو حل ہو ہی گیا تھا۔ دربان جبروت کی واپسی پر اسے یہ اطلاع ضرور دے گا کہ مزار کا بزرگ متولی اس سے ملنے کے لیے قلعے کے دروازے پر دستک دے چکا ہے۔ اب ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی اور چارا نہیں تھا، لہٰذا میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے والد سے رخصت لے کر واپس مزار کی جانب پلٹ آئے۔ راستے میں میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ اگر میں کسی طرح نوری کے گھر والوں کو اس بات پر قائل کرنا چاہوں کہ وہ لوگ معاملہ نمٹنے تک نوری کو لے کر کہیں روپوش ہو جائیں، تو کیا یہ عارضی حل انہیں قابلِ قبول ہوگا، لیکن پھر خود میرے ہی دماغ نے اس خیال کو رد کر دیا۔ پہلے تو نوری کے گھر والے میری ایسی کوئی بات سنیں گے ہی کیوں؟ اور پھر اگر میں کسی طرح انہیں قائل کر بھی لوں تو کیا جبروت نے ایسے کسی متوقع اقدام کے لیے پیش بندی نہیں کر رکھی ہوگی۔ میں جس قدر سوچ رہا تھا، اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے پھندا نوری کے گرد تنگ ہوتا نظر آ رہا تھا اور شاید یہ اسی پھندے کی گھٹن ہی تھی کہ جس نے نوری جیسی سہمی ہوئی چڑیا کو بھی اپنے پنجرے میں پھڑپھڑانے پر مجبور کر دیا۔

عصر سے کچھ دیر بعد میں نے جب اسے اپنے شکستہ قدم باپ کے ساتھ صحرا عبور کر کے مزار کی جانب آتے دیکھا، تو پہلے تو کچھ دیر تک میں اسے بھی سراب ہی سمجھتا رہا، لیکن پھر جب وہ ایک حقیقت کی طرح مزار کی دہلیز عبور کر کے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی، تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا ہی پڑا۔ میں بے یقینی کے عالم میں ان دونوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا عصر کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور اس وقت مزار کے صحن میں صرف

میں تھا یا آس پاس چلتی گرم لُو کی سرگوشیاں۔ نوری کے باپ نے سلام کے بعد ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا ”یہ بدنصیب آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے، میں اسے لے کر یہاں کبھی نہ آتا کہ اب تو اس کے گھر سے باہر نکلے قدموں سے بھی ڈر لگتا ہے، لیکن بالآخر ایک مجبور، لاچار باپ اپنی لاڈلی کی آخری فرمائش پوری کرنے چلا آیا ہے۔ نوری کی حالت میری سوچ سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں رات بھر کے اشکوں کی کہانی سنا رہی تھیں۔ وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی ”چھوٹے پیر جی..... آپ کسی طرح سانول کو اطلاع کروا دیں، ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔“ گویا اس نے مجھ سے وہی مانگ لیا، جس کی توقع میں اس سے کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نوری سے سانول کے شہر کا پتا پوچھا، تو اس نے ہاتھ میں پکڑا ایک مڑا تڑا سا کاغذ میرے حوالے کر دیا۔ اس پر سانول ہی کی کچی تحریر میں قریبی شہر کے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک کسی مسافر خانے کا پتا درج تھا، لیکن یہ قریب ترین شہر بھی کال گڑھ سے پورے ایک دن کی مسافت پر ریل کے راستے سے منسلک تھا۔ میرے جی میں آیا کہ نوری کے باپ سے کہوں کہ ابھی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اور میرے ساتھ کال گڑھ سے نکل پڑے۔ جبروت کی واپسی سے پہلے ہم ٹرین کے ذریعے سانول تک پہنچ سکتے تھے، لیکن سلطان بابا کو یہاں اکیلا چھوڑ کر بھی تو میں کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے نوری کے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم مزار کی دیوار سے پرے خلا میں گھور رہا تھا۔ میں نے اسے پکارا تو وہ سٹ پٹا سا گیا۔ ”یہاں سے اگلی گاڑی کتنے بجے چھوٹے گی.....؟ میرا سوال سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں کون سا منصوبہ کلبلا رہا ہے۔ ”نہ چھوٹے پیر جی، کال گڑھ سے باہر پیر نکالنے کا مطلب ہمیشہ کے لیے یہاں سے علاقہ بدر ہونا ہے، پھر میری سات نسلیں بھی دوبارہ یہاں بسنا چاہیں، تو یہ ظالم ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔“ ”سوچ لو! تمہیں اپنی اگلی سات نسلیں بچانی ہیں یا اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی..... فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے، لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ بیٹی زندہ رہے گی تو.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ نوری کے باپ نے بے بسی سے سر پٹخا اور پھر آدھے گھنٹے کے طویل وقفے کے بعد اس نے نظر اٹھائی، تو وہ ایک ایسے ہارے ہوئے جواری کی نظر تھی، جس نے اپنا سب کچھ آخری داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ طے یہ پایا کہ رات ساڑھے گیارہ بجے والی گاڑی کو پکڑا جائے گا۔ نوری کی ماں کو اس سے پہلے ہی اکرام صاحب کے ساتھ اونٹوں کے قافلے کی ہم راہی میں آج شام اس کی بہن کے پاس کسی دوسری بستی کے لیے روانہ کر دیا جائے گا اور نوری صرف اپنے باپ کے ہم راہ رات دس بجے سے پہلے مجھے بستی کے باہر ریلوے اسٹیشن کی راہ پر ملے گی۔ میں انہیں گاڑی پر سوار کروا کر واپس کال گڑھ لوٹ آؤں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جبل پور والے خان صاحب کے نام ایک خط بھی نوری کے باپ کے حوالے کر دوں گا اور انہیں مکمل تفصیل اور پتا لکھ کر سمجھا دوں گا کہ وہ شہر پہنچتے ہی سانول کو لے کر آگے جبل پور کے لیے روانہ ہو جائیں۔ مجھے یقین تھا کہ خان صاحب کو ان مظلوم لوگوں کو پناہ دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ نوری کے باپ کو اپنے دوست کاشف اور پاپا کے تمام ٹیلی فون نمبرز بھی احتیاطاً ایک الگ کاغذ پر لکھ کر دے دوں گا، تاکہ کسی ہنگامی صورت میں وہ پہلا ٹیلی فون میسر آتے ہی ان سے بات کر سکے۔ میں نے نوری کے باپ کا کاندھا تھپک کر اسے ہمت دلائی اور انہیں رخصت کیا، تاکہ وہ گھر جا کر اس ”ہجرت“ کی تیاری کر سکیں۔ نوری اس تمام گفتگو کے دوران سر جھکائے خاموش کھڑی رہی، لیکن واپس پلٹنے سے پہلے وہ شکر گزاری کے بول بولنے کی کوشش میں روہانسی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ کبھی کبھی یہ لفظ ہمارے احساس کو منتقل کرنے کے لیے کس قدر کم یاب ہو جاتے ہیں یا شاید بعض جذبے اور احساسات ہوتے ہی ایسے ہیں کہ دنیا کی بہترین لغت بھی ان کے احاطے کے لیے ناکافی ہو جاتی ہے۔ ان کے جاتے ہی میں نے کمرے میں جا کر عبادت میں گم، سلطان بابا کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ میری بات سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، پھر صرف اتنا ہی بولے ”ٹھیک ہے، اگر ان سب پر یہ زمین اتنی ہی تنگ ہو گئی ہے، تو پھر ان کا یہاں سے ٹل جانا ہی بہتر ہے۔ تم سے جو مدد ممکن ہو، ضرور کرو۔“

رات نو بجے تک میں اپنی تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ خطوط کو علیحدہ علیحدہ لفافوں میں بند کرنے کے بعد میں سلطان بابا سے اجازت لے کر بستی کی جانب چل پڑا۔ اچانک ہی مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اپنا گھر بار چھوڑنا، اپنی جائے جنم ترک کرنا، کس قدر مشکل اور اذیت ناک عمل ہوتا ہے، شاید اسی لیے مذہب میں ہجرت کا اس قدر اعلیٰ درجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تو گویا ایک بار پھر سے جنم لینے کے مترادف ہی ہوتا ہے۔ میں بستی کے باہر اسٹیشن کی راہ کو جانے والی صحرائی پگڈنڈی پر پہنچا، تو مجھے مزار سے نکلے ٹھیک آدھ گھنٹے بیت چکا تھا۔ چاند پوری طرح کھل کر آسمان سے نور برسا رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں آج یہ چاندنی مجھے کھٹک رہی تھی۔ اجالے کا واسطہ شناخت سے ہوتا ہے اور جب مقصد ہی، اپنی شناخت کو دوسروں سے اوجھل رکھنا ہو، تو اجالا کبھی کبھی انسان کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔ ہم انسان بھی کس قدر مطلبی ہوتے ہیں۔ کبھی میں اسی چاند کی چاندنی کے لیے مہینہ بھر انتظار کے کرب میں مبتلا رہتا تھا اور ٹھیک ہر چاند کی چودھویں رات کو اپنے تمام دوستوں سمیت ساحل پر، یا کھلے سمندر میں کسی بحری جہاز کے عرشے پر ہلا گلا کرنے اور محفل سجانے کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ تب یہ چاندنی مجھے کس قدر رومان پرور محسوس ہوتی تھی اور آج میرا دل چاہ رہا تھا کہ پورے صحرا کے آسمان پر ایک سیاہ چادر ڈال دوں یا کال گڑھ ہی پر کوئی چھتری تان دوں، تاکہ بستی چھوڑنے والوں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے، لیکن ایسی چھتریاں اگر کہیں میسر ہوتیں تو جانے کتنے سیاہ نصیب اپنے مقدر کے سورج پر تاننے کے لیے بازار سے خرید نہ لاتے۔ کچھ ہی دیر میں ٹیلے سے پرے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا، تو دور ٹیلے سے پرے نوری اور اس کا باپ تیز قدموں سے ریت کا دریا عبور کرتے نظر آئے۔ نوری کے ہاتھ میں شاید اس کے کپڑوں کی ایک گٹھڑی تھی، جسے اپنے سینے سے لگائے اور لمبا سا گھونگھٹ نکالے، وہ اپنے باپ کی تیز رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی، جو ہر چند قدم بعد رک کر اپنی بیٹی کو جھڑک کر تیز چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ ٹیلے تک پہنچے، تو نوری کا سانس بری طرح پھول چکا تھا، لیکن اپنے باپ کے خوف سے وہ اپنی الجھی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی تمام تفصیل نوری کے باپ کو سمجھائی اور خط اس کے حوالے کر دیے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور ابھی ہمیں گھنٹہ بھر کی مسافت طے کر کے ریلوے اسٹیشن بھی پہنچنا تھا، اس لیے میں ان دونوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے چل پڑا۔ اب وہاں صرف صحرا تھا، چاندنی تھی اور ہمارے ریت میں دھنستے قدموں کی چاپ.....

میری کوشش تھی کہ ہم صحرا کے مرکز کے بجائے آس پاس ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں۔ ہر آہٹ پر ہم تینوں بری طرح چونک جاتے اور ریت کی غیر معمولی سرسراہٹ سے بھی ہمارا دم اٹکنے لگتا۔ اسٹیشن اب تھوڑی دور رہ گیا تھا، لیکن منزلوں کا تعلق بھلا فاصلوں کے گھٹنے یا بڑھنے سے کب ہوا ہے اور پھر میری کمند تو ہر بار تب ہی ٹوٹی تھی، جب دو چار ہاتھ باقی تھے بام کو۔ اچانک ہی صحرا میں جیپ کے زوردار انجن کی فرّاٹے بھرتی آوازیں گونجی کہ ہم تینوں ہی اچھل کر رہ گئے۔ جیپ کسی قریبی ٹیلے کے پیچھے ہی چھپا کر کھڑی کی گئی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی کے دائرے میں ہمارے پاؤں جم کر رہ گئے۔ نوری کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے روشنی کے دائرے سے پرے جھانکنے کی کوشش کی۔ فضا میں چند بھدّے قہقہے ابھرے اور جیپ میں بیٹھے چار ہیولوں میں سے ایک ترنگ میں بولا۔ ”کہاں جا رہے ہو چھوٹے پیر جی..... کہو تو ہم چھوڑ آئیں۔“ وہ سب لوگ پھر زور سے ہنسے اور ایک ہیولا جیپ سے نکل کر روشنی کے سامنے آ گیا۔ وہ اکرم تھا، جبروت کا خاص کارندہ۔ میرے سینے میں جیسے ایک تیر سا گڑھ کر رہ گیا۔ میں جسے غافل سمجھ رہا تھا، وہ مجھ سے زیادہ ہوش و حواس میں ثابت ہوا۔ جبروت نے پہلے ہی نوری کے گرد پہرا بٹھا رکھا تھا اور اسے شاید مزار سے شروع ہوئی، اس کہانی کی ہر تفصیل کی خبر تھی۔ وہ صرف ہم سے کھیل رہا تھا اور کسی مناسب موقعے کے انتظار میں تھا کہ جب ہمیں رنگے ہاتھ پکڑ سکے اور میں نے یہ موقع اسے پلیٹ میں رکھ کر فراہم کر دیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے نوری پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور زور سے ہنسا ”کیوں پیر جی، تم اسے

بھگا رہے تھے یا یہ تمہیں لے کر بھاگ رہی تھی۔ ویسے معاملہ چاہے کچھ بھی ہو، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ جوانی چیز ہی ایسی ہے کہ انسان خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔'' وہ چاروں پھر سے زوردار قہقہہ لگا کر ہنسے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہم تینوں کو ہانک کر جیپ میں بٹھا کر واپس کال گڑھ کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نوری اور اس کے باپ کے چہرے پیلے پڑ چکے تھے، خاص طور پر نوری کی حالت بہت بری تھی، مجھے لگا کہ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ وہ ان چاروں کے سردار کی منظورِ نظر نہ ہوتی، تو شاید وہ اس سے مزید بدتمیزی کرتے، لیکن شاید انہیں اتنا ہی حکم دیا گیا تھا کہ ہمیں قابو کر کے قلعے تک پہنچا دیا جائے۔ نوری کے باپ اور میری مشکیں، البتہ وہ پہلے ہی کس چکے تھے۔

جیپ قلعے میں داخل ہوئی، تو جس احاطے میں ریچھ کی لڑائی ہو رہی تھی، اس کے بائیں جانب ایک تنگ سی راہ داری سے ہوتے ہوئے گاڑی قلعے کی پچھلی جانب ایک صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف بلند شہتیروں کے ستونوں والے برآمدے تھے اور چاروں جانب کمروں کی قطاریں۔ پھر اوپری منزل میں روشنی ہوئی اور ایک کرخت چہرے والا بوڑھا ہاتھ میں بڑا سا گیس لیمپ لیے برآمدے میں نکل آیا۔ وہ اوپر ہی سے چلا کر بولا۔ ''لے آئے ہو انہیں۔ بند کر دو، الگ الگ کمروں میں۔ صبح سردار لوٹ کر ان کا فیصلہ کرے گا۔'' اکرم کے ساتھ کھڑے کارندے نے مجھے ایک جانب دھکیلا اور دوسرے نے نوری کے باپ کو دوسری جانب دھکا دیا۔ اوپر سے بوڑھا چلایا ''لڑکی کو چھوٹی سرکار کے پاس لے جاؤ اور بوڑھے کو بند کر دو۔'' نوری چلائی ''میں کہیں نہیں جاؤں گی'' لیکن اتنی دیر میں نہ جانے اندھیرے میں کہاں سے دو عورتیں برآمد ہوئیں اور نوری کو کھینچتے ہوئے ایک جانب لے گئیں۔ قلعہ نوری کی چیخوں سے کچھ دیر کے لیے گونجا اور پھر نوری کی آواز اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئی۔ مجھے اور نوری کے باپ کو پہلے ہی چاروں کارندے قابو کر چکے تھے۔ نوری کے باپ نے بہت دہائی دی، فریاد کی، لیکن ان لوگوں پر بھلا ایسی فریادوں کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہم دونوں کو کال کوٹھڑی نما چھوٹے چھوٹے علیحدہ کمروں میں دھکیل کر باہر سے تالا ڈال کر واپس جا چکے تھے۔ بوڑھے کی باتوں سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جبروت فی الحال کال گڑھ میں موجود نہیں تھا اور کل اس کی واپسی متوقع تھی، لیکن وہ اس قدر شاطر تھا کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی نوری کے پہرے کا تمام بندوبست کر کے گیا تھا۔ نوری اور اس کے بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی اور پھر وہاں سلطان بابا بھی تو میرا انتظار کر رہے ہوں گے، اور جب میں رات بھر مزار نہیں پہنچوں گا، تو وہ بھی تو پریشان ہو جائیں گے۔ سچ ہے کہ تقدیر ہماری تدبیروں سے ایک چال ہمیشہ آگے ہی رہتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ اس چھوٹے سے تہہ خانے نما کمرے میں صرف ایک مختصر سا روشن دان موجود تھا، جس میں لگی لوہے کی سلاخوں سے باہر آسمان پر چمکتا چاند مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے کسی گول روٹی کو چھری سے چار حصوں میں اُفقی رخ پر تقسیم کر دیا گیا ہو۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے مجھے اسی چاند کی روشنی سے شکایت تھی اور اب اس اندھیری کوٹھڑی میں پھر اسی کی چاندنی اپنا نور بکھیر کر میری وحشت کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلو اچھا ہے کہ قدرت کی نعمتیں بھی انسانوں کی طرح ہماری ناشکری پر ہم سے روٹھ نہیں جاتیں، ورنہ آج تک ہم میں سے نہ جانے کتنے بارش، ہوا، بادل، دھوپ، خزاں، بہار اور اسی جیسی نہ جانے کتنی سوغاتوں سے محروم ہو چکے ہوتے، کہ انسان کی تو فطرت ہی شکوہ ہے۔ میرے ہاتھ اس مضبوطی سے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے کہ رسی کے سخت ریشے کلائیوں کی جلد میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ میں اسی طرح بندھے ہاتھوں کے ساتھ اندھیرے میں دیوار ٹٹول کر ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ دفعتاً سامنے والی دیوار کی جانب ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور اندھیرے میں دو دیا سلائیاں سی جلتی ہوئی نظر آئیں، میرے جسم کو پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک ایک سرد سی لہر جھنجھوڑ گئی۔ یہ کسی جہازی سائز کے چوہے کی دو آنکھیں تھیں، جو اندھیرے میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ بالکل میرے پیروں کے قریب بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے جن چیزوں سے شدید کراہیت محسوس ہوتی تھی، چھپکلی اور چوہا، ان میں سرِفہرست تھے، کہاں تو ان جان داروں کی صرف کمرے میں موجودگی کے احساس ہی سے میری رگیں تن جاتی تھیں اور میں ایک لمحہ بھی وہاں نہیں گزار سکتا تھا اور کہاں آج میرے قدموں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ایک ایسی ہی مخلوق میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑھے بیٹھی تھی۔ شاید میں نے، جس جگہ دیوار سے ٹیک لگائی تھی، وہیں اس چوہے کا گھریا راستہ تھا، لیکن اب میری مجبوری یہ تھی کہ اپنے بندھے ہاتھوں کی وجہ سے میں گھٹنے ٹیکے بغیر دوبارہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اگر میں گھٹنے ٹیکنے کی کوشش کرتا، تو ڈر تھا کہ کہیں وہ کچلا نہ جائے، لہٰذا میں یونہی ساکت بیٹھا رہا اور ہم دونوں اسی طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ شاید وہی لمحہ تھا، جب ''جبر'' کی صحیح تعریف مجھے سمجھ میں آئی۔ جبر صرف قید و بند کا نام نہیں، نہ ہی صرف جسم کا پابند سلاسل ہونا جبر کہلاتا ہے۔ اصل جبر تو روح کی اسیری ہے، ہماری روح اور ہمارے اندر کو کسی ایسے کام کے لیے پابند کرنا، جو ہماری سرشت اور فطرت کے خلاف ہو، پھر چاہے روح کی وہ بندش، کسی عالی شان محل میں کم خواب کے بستر پر ہو یا پھر کسی ایسی کال کوٹھڑی میں، جہاں آج میں بند تھا۔ قدرت نے آج مجھے ایک ایسے جان دار کے ساتھ اس زندان میں لا ڈالا تھا، جس کی موجودگی کے احساس ہی سے میری آنتیں الٹنے لگتی تھیں، اور آج وہ میرے اس قدر قریب تھا کہ اس کی تیز دھونکنی جیسی سانس کی آواز بھی میں سن سکتا تھا۔ اس سے بڑا جبر میرے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں ہی میں یہ خوف ناک قلعہ، جبروت کی قید، اس رات کی تنہائی اور یہ کال کوٹھڑی، سب ہی کچھ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اب اصل امتحان اس چوہے کی، جسم کو مَس کرتی ہوئی موجودگی میں، ساری رات بتانا تھا۔ شاید کچھ اسی طرح کے جبر کا شکار وہ چوہا بھی تھا۔ ہم دونوں اسی خیال سے گھنٹوں اپنی جگہ ساکت جمے رہے کہ اگر پہلے نے حرکت کی، تو دوسرا بھی ردِعمل ظاہر کرے گا اور اسی جبر میں وہ ساری رات گزر گئی۔ رُوسو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان بظاہر آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن تمام عمر ان دیکھی زنجیروں میں بندھے گزار دیتا ہے۔ آج مجھے ان دیکھی زنجیروں کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ جانے کب چاند ڈوبا اور کب کال گڑھ کے اس ناراض سورج نے اپنی بھٹی سلگائی، باہر قدموں کی چاپ سن کر میری بیتی رات کا وہ ساتھی، شب گرد جلدی سے دوڑ کر قید خانے کی ایک ابھری ہوئی اینٹ کی اوٹ میں جا کر چھپ گیا۔ آنے والے جبروت کے دو غلام تھے۔ انہوں نے گھسیٹ کر مجھے کھڑا کیا اور کوٹھڑی سے باہر دھکیلا۔ زندان سے نکلنے سے پہلے میری نظر چوہے کی نظر سے ٹکرائی۔ میرے دل نے کہا ''شکریہ دوست، تم نے مجھے زندگی کا ایک نیا سبق دیا۔ اگر قسمت میں کچھ سانسیں مزید لکھی ہیں، تو اب بڑے سے بڑے جبر کا سامنا بڑی آسانی سے کر سکوں گا.....'' وہ دونوں غلام مجھے دھکیلتے ہوئے اسی احاطے کی طرف بڑھنے لگے، جہاں میں نے جبروت کا پہلا تماشا دیکھا تھا۔ جیسے جیسے ہم تنگ راہ داریوں سے گزرتے ہوئے قلعے کے بیرونی احاطے سے نزدیک ہوتے گئے، ویسے ویسے کسی ہجوم کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ کا شور بڑھتا گیا۔ ایسے لگتا تھا، جیسے لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم دیواروں کی پرلی جانب جمع ہو رہا ہے۔ میں فی الحال برآمدوں کے اندھیرے سایوں سے گزر رہا تھا اور پھر جیسے ہی میں نے آخری غلام گردش کے ختم ہونے پر، کھلے احاطے میں آگ برساتے سورج کی روشنی میں، پہلا قدم رکھا، تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ احاطہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور سب ہی لوگ اسی طرح ایک گول دائرے میں کھڑے تھے، جیسے ریچھ کے تماشے والے دن وہ سب یہاں جمع تھے۔ ایک جانب نوری کا باپ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہاتھ لیے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ان میں سے چند چہروں کی آنکھوں میں، جنہیں میں بستی میں سانول کی بیماری اور نمازِ استسقاء کے موقع پر دیکھ چکا تھا، تاسف اور بے بسی کی ایک لہر سی تھی، البتہ جبروت کے کارندے ہماری حالت پر خوش تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک جانب سے شور سا اٹھا اور لوگوں کے بیچ ایک رستہ سا بنتا گیا۔ مجمع میں کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور میرا دل الٹنے لگا۔ اکرم اور دو نئے کارندے سلطان بابا کو لیے قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ سلطان بابا کے چہرے پر وہی ازلی سکون طاری تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ان کی حالت کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دی۔ سلطان بابا نے اندر آتے ہی رعب دار آواز میں سارے ہجوم کو سلام کیا اور اطمینان سے تسبیح گھماتے ہوئے ٹھیک میرے سامنے دوسری جانب آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ میرے بندھے ہاتھ اور حالت دیکھ چکے تھے۔ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور مجھے لگا کہ جیسے انہوں نے مجھ سے پوچھا ہو ''کیسے ہو عبداللہ میاں.....؟'' میں نے بھی اسی غیر مرئی رابطے سے سر ہلا کر انہیں اپنے اچھے ہونے کا اطمینان دلایا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر زیرِ لب دعا دی، لیکن جانے کیوں مجھے ان کی پلکوں کے گوشے بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے جلدی سے نظر جھکا لی کہ یہ لوگ کہیں میری بھیگی پلکوں کو اس قید اور تکلیف کا شاخسانہ نہ سمجھ لیں۔ کاش دل کی کاٹ سے نکلے آنسوؤں کا رنگ عام درد کے آنسوؤں سے کچھ مختلف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا.....

اچانک بھیڑ پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پہرے داروں نے جلدی جلدی اپنی جگہ سنبھالی اور پھر احاطے میں بچھے تخت کے پیچھے سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا جبروت نمودار ہوا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی وہ سرد، سفاک اور قہر بھری نظر میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی۔ میری نظر اس کی نظر سے ٹکرائی اور کچھ دیر ہم دونوں یونہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ مجھے اس کی نظر میں چھپی چنگاریاں فضا میں بکھرتی سی محسوس ہوئیں۔ .....(باقی آئندہ)

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

.....ہاشم ندیم ☆ قسط نمبر 9.....

اچانک وہ زور سے دھاڑا ''تو تم ہو عبداللہ..... جسے سولی چڑھنے کا شوق اس بستی تک کھینچ لایا ہے۔ ویسے ایک بات ہے، تمہاری ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی۔ جبروت کی پسند کو بھگا لے جانے کی کوشش کرنے والا یا تو کوئی دیوانہ ہو سکتا ہے یا پھر وہ، جسے خودکشی کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ سوجھا ہو۔ کب سے چل رہا ہے یہ چکر..... لڑکی کی رضامندی بھی شامل تھی تمہارے ساتھ بھاگنے میں یا تم ہی نے اسے ورغلایا تھا.....؟'' مجمعے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اتنی دور سے بھی سلطان بابا کی تسبیح کے دانے گرنے کی آواز سُن سکتا تھا۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا، ''میں اسے بھگا کر نہیں لے جا رہا تھا، لڑکی کا باپ بھی میرے ساتھ تھا اور وہ شہر جانا چاہتے تھے، کیوں کہ لڑکی کو تمہارا رشتہ منظور نہیں۔ ساری بستی یہ بات جانتی ہے۔'' میری بات سنتے ہی جبروت کے منہ سے غصے کے مارے کف بہنے لگا، اسے شاید اتنے براہِ راست جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ زور سے چلّایا ''سب بکواس ہے۔ مزار کے متولی اور مجاور کے بھیس میں تم لوگ یہ دھندے کرتے ہو۔ بردہ فروشی کے لیے یہی جگہ ملی تھی تم لوگوں کو..... میں جانتا ہوں ہماری بستی کی عورتیں بہت معصوم ہیں، ضرور اس کا باپ بھی تمہارے بہکاوے میں آ گیا ہوگا۔ بہرحال، لڑکی بھی تمہارے ساتھ جُرم میں برابر کی شریک ہے اور میری عدالت تم دونوں کو.....'' اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ سلطان بابا کی آواز گونجی ''کوئی بھی عدالت فیصلہ دینے سے پہلے مُلزم کو صفائی کا پورا موقع دیتی ہے، تو پھر یہ تمہاری کیسی عدالت ہے، جو خود ہی وکیل ہے اور خود ہی منصف.....'' جبروت چونک کر پلٹا۔ یہ آج کی دوسری ان ہونی تھی، کیوں کہ آج تک جبروت کے دربار میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ سکے۔ وہ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا ''اوہ..... چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ..... میں بھول گیا تھا کہ گروہ کا سرغنہ بھی یہیں موجود ہے۔ اتفاقاً ایک بارش کیا برس گئی۔ تم نے تو خود کو اس بستی کا مسیحا ہی سمجھ لیا۔ چلو کیا یاد کرو گے، جبروت کی عدالت تمہیں، تمہارے ساتھی کی وکالت کا موقع بھی دیتی ہے، پھر نہ کہنا، کال گڑھ میں تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔'' جبروت نے داد طلب نظروں سے مجمعے کی طرف دیکھا، جہاں کچھ بزرگ ندامت کی وجہ سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ جبروت ہجوم کی خاموشی سے چڑ سا گیا، اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ بستی کے بہت سے لوگ دل ہی دل میں اس تماشے سے خوش نہیں ہیں۔ اب یہ خود اس کی اپنی انا کا مسئلہ بھی بنتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی اگر ہمیں عبرت کی مثال نہ بناتا، تو اس کی سلطنت کے قلعے میں یہ پہلی نقب ہوتی، جو ایک کم زور اور بے بس بوڑھے کے ہاتھوں لگتی، لہٰذا اسے اپنے تیور کڑے کرنے پڑے۔ وہ زور سے چلّایا ''لیکن یاد رہے کہ اگر تم دونوں اپنی صفائی میں کچھ ثابت نہیں کر سکے، تو پھر میں تم دونوں کا وہ حال کروں گا کہ تمہاری اگلی سات نسلیں یاد رکھیں گی۔ تو بولو، کیا ثابت کرنا چاہتے ہو.....'' سارے مجمعے کی توجہ سلطان بابا کی جانب ہو گئی۔ یہ ان سب کے لیے بھی ایک انتہائی حیرت انگیز تجربہ تھا کہ انہوں نے آج تک لوگوں کو جبروت کے قدموں میں گرتے اور گڑگڑا کر زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ سلطان بابا کی تسبیح لگاتار گھوم رہی تھی، وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے ''عبداللہ کی صفائی کے لیے لڑکی اور اس کے باپ کا بیان ہی کافی ہے۔ لڑکی تم سے رشتہ نہیں کرنا چاہتی اور اپنے باپ کے ساتھ، شہر جا کر اپنے منگیتر سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ تم اُسے نہیں روک سکتے، یہ لڑکی کا حق ہے۔ اُسے شہر جانے دو۔'' جبروت نے زور کا قہقہہ لگایا ''بہت خوب! اسے کہتے ہیں مدعی سُست اور گواہ چُست۔ جس لڑکی کے حق کے لیے تم مجھے نصیحتیں کر رہے ہو، اس کا باپ تو وہاں کونے میں سر جھکائے کھڑا ہے۔ چلو کوئی تو ہے، جو جبروت کو بھی نصیحت کر سکے۔ مرنے سے پہلے کوئی اور حسرت ہو، تو وہ بھی بیان کر دو۔ کوشش کروں گا، تمہارے ہر حکم کی تعمیل ہو۔'' کارندوں نے اپنے آقا کی حسِ مزاح پر مُسکرا کر اسے داد دی۔ سلطان بابا نے جبروت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ''ہاں..... ایک خواہش اور ہے میری، اگر پوری کر سکو تو، مجھے اس بزرگ جوڑے کی نواسی سکینہ کا پتا بتا دو۔ انہیں اس عمر میں مزید دربدر اور خوار نہ کرو۔'' جبروت ہنستے ہنستے ایک دم ہی چپ ہو گیا اور اس نے اپنی قہر بھری نگاہ سلطان بابا کی اٹھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں ہجوم کی طرف دوڑائی۔ بھیڑ جبروت کی اٹھتی نگاہ سے گھبرا کر ایک دم درمیان سے یوں چھٹی، جیسے کوئی تیر کمان سے نکل کر ان کی جانب لپکا ہو۔ لوگ دونوں طرف اس طرح ہٹے، جیسے کوئی ساکت پانی میں لکیر کھینچ دے۔ لوگوں کی آخری قطار میں سکینہ کے نانا، نانی کھڑے تھے۔ پتا نہیں، وہ پہلے ہی سے اس بھیڑ کا حصہ تھے یا پھر جب سلطان بابا کو لایا جا رہا تھا، تو وہ بھی اس وقت ان کے ساتھ آ گئے۔ جبروت کی ساری زندہ دلی پل بھر ہی میں ہوا ہو گئی اور وہ شدید طیش کے عالم میں چلّایا ''بس! بہت سن لی تمہاری بکواس، تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے وعظ سن کر یہاں کے لوگ میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا ان داتا کون ہے۔'' ''نہیں، یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔ اس ساری کائنات کا ان داتا صرف ایک ہی ہے'' سلطان بابا نے آسمان کی جانب انگلی اٹھائی ''اب بھی وقت ہے، اپنے گناہوں سے تائب ہو کر معافی مانگ لو، سچی توبہ کر لو۔ اس کی رحمت تمہارے گناہوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ابھی تمہارے سانس چل رہی ہے، لہٰذا توبہ کا وقت بھی باقی ہے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا لو۔'' جبروت کے صبر کا پیمانہ اب بالکل ہی لب ریز ہو چکا تھا۔ آج تک کسی نے اس کے سامنے یوں سر اٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی، لیکن آج اسے ہماری آنکھوں سے اپنا خوف مفقود دکھائی دے رہا تھا، جب کہ اس کی حکومت کی تو اصل بنیاد ہی یہ ''خوف'' تھا۔ اس لمحے مجھ پر ایک اور عجیب سا انکشاف ہوا۔ ''خوف'' کا واسطہ دراصل ''پوشیدگی'' سے ہوتا ہے، جو چیز ظاہر اور واضح ہو جائے، وہ اپنا اصل خوف اور ڈر کھو دیتی ہے اور شاید ٹھیک اسی وقت یہی کلیہ جبروت کے ذہن کے کسی کونے میں بھی سر اٹھا رہا تھا۔ اسے سمجھ آ گیا تھا کہ مجھ سے اور سلطان بابا سے کسی قسم کی مزید بحث، اس کا خوف، اس کی رعایا کے دلوں سے مزید کم کرنے کا باعث بن سکتی ہے، لہٰذا اس نے دربار ختم کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''تمہاری تبلیغ کا وقت ختم ہوا۔ افسوس تم اپنے مُلزم کا دفاع نہیں کر سکے، لہٰذا میری عدالت اس لڑکے کو کال گڑھ کی لڑکی کو ورغلا کر بھگا لے جانے کا مجرم سمجھتی ہے، لیکن میں اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا آخری موقع ضرور دوں گا۔ کل صبح سورج نکلتے ہی عبداللہ کو صحرا میں چھوڑ دیا جائے گا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میرے چھ پالتو کتے بھی اس کے پیچھے چھوڑے جائیں گے۔ اگر مُلزم میرے شیروں کی گرفت میں آئے بغیر یہ صحرا پار کر کے اسٹیشن تک پہنچ گیا تو بے قصور سمجھا جائے گا اور باعزت بری ہوگا۔ دوسری صورت میں یہاں

موجود یہ بوڑھا بھی اپنی جان سے جائے گا۔ اگر کسی کو اس فیصلے پر اعتراض ہے تو بولے.....'' مجمعے پر سکوت طاری ہو گیا۔ پیش امام نے کچھ ہمت کی اور حلق تر کر کے بولا'' میری آپ سے درخواست ہے کہ ان دونوں پر رحم کیجیے۔ یہ اس علاقے کے نہیں ہیں۔ انہیں علاقہ بدر کر دیجیے، پر اتنی کڑی سزا نہ دیں۔ ہم سب کی یہی التجا ہے آپ سے.....'' جبروت کے ماتھے پر شکنیں بڑھ گئیں۔ پیش امام کی دیکھا دیکھی چند اور بزرگوں نے بھی جبروت کو دہائی دی اور اس کے والد اور دیگر بزرگوں سے اپنے تعلق کے واسطے دیے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو یک لخت خاموش کروا دیا'' ٹھیک ہے، کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ جبروت بے انصاف ہے۔ اگر عبداللہ اپنے جرم کا اقرار کر لے اور مجھ سے رحم کی اپیل کرے، تو میں اس کی سزا میں کمی کا سوچوں گا۔'' سارے ہجوم کی نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں۔ بھیڑ کی پچھلی قطاروں میں سے چند ایک نے اشاروں سے اپنے ہاتھ جوڑ کر آنکھوں آنکھوں میں التجا بھی کی کہ میں جبروت سے معافی مانگ کر یہ قصہ ختم کر دوں۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا'' اگر میری بے گناہی کی سند یہ صحرا دے سکتا ہے، تو میں تمہارے پاؤں پڑنے سے یہی بہتر سمجھوں گا کہ میری قسمت کا فیصلہ یہ صحرا ہی کرے.....'' بزرگوں نے سر پیٹ لیے۔ جبروت کے اشارے پر مجھے اور سلطان بابا کو وہاں سے دھکیلتے ہوئے پھر سے ان ہی غلام گردشوں کی جانب روانہ کر دیا گیا، البتہ دوسری راہ داری مڑتے ہی سلطان بابا کو مجھ سے علیحدہ کر کے، وہ کسی اور جانب لے گئے اور مجھے دائیں جانب بنی کوٹھریوں میں سے ساتویں قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

یہ کمرا بھی گزشتہ رات والے زندان کی طرح مختصر اور تنگ تھا۔ اس میں باہر کی جانب کھلنے والا کوئی روشن دان بھی نہیں تھا، البتہ اوپر کی جانب دیوار میں ایک آدھ اینٹ کی جگہ خالی رکھی گئی تھی، جو شاید ساتھ والی کوٹھری کی جانب کھلتی تھی۔ غالباً ہوا کے گزر کے لیے یہ انتظام رکھا گیا ہو، کیوں کہ اس کمرے کا دروازہ بھی سلاخوں والا نہیں تھا، لہٰذا سخت لکڑی کا بھدا سا بڑا دروازہ بند ہونے کے بعد دن میں بھی اس کوٹھری میں آدھی رات جیسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے کانوں میں بار بار کال گڑھ پہنچنے کے بعد سلطان بابا کا کہا ایک جملہ گونج رہا تھا'' یاد رکھنا، موت صرف جسم کے فنا ہو جانے کا نام ہے۔ موت کے بعد ہی اصل زندگی کی ابتدا ہوتی ہے'' تو کیا میری اس فانی جسم سے رخصتی کا وقت بھی قریب آ چکا ہے، لیکن کیا میرے ذمے اس دنیا کے جتنے فرائض تھے، میں نے وہ سب پورے کر دیے ہیں۔ کیا میری ہر تلاش کی آخری حد یہی موت تھی۔ میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک دیوار کے اوپر والے حصے میں جہاں ایک اینٹ کی درز خالی تھی، آہٹ سی بلند ہوئی اور ایک سرگوشی سی سنائی دی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا، لیکن پھر جب دوسری مرتبہ کسی نے دھیرے سے پوچھا'' کوئی ہے.....؟'' تو میں چونک کر کھڑا ہو گیا'' میں عبداللہ ہوں، تم کون ہو.....؟'' دوسری جانب سے آواز آئی'' شش..... آہستہ بولو، جبروت کے کسی کتے نے اگر تمہاری آواز سُن لی تو غضب ہو جائے گا۔ میں پانچ مہینوں سے اس قیدِ تنہائی میں پڑا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری باتوں کی آواز سن کر کوئی تمہاری کوٹھری بدل دے۔'' ترس گیا ہوں میں کسی کی آواز سننے، کسی سے بات کرنے کے لیے'' مجھے حیرت ہوئی'' لیکن تم کون ہو اور تمہیں کس جرم میں اتنی لمبی قید دی گئی ہے.....؟'' میرا نام خانو ہے۔ پانچ ماہ پہلے میں بھی جبروت کے وفادار کتوں میں شامل تھا۔ ایک ذرا سی چوک ہوئی اور اس ظالم نے مجھے یہاں لا پھنکوایا۔ سب میرے گناہوں کی سزا ہے۔ اب ساری زندگی مجھے اسی کوٹھری میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہے۔ ہم سے پہلے یہاں نہ جانے کتنے اپنی سانسیں ہار چکے ہیں۔'' اچانک دور کہیں آہٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے بولا'' کوئی آ رہا ہے، اندھیرا ہونے کے بعد بات کروں گا۔'' وہ جو کوئی بھی تھا، دیوار سے دور ہٹ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی نے خشک روٹی کے چند ٹکڑے اور عجیب سے رنگ کا شوربا ایک ٹرے میں رکھ کر دروازے کے نیچے، درز سے اندر کھسکا دیا اور زور سے ہنسا'' کھانا کھا لو جوان! کل تمہیں صحرا بھی پار کرنا ہے اور خالی ٹرے واپس کھسکا دینا۔'' پھر دوسری ٹرے سرکانے کی آواز آئی'' لے بھائی خانو، تُو بھی عیش کر، پھر نہ کہنا یاور، یاروں کا خیال نہیں رکھتا۔'' جواب میں خانو نے شاید یاور نامی بندے کو کوئی گالی دی۔ آواز مُبہم تھی، لیکن یاور کے قہقہے مجھے راہ داری کے آخر تک سنائی دیتے رہے۔ میں نے کھانے کی ٹرے واپس باہر کھسکا دی اور آنکھیں بند کر کے دیوار کے ساتھ کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی تو کچھ اجالے ہمارے اندر اتر آتے ہیں، خاص طور پر جب آس پاس ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو، سو میں بھی باہر کی تاریکی سے منہ پھیر کر، بند آنکھوں تلے اپنے اندر کے اجالوں سے باتیں کرنے لگا۔ جانے کتنے گھنٹے یوں ہی گزر گئے، پھر دوبارہ دیوار کی درز سے آواز ابھری۔'' عبداللہ، تم جاگ رہے ہو.....؟'' مجھے اس کا سوال سُن کر ہنسی آ گئی'' تو تمہارا کیا خیال ہے، میں اس آرام دہ کمرے کی مسہری پر ٹیک لگائے، اپنے غلاموں کا انتظار کرتے کرتے سو گیا ہوں؟'' دوسری جانب شاید خانو کے ہونٹوں پر بھی صدیوں بعد کوئی مسکراہٹ ابھری ہو گی۔ تب ہی وہ بولا'' زندہ دل لگتے ہو۔ یہاں کیسے آ پھنسے؟'' میں نے مختصراً اپنا جرم بتا دیا۔ خانو دوسری جانب سے زہر خند لہجے میں بولا'' تم ٹھیک سمجھے ہو۔ وہ اس سے کہیں زیادہ گرا ہوا، خطرناک اور کمینہ صفت انسان ہے۔ وہ لڑکی اب کبھی بھی اس کے چنگل سے نہیں نکل پائے گی اور اسی قلعے میں سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔ اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اس درندے کی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں۔ آج زندگی میں پہلی بار تمہارے سامنے یہ اقرار کرتے ہوئے میں خود کو بھی انتہائی گرا ہوا انسان محسوس کر رہا ہوں کہ کل تک میں خود بھی اُس کے کسی پالتو کی طرح اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا آیا ہوں۔ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے جانے ان جانے میں صرف اس کی خوشنودی پانے کی خاطر ہاتھ رنگ چکا ہوں میں اور آج شاید انہی مظلوموں میں سے کسی کی آہ نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔'' خانو نہ جانے ماضی کی کن بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز بلند ہونے سے روکی'' سنو خانو! کیا تم سکینہ نامی کسی لڑکی کو جانتے ہو۔ اُسے بھی اسے قلعے کی طرف ہی لایا گیا تھا.....؟'' میری بات سُنتے ہی دوسری جانب کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور پھر خانو کی ہیجانی سی آواز سنائی دی'' تم سکینہ کو کیسے جانتے ہو..... خدا کے لیے مجھے بتاؤ، پچھلے پانچ مہینوں سے مجھے اس لڑکی نے سونے نہیں دیا۔ جب بھی ذرا دیر کے لیے آنکھ لگتی ہے، وہ میرے خواب میں چلی آتی ہے۔ مجھے اس کی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ، تمہارا اس لڑکی سے کیا تعلق ہے۔ میں اپنے گناہوں کا تمہارے سامنے اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس درد اور خوف کے عذاب سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔'' خانو کا ہیجان اس قدر بڑھنے لگا تھا کہ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اس کی بلند ہوتی آواز آس پاس کے پہرے داروں ہی کو ہوشیار نہ کر دے۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے یہ احساس دلایا کہ ہم دونوں کہاں ہیں۔ کچھ دیر بعد خانو کا جنون کچھ کم ہوا، تو اس نے دھیرے دھیرے سکینہ کی کہانی میرے گوش گزار کرنی شروع کی، جسے سن کر خود میرے اپنے ہاتھ پاؤں بے جان سے ہوتے گئے۔

خانو نے بتایا کہ آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے رات کی گاڑی کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر معمول سے کچھ زیادہ دیر کے لیے ٹھہری تھی۔ شاید انجن فیل ہو گیا تھا۔ گرمی اور حبس سے گھبرا کر لوگ پلیٹ فارم پر اتر آئے۔ انہی میں وہ نوجوان جوڑا بھی تھا، جسے رحمان گڑھ جانا تھا۔ لڑکی شرمائی اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کی شادی کو ابھی پورا ہفتہ بھی نہیں گزرا ہو گا، کیوں کہ لڑکی کے ہاتھوں کی مہندی تک تازہ تھی اور سہاگ کا سرخ جوڑا ابھی تن پر موجود تھا، جبروت کا خاص کارندہ، اکرم اپنے دو مزید ساتھیوں کے ساتھ اس وقت پلیٹ فارم پر موجود تھا، اس کی عادت تھی کہ وہ رات کی گاڑی دیکھنے کے لیے اسٹیشن ضرور آتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی اچھا'' شکار'' ہاتھ لگ جاتا تھا اور آقا کو خوش کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا تھا۔ اس دن خانو بھی ان کے ساتھ آیا تھا۔ اسی اثناء میں پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے ان کی نظر اس جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کو شاید پیاس ستا رہی تھی اور لڑکا پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہا تھا، لیکن اس صحرائی اسٹیشن پر بھلا پانی کہاں میسر تھا۔ ٹرین کے مسافروں کے پاس جو تھوڑا بہت پانی تھا، وہ صحرا کے سفر اور پھر اس ویران پلیٹ فارم پر گاڑی کے تین گھنٹے کے اس غیر متوقع اسٹاپ نے ختم کر دیا تھا اور اس وقت سب ہی مسافر پانی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ رہی سہی کسر اس غضب کی گرمی اور

جس نے پوری کر دی تھی۔ ایسے میں اکرم کی لڑکی پر نظر پڑی اور پھر جم کر ہی رہ گئی۔ اس نے خانو اور دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ تینوں اس لڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ ٹرین کے عملے نے اعلان کر دیا کہ انجن فیل ہونے کی وجہ سے قریب ترین جنکشن سے دوسرا انجن منگوایا گیا ہے، لیکن کال گڑھ پہنچتے پہنچتے وہ انجن بھی پانچ چھ گھنٹے لے گا۔ یعنی صبح تک انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اتنے میں لڑکی کا شوہر بھی ناکام و نامراد بنا پانی کے واپس آ پہنچا۔ یہی وہ موقع تھا، جس کا انتظار وہاں کھڑا اکرم کر رہا تھا۔ اس نے فوراً میٹھے اور مؤدبانہ لہجے میں لڑکے سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے، تو ان کے ساتھ بستی تک چل کر پانی اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آئے۔ لڑکا جس کا نام رحیم بخش معلوم ہوا، کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ وہ اپنی نو بیاہتا بیوی کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے۔ اکرم نے فوراً پانسہ پھینکا کہ رحیم بخش چاہے، تو اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے لے۔ اس کے دونوں ساتھی یہیں اسٹیشن پر ٹھہر کر ان کے سامان کی حفاظت کریں گے اور رحیم بخش اپنی بیوی سمیت جیپ میں اکرم کے ساتھ جا کر ٹرین کے سب ہی مسافروں کے لیے پانی اور کچھ پھل وغیرہ لے کر واپس آ جائے گا۔ آخر کچھ پس و پیش کے بعد رحیم بخش اس بات کے لیے راضی ہو ہی گیا اور اپنی بیوی کو لے کر اکرم کے ساتھ چل پڑا۔ لڑکی کو وہ سکینہ کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، جو کافی پریشان سی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں رحیم بخش کو منع کرنے کی کوشش کی، لیکن اکرم اس دوران رحیم بخش سے اس قدر بے تکلف ہو چکا تھا کہ رحیم بخش جیسے سیدھے سادے انسان کو وہ اس وقت دنیا کا سب سے بھلا آدمی دکھائی دیا۔ ویسے بھی اکرم جیسے گھاگ شخص کے لیے اس دیہاتی لڑکے کو اپنے جال میں پھانسنا قطعی مشکل ثابت نہیں ہوا۔ خانو اور دوسرا ساتھی دکھاوے کے لیے اسٹیشن ہی پر رُک گئے اور پھر اکرم اور جوڑے کے پلیٹ فارم سے نکلتے ہی دوسرے راستے سے کال گڑھ کے لیے نکل پڑے۔ اکرم جیپ میں رحیم بخش اور سکینہ کو لیے سیدھا کال گڑھ کے قلعے پہنچ گیا اور انہیں بیرونی احاطے کے ایک مہمان خانے میں چھوڑ کر جبروت کو اپنے ''کارنامے'' کی اطلاع دینے چلا گیا۔ سکینہ اور رحیم بخش کے لیے کچھ ہی دیر میں ایک خادمہ کھانا لیے پہنچ گئی۔ رحیم کو کچھ جلدی تھی۔ اس نے خادمہ سے کہا کہ انہیں واپس پلیٹ فارم پہنچنا ہے، لہٰذا یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کیا جائے، لیکن خادمہ نے اسے بتایا کہ اکرم ٹرین کے باقی مسافروں کے لیے پانی اور کھانے وغیرہ کا انتظام کر کے جب تک آئے گا، تب تک اسے یہی حکم ہے کہ جوڑے کو کھانا کھلا دیا جائے۔ خادمہ نے کھانے کے دوران سکینہ کی پھولوں والی اوڑھنی کی بہت تعریف کی۔ سکینہ نے اسے بتایا کہ یہ چادر اس کی بوڑھی نانی نے اس بڑھاپے میں بھی خاص اپنے ہاتھوں سے سکینہ کی شادی کے لیے کاڑھی ہے۔ خادمہ نے درخواست کی کہ سکینہ جب کبھی یہاں سے دوبارہ گزرے، اس کے لیے بھی ایسی چادر ضرور بنوا لائے۔ سکینہ نے بھی وعدہ کر لیا۔ ان ہی خوش گپیوں میں رحیم بخش اور سکینہ نے کھانا کھا لیا اور خادمہ برتن لے کر واپس چلی گئی۔ اس کے بعد جب رحیم بخش کی آنکھ کھلی، تو سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ گھبرا کر جھٹکے سے کھڑا ہوا تو بستر سے گرتے گرتے بچا۔ ایک دوسرا جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ وہ اُسی خادمہ کے کمرے میں موجود تھا، جو رات اُسے کھانا دینے آئی تھی۔ رحیم نے چلا کر اس سے پوچھا کہ ''وہ یہاں تک کیسے پہنچا اور سکینہ کہاں ہے.....؟'' خادمہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی باہر کا دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ رحیم نے دروازہ کھولا تو تین چار مرد غصے میں تن تناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور آتے ہی رحیم بخش پر چڑھ دوڑے کہ وہ قلعے کی خادمہ کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ رحیم چلاتا ہی رہ گیا کہ وہ تو خود اپنی سکینہ کو تلاش کر رہا ہے، لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بات اتنی بڑھی کہ قلعے دار کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہاں اکرم اور خانو کو جبروت کے دائیں بائیں کھڑے دیکھ کر رحیم کو سارا ماجرا سمجھ آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے، لیکن اس کے ہزار چیخنے چلانے کے باوجود اس پر خادمہ کے کمرے میں زبردستی نشے کے عالم میں داخل ہونے کا الزام لگا کر صحرا پار کرنے کی سزا سنا دی گئی، البتہ اس وقت جبروت کا دربار عام نہیں تھا۔ قلعے کے اندر صرف اس کے چند خاص کارندے ہی موجود تھے۔ سکینہ کو اس رات بستی کی بیرونی سمت ایک کچے مکان میں قید رکھا گیا تھا اور جبروت کے حکم ہی پر اگلی رات اسے خانو اور اکرم اٹھا لائے تھے۔ آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ رحیم کبھی وہ صحرا پار نہیں کر سکا۔ سکینہ اس رات جبروت کی خواب گاہ پہنچا دی گئی، لیکن تب بھی وہ ایک زندہ لاش ہی تھی اور جب صبح اسے باہر نکالا گیا، تب وہ اس سانس لینے کے تکلف سے بھی آزاد ہو چکی تھی۔ کچھ نے کہا کہ وہ خود ہی پھندا لے کر اس ذلت بھری زندگی سے منہ موڑ گئی اور کچھ نے اسے بھی جبروت کے قاتل پنجوں کے دباؤ کا شاخسانہ قرار دیا۔ بہر حال، سکینہ مر گئی..... خانو چپ ہو کر ہانپنے لگ گیا اور میرے زمین و آسمان ایک ہونے لگے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے صرف سکینہ ہی نہیں مری، کال گڑھ کے ہر گھر میں موت نے ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ تب ہی اس بستی میں مجھے ہر پل ماتم کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ کہتے ہیں، کچھ خون ایسے ہوتے ہیں، جنہیں زمین کا دامن بھی خود میں سمیٹنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ خانو زور زور سے رو رہا تھا ''جس دن سے سکینہ مری ہے، میں ایک لمحہ بھی چین سے جی نہیں پایا۔ مجھے یوں لگتا ہے، وہ ہر پل میرے آس پاس پھرتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے کہ ''مجھے کیوں مار دیا۔ ابھی تو میں نے جینا بھی نہیں سیکھا تھا۔ ابھی تو شادی کا پراندہ بھی میرے بالوں سے نہیں کھلا تھا۔ ابھی تو مجھے تتلیاں پکڑنی تھیں۔ جگنوؤں کے پیچھے بھاگنا تھا۔ ابھی تو مجھے اپنے رحیم بخش کے ساتھ رنگوں کی پہچان کرنی تھی۔ ابھی تو میری کئی خواہشیں باقی تھیں۔ پھر تم نے ان کا گلا کیوں گھونٹ دیا۔'' خانو نہ جانے کیا کیا بولتا رہا اور میرا چہرہ نمکین پانی سے جلنے لگا۔ جانے وہ میری کون تھی۔ مجھے ہی اس کی شبیہہ اس کی موت کے بعد کیوں دکھائی دی؟ کیا واقعی آواز کی لہروں کی طرح ہماری تصویریں بھی خلا کی کسی تہہ میں ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتی ہیں۔ جس طرح لوگ اپنی موت کے بعد بھی خوابوں میں زندہ نظر آتے ہیں، کیا میں بھی کسی ایسے ہی خواب کا شکار ہوا تھا؟ کیا یہ صحرا مجھے بھی کوئی سچا خواب دکھا رہا تھا۔ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا۔ میں روتے ہوئے خانو کو دو بول تسلی کے بھی نہ کہہ سکا، پھر اچانک جیسے وہ خود ہی ہوش میں آ گیا۔ ''سنو عبداللہ..... مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں نے ساری زندگی کوئی نیک کام نہیں کیا اور شاید میرا آخری وقت بھی اب کچھ زیادہ دور نہیں، لیکن جاتے جاتے میں ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہوں۔ کل صبح جس صحرا سے تمہارا مقابلہ ہوگا، وہ اس سے پہلے نہ جانے کتنے معصوموں کا لہو پی چکا ہے، لیکن اگر تم میری چند باتیں دھیان سے ذہن نشین کر لو، تو تم اس صحرا اور جبروت کے درندہ نما کتوں کو شکست دے سکتے ہو۔ تمہیں صحرا میں جس سمت دوڑنے کو کہا جائے گا، بہ ظاہر اس سے یہی تاثر ملے گا کہ اگر تم سیدھ میں دوڑتے رہے تو ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے اور تمہاری جاں بخشی ہو جائے گی، یہ درست نہیں۔ اوّل تو یہ خوں خوار صحرا ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع اسٹیشن تک پہنچنا ہی ناکام بنا دیتا ہے، لیکن بالفرض کوئی خوش قسمت اسٹیشن تک پہنچ بھی جائے، تو وہاں اسے اکرم اپنا انتظار کرتا ہوا ملے گا، لہٰذا تم پندرہ منٹ تک لگاتار بھاگنے کے بعد ساتویں بڑے ٹیلے سے دائیں جانب کو مُڑ جانا، کتے تمہاری بو پر اسی جانب پلٹیں گے، لیکن تب مقابلہ برابر کا ہوگا، کیوں کہ ان کے لیے بھی تمہاری طرح یہ علاقہ بالکل نیا ہوگا، وہاں سے ٹھیک سات میل کے فاصلے پر سرحد کی جانب سے آتی ایک نیم پختہ سڑک گزرتی ہے۔ اگر تم سڑک تک پہنچ گئے، تو سمجھو کہ آدھی جنگ تم جیت گئے، کیوں کہ سڑک پر مشرق کی طرف دوڑتے رہنے سے یا تو تمہیں فوج کی کوئی چوکی مل جائے گی یا پھر کیکڑا.....'' میں نے حیرت سے دُہرایا ''کیکڑا.....؟'' ''ہاں، صحرا میں مال برداری اور مسافروں کے لیے سرحد کی طرف سے جو کھلے ٹرک نما عجیب ہیئت کی گاڑی چلتی ہے، اسے لوگ یہاں کیکڑا کہتے ہیں۔ یہ سواری تمہیں کسی بھی سرحدی بستی تک پہنچا دے گی، جہاں سے تم اپنی مرضی کی جائے پناہ تک پہنچ سکتے ہو، لیکن یاد رکھنا..... تمہیں مستقل بھاگتے رہنا ہوگا۔ پچھلے دنوں یہاں بارش ہوئی تھی۔ اگر قسمت نے تمہارا ساتھ دیا، تو شاید راستے میں تمہیں کوئی برساتی جوہڑ مل جائے، لیکن ہوشیار رہنا، دو گھونٹ سے زیادہ پانی پینے کی کوشش کی تو وہیں گر جاؤ گے۔ صرف ہونٹ تر کر کے آگے بڑھ جانا۔ اس شدید پیاس میں پانی بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہوگا اور تمہارا دل بند کر دے گا۔ ایک اور ضروری بات، کوشش کرنا کہ صحرا میں دوڑتے وقت سانس منہ کے بجائے ناک سے لو اور سورج کو براہِ راست دیکھنے سے مکمل گریز کرنا۔ جوتے اتار کر نیفے میں اڑس لینا، پھینکنا نہیں۔ پاؤں شروع میں گرم ریت میں جھلسیں گے، لیکن تلوؤں کی جلد پوری طرح جل جانے کے بعد احساس ختم ہو جائے گا۔ پانی میسر آتے ہی کوئی رومال وغیرہ اچھی طرح بھگو کر سر پر باندھ لینا، اور میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بھاگتے رہنا۔ یہ تین ساڑھے تین گھنٹے تمہیں اپنی زندگی کی دوڑ، دوڑتے ہوئے ہی جیتنی ہے۔ اگر گناہ گاروں کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں، تو میں آج زندگی میں پہلی اور آخری دعا مانگتا ہوں کہ خدا تمہیں اس امتحان میں کام یاب کرے.....'' خانو کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی۔

صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ مجھے رہ رہ کر سکینہ کے بوڑھے نانا نانی کا دھیان ستا رہا تھا۔ اچھا ہی ہے کہ میں دوبارہ ان کا سامنا کرنے سے پہلے ہی صحرا کی ریت میں خاک ہو جاؤں، ورنہ میں انہیں کیسے بتا پاتا کہ ان کی لاڈلی سکینہ بھی اب مٹی کا حصہ بن چکی ہے۔ میں نے خانو سے آخری سوال پوچھا ''کیا تمہیں سکینہ کی قبر کا کچھ اتا پتا معلوم ہے۔ اس کے ورثاء کو اور کچھ نہیں، تو اس کی لحد کا نظارہ ہی نصیب ہو جائے، تو شاید ان بدنصیبوں کو کچھ قرار مل سکے.....'' خانو کچھ سوچ میں پڑ گیا ''یہاں کم ہی خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں، جنہیں باقاعدہ کوئی قبر نصیب ہوتی ہے۔ ٹھہرو مجھے سوچنے دو۔ سکینہ کو تو شاید اسی احاطے میں دفنایا گیا تھا۔'' ''کیا.....؟'' لفظ تھے کہ انگارے..... میری سانسیں رکنے لگیں ''اسی احاطے میں دفنایا تھا۔ ٹھیک سے یاد کرو، کہاں، یہ بہت ضروری ہے خانو.....'' خانو نے اپنا سر پیٹا ''ارے ہاں..... یہی تو جگہ تھی۔ اسی برآمدے میں دائیں جانب سے ساتویں کوٹھری تھی۔ ہاں ہاں، ساتویں کوٹھری میں اسے دفنایا تھا ہم نے۔'' خانو کی بات سنتے ہی میں چکرا کر اپنی جگہ ڈھے سا گیا۔ زمین کی گردش رک گئی۔ آسمان پلٹ گیا اور زمین اوندھی ہو گئی۔ مجھے جس کوٹھری میں قید کیا گیا تھا، اس کا نمبر داہنی طرف سے ساتواں ہی تھا۔ سکینہ اسی زمین کے نیچے دفن تھی، جہاں میں اس وقت اپنا شکستہ وجود لیے بیٹھا تھا۔

(باقی آئندہ)

اس وقت ایک بوند پانی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی، اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

.....☆ہاشم ندیم☆.....

سورج نکلنے تک میں وہیں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے پاؤں آخری ممکن حد تک سکیڑ کر گھٹنے اپنے سینے کے ساتھ اس وقت تک جوڑے رکھے، جب تک مجھے لینے والے وہاں پہنچ نہیں گئے۔ میں اس مظلوم لڑکی کے لیے اور تو کچھ نہ کر پایا، لیکن اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ اس کے مدفن پر اپنے پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھوں۔ باہر آہٹیں بلند ہوئیں، تو میں نے خانو کو الوداع کہا۔ ''میں جا رہا ہوں دوست، اگر تم یہاں سے زندہ نکلنے میں کام یاب ہو گئے، تو اتنا ضرور یاد رکھنا کہ کفارے کی آس تو آخری سانس تک رہتی ہے۔'' میری بات پوری ہونے سے قبل ہی پہرے دار آ پہنچے، خانو کی آخری آواز، جو میرے کانوں تک پہنچی، وہ ''رب راکھا'' تھی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے جیپ میں دھکا کر بستی کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ پوری بستی کے مرد وہاں موجود تھے، جبروت کے کارندے اور محافظ بھی اسلحہ سنبھالے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ سلطان بابا کو بھی وہاں لے آئے۔ اب شاید صرف جبروت اور اس کے کتوں کا انتظار باقی تھا۔ سلطان بابا میری جانب بڑھے، پہرے داروں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انہوں نے تسبیح ختم کی اور مجھ پر پھونک دیا۔ ''جب تک ہماری ایک بھی سانس باقی ہے، موت، زندگی کی خود سب سے بڑی محافظ ہوتی ہے، یہ دنیا صرف ابتداء ہے۔ انتہا کا سفر اس جسم سے پرے شروع ہوتا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔'' میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، ورنہ میں انہیں آگے بڑھ کر گلے لگا لیتا۔ مجھے اپنے اس آخری سفر سے پہلے اس زادِ راہ کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے شاید میری آنکھوں کی تحریر پڑھ لی اور خود ہی بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا، ''جیتے رہو۔'' ان کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والی اس دعا کی اہمیت آج مجھ سے زیادہ بھلا اور کسے محسوس ہوئی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں جبروت اپنی مخصوص جیپ میں اپنے لاڈلے کتوں سمیت دُور صحرا سے نمودار ہوتا نظر آیا۔ ریت سے اٹھتی گرم لہروں کے پس منظر میں اس کی جیپ شفاف پانی میں تیرتی نظر آ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ جبروت ایک بہت بڑا شعبدہ باز ہے۔ وہ ایسے کھیل صرف اپنی تفریحِ طبع کے لیے کھیلتا ہے، پھر چاہے وہ رحیم اور سکینہ کا معاملہ ہو یا نوری اور عبداللہ کا قصہ۔ دونوں جگہ وہ پوری طرح مختار تھا کہ بنا کسی محبت کے بھی، مجھے اور رحیم کو وہیں صحرا میں ختم کروا سکتا تھا، بغیر کسی عدالت اور فیصلے کے ڈھونگ کے بھی وہ ہماری جان لے سکتا تھا۔ یہاں اُسے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اگر آس پاس کے علاقے کی پولیس اور قانون خاموش تھا، تو ضرور اس کے پیچھے بھی اس کا اثر و رسوخ شامل ہو گا۔ کال گڑھ تو ایک جنگل تھا اور اس جنگل میں صرف جبروت نامی بادشاہ کا قانون چلتا تھا۔ جانے ان نسلوں سے غلام چلے آتے لوگوں کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کے شہری ہیں یا نہیں۔ غلامی زنجیروں میں بندھے رہنے ہی کا نام نہیں ہوتا۔ غلامی تو ایک خاص رویّے کا نام ہے، جو ذہنوں کو مسخر کر لینے سے وابستہ ہے اور جبروت کو پتا تھا کہ ذہنوں کو مسخر کیسے کیا جاتا ہے۔ روحوں کا تو پتا نہیں، پر جسموں کو تسخیر کرنے کے لیے وہ خوف کے ہتھیار کا استعمال کرتا تھا۔ اُسے لوگوں کو حیران اور خوف زدہ کر کے مزہ آتا تھا۔ یہ سارا تماشا اس نے اپنے جنون کی سیرابی کے لیے ہی لگا رکھا تھا۔ دو تین سال پہلے میں اور میرا دوست کاشف، لندن گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گئے تھے تو ہمیں پکاڈلی کے علاقے میں ایک عجیب کلب کے بارے میں پتا چلا تھا۔ وہاں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو خود کو سانپوں سے ڈسواتے ہوئے دیکھا۔ وہاں لوگ اسے ایڈرنالین رَش (Adernaline Rush) کا کھیل کہتے تھے۔ ہمارے جسم میں موجود ایک مادّے (ہارمون) کے بہنے کا تعلق شدید خوف سے ہوتا ہے، مغرب میں جہاں لوگ ہر قسم کے تعیّش اور تجربے سے گزر چکے ہیں، ان کے لیے زندگی ایک بے کیف سا معمول بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے میں کچھ من چلے اپنے جسم میں خون کی روانی بحال رکھنے کے لیے عجیب و غریب قسم کے مشاغل اختیار کر لیتے ہیں۔ کوئی بہت بلندی سے چھلانگ لگا لیتا ہے، کچھ سانس بند کرنے کی کوشش میں جان سے جاتے ہیں، کچھ ریوالور کے ایک چیمبر میں گولی رکھ کر ٹریگر دبانے کا کھیل کھیلتے ہیں اور کچھ وائٹ گولڈ (ہیروئن کی ایک نئی قسم) کے سفوف کو اپنے نتھنوں کے ذریعے، اس طرح دماغ کے خلیوں تک پہنچاتے ہیں کہ پھر وہ سدا کے لیے کسی اور جہاں کے باسی بن جاتے ہیں، لیکن اس ایڈرنالین رَش کا یہ جان لیوا نشہ باقی تمام نشوں کا سرتاج بن جاتا ہے۔ وہ خود کو موت کے منہ میں دھکیل کر اس قضا کو پل پل اپنی رگوں میں اُترتا ہوا محسوس کرنے میں ایسی سدا بہار لذّت پاتے ہیں، جو انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتی ہے۔ جبروت بھی ایسے ہی کسی نشے کا شکار اور رسیا تھا۔ یہ بات مجھے اُسی دن محسوس کر لینی چاہیے تھی، جب میں نے اسے ریچھ سے اپنے کتے لڑاتے اور خون کے چھینٹے اڑتے دیکھ کر ہیجانی انداز میں خوشی مناتے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹھیک ایسی ہی خوشی، وہ اس وقت بھی محسوس کرتا ہوگا، جب اس کے پالتو شکاری صحرا میں اپنے شکار کی تِکا بوٹی کر کے اس کے خون آلود کپڑے اپنے جبڑوں میں دبائے واپس اپنے آقا کے پاس دوڑے چلے آتے ہیں۔ مغرب ایسے جنونیوں کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے، جو صرف ہیجان کی خاطر قاتل بنے اور پھر کبھی جیک دی رپر کبھی فرینکنسٹائن اور کبھی فریڈی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ٹھیک اُسی طرح اس وقت میرے سامنے جیپ سے اُتر کر اپنے کتوں کو والہانہ پیار کرنے والا یہ جنونی شخص بھی کسی ایسی ہی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا، جسے خود کو جابر سے جبروت بنانے میں جانے کتنے سال لگے ہوں گے۔ کہتے ہیں، نام بھی ہماری شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ تو میں اپنے سامنے ہی دیکھ رہا تھا۔ جبروت اپنے کتوں کو پیار کر کے میری طرف بڑھا۔ ''ہاں تو تم تیار ہو، مقابلے کے لیے۔ اب بھی وقت ہے، اگر تم اپنے جُرم کا اقرار کر لو اور مجھ سے معافی مانگ لو تو تمہاری سزا میں کمی کی جا سکتی ہے، مولوی جی.....'' جبروت کی آنکھوں میں صرف اور صرف تضحیک تھی۔ میں نے چند لمحے اس کی جانب غور سے دیکھا۔ ''اگر میں نے تم سے معافی مانگ لی، تو تمہارا یہ کھیل ادھورا رہ جائے گا، پھر شاید میں نہیں، تو کوئی اور اس جنون کی بھینٹ چڑھ جائے گا، کیوں کہ تمہیں تو بہر حال یہ خونی تماشا کرنا ہی ہے، کیوں کہ صرف اسی صورت تمہارے اندر بھڑکتی یہ لہو کی پیاس، شاید کچھ دِنوں کے لیے بُجھ پائے گی۔ ہو سکے تو آج یہاں سے فراغت پانے کے بعد شہر کے کسی بڑے ماہرِ نفسیات سے مِل لینا۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔'' وہ کچھ دیر میری جانب عجیب سے انداز میں دیکھتا رہا، پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یا تو تم واقعی بہادر ہو یا پھر موت کو اتنے قریب پا کر یہ خوف خود تمہارے ذہن سے مِٹ گیا ہے۔ مجھے بھی روتے گڑگڑاتے اور پیروں میں پڑتے دشمن اچھے نہیں لگتے، لہٰذا میں انہیں بھی مارتا تو ضرور ہوں، لیکن عزت کی موت نہیں۔ تم نے البتہ آج اپنے لیے ایک باوقار موت چُنی ہے۔ اطمینان رکھو، تمہاری موت کے بعد بھی کال گڑھ میں تمہارا نام غیرت مند دشمنوں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔'' جبروت اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ہجوم اور سلطان بابا پر الوداعی نظر ڈالی اور صحرا میں دوڑ شروع کرنے کے نشان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مجھے غرّاتے، گھورتے اور اپنے خوں خوار جبڑوں سے رال ٹپکاتے قد آور کتوں کے بے حد قریب سے گزارا گیا، تاکہ وہ

میرے جسم کی بُو کو اپنے دماغ کے خلیوں میں اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ جس وقت میں ان چھ کتوں کے قریب سے اپنا جسم، اُن کے جبڑوں سے مَس کرتے ہوئے گزر رہا تھا، میری رگوں میں ایک عجیب سی جھنجھناہٹ پیدا ہو رہی تھی، شاید میرے اندر بھی اُسی ایڈرنالین نامی ہارمون کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا، جس کی لذت پانے کے لیے جبروت تپتی ہوئی دھوپ میں کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میری اور اس کی کیفیت میں فرق صرف اتنا تھا کہ میری کیفیت میرا متوقع خون بہنے کی وجہ سے تھی، جب کہ جبروت کا اینڈرنالین دُوسروں کا خون بہتے دیکھ کر اس کے اندر دوڑتا تھا۔ اُس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا ''اب سے ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ان کتوں کے پٹے کھول دیے جائیں گے۔ تم یہاں سے ٹھیک اپنی سیدھ میں دوڑو گے تو ایک گھنٹے بعد ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے۔ بس، شرط صرف اتنی ہے کہ میرے یہ پالتو شیر اس سے پہلے تم تک نہ پہنچ جائیں۔ اور ہاں بے فکر رہو۔ یہ سدھائے ہوئے ہیں، لہٰذا یہ اسٹیشن کی عمارت دیکھتے ہی دُور سے پلٹ جائیں گے۔ تو کہو، تم تیار ہو؟'' میں نے سر ہلا کر ''ہاں'' کہا اور جبروت کا اشارہ پاتے ہی صحرا میں دوڑ لگا دی۔

پہلے دو تین منٹ تو مجھے کچھ احساس ہی نہیں ہوا، لیکن جیسے ہی میں نے پہلا ٹیلا پار کر کے خانو کی ہدایت کے مطابق اپنے جُوتے اتارے، ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا، جیسے ہزاروں ننھے مُنّے انگارے میرے تلوؤں سے ہوتے ہوئے، خُون کے اندر سرایت کر گئے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے دن ہی میں تارے نظر آ گئے اور میں نے بے اختیار اپنی ہتھیلیوں سے اپنے تلوؤں کو یکے بعد دیگرے اس آگ کی تپش سے بچانے کی کوشش کی، لیکن میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ میں یہ سب کچھ کر پاتا۔ میرے ذہن میں بار بار خانو کا ایک جملہ گونج رہا تھا ''یاد رکھنا، تمہیں ہر حال میں بس دوڑتے ہی رہنا ہے۔'' میں نے شدید تکلیف سے کراہتے ہوئے مجبوراً اس آگ کے سمندر میں دوبارہ پاؤں ڈال دیے۔ صحرا کے پہلے پانچ منٹ ہی نے میرا وہ حال کر دیا تھا، جو کسی ایسے خستہ حال شخص کا ہو سکتا تھا، جو اس تپتے ریگ زار میں برسوں سے بھٹک رہا ہو۔ میرے ہونٹ خشک ہو کر چٹخنے لگے۔ سانس دُھونکنی کی طرح چلنے، حلق میں ہزاروں کانٹے چُبھنے لگے۔ بے اختیار میں نے منہ سے سانس لینے کی کوشش کی، تاکہ حلق میں لگی آگ کو کچھ ٹھنڈک ملے، لیکن پہلے ہی سانس میں اڑتی ریت کے بگولے سے ہزاروں ذرّے کسی خاردار تار کی طرح میرے گلے سے ہوتے ہوئے، سانس کی نالی میں اٹک گئے اور مجھے زوردار کھانسی کا پھندا لگا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ خانو کی آواز پھر ذہن کے کسی گوشے سے ٹکرائی ''منہ سے سانس لینے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔'' میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

پانچواں ٹیلہ پار کرتے ہی میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پاؤں کے تلوؤں میں پہلے منٹ میں جُوتے اتارتے ہی جو چھالے بنے تھے، وہ ایک ایک کر کے پھٹنے لگے اور مجھے ہر چھالا پھٹنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے میرے پیروں پر ہزاروں نشتر لگا کر مجھے ان کُھلے زخموں کے ساتھ، نمک کے سمندر پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہو اور وہ نمک میرے کُھلے منہ والے زخموں سے خون میں مِل کر اسے جلا رہا ہو، کھولا رہا ہو۔ اس تُرش نمک کی کڑواہٹ مجھے اپنے حلق میں، سارے جسم میں دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ دسویں منٹ کے ختم ہوتے ہی، وہ تپتے جہنم جیسا صحرا میرے ساتھ کھیل کھیلنے لگا۔ مجھے اپنے سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹھاٹیں مارتا ایک وسیع سمندر دکھائی دیا۔ ارے اتنا بہت سا پانی۔ میں اپنی سمت بھول کر اس جانب لپکا۔ میرے اندر بیٹھا خانو چلّایا ''براہِ راست سورج کو نہ دیکھنا.....'' لیکن کچھ لمحے پہلے ہی میری نظر اس قہر برساتے گولے پر غیر اختیاری طور پر پڑ چکی تھی۔ یہ سامنے بہتا سمندر اور شفاف لہریں، اسی سورج کی جھلستی کرنوں سے ملی میری نظر کا شاخسانہ تھیں۔ مجھے زور کا ایک چکر آیا اور میں اپنی ہی جھونک میں لڑھکتے ہوئے ٹیلے سے نیچے جا گرا۔ میری آنکھوں میں ریت پڑ گئی اور کچھ دیر کے لیے میں اندھا سا ہو گیا۔ اچانک دُور کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ میری ساری حسیں جیسے ایک ساتھ ہی بیدار ہو گئیں۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ جبروت نے اپنے کتے میرے تعاقب میں کھول دیے ہیں۔ اگر مجھے یہاں یہ آواز سنائی دے رہی تھی، تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میں اتنی دیر تک دوڑنے کے باوجود ابھی آغاز کے مقام سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ سامنے ہی میری جلتی آنکھوں نے ساتویں ٹیلے کے آثار دیکھے اور میرے شدید تھکے، ٹوٹے اور شکستہ جسم نے ایک اور کوشش کی۔ اچانک میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ خانو نے کیا کہا تھا۔ ساتویں ٹیلے سے دائیں یا بائیں.....؟ شاید دائیں.....؟ نہیں نہیں، بائیں جانب، لیکن.....شاید دائیں.....؟ میں سرپٹ دوڑ تو رہا تھا، لیکن میرا ذہن جیسے سُن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ساتواں ٹیلہ ریت کی ایک ڈھیری سے بڑا ہوتے ہوتے ایک چھوٹی پہاڑی میں تبدیل ہوتا گیا اور پھر جیسے ہی میں دوڑتے ہوئے اس کے اوپر چڑھا، تو میرے ذہن نے میکانکی انداز میں فیصلہ دے دیا۔ دائیں جانب.....اور میں مشینی انداز میں داہنی طرف مُڑ گیا۔ شدید پیاس سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا، بس ایک بُوند پانی اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی، پھر چاہے مجھے موت ہی کیوں نہ آ جائے۔ اچانک میری نظر دور صحرا میں چمکتے ایک سکّے پر پڑی، جو دھوپ کی کرنوں میں جگمگا رہا تھا، لیکن یہ طلائی سکّہ، یہاں.....؟ اور پھر وہ جگمگاتا سکّہ بڑا ہوتا گیا۔ ارے.....یہ تو لوہے کی ایک بڑی سی پرات تھی۔ کہیں، اوہ میرے خدا، یہ تو چھوٹا سا جوہڑ تھا۔ بارش کے پانی سے بنا ایک چھوٹا سا جوہڑ، جو ایک بڑے ٹیلے کی آڑ میں عمودی رخ پر اس طرح بنا تھا کہ دھوپ براہِ راست وہاں نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ کیا دعائیں اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ کیا اس صحرا سے عرشِ بریں کچھ زیادہ ہی قریب تھا یا پھر میرا آخری وقت قریب آ رہا تھا کہ فرشتوں نے میرے حساب کتاب کے بستے سمیٹتے سمیٹتے میری آخری دعائیں بھی سمیٹنی شروع کر دی تھیں؟ میں کسی دیوانے کی طرح دوڑتے ہوئے جوہڑ کے قریب پہنچا اور میرا شدید جی چاہا کہ اپنا سر اُس گدلے پانی میں ڈال کر وہیں پڑ جاؤں۔ اس وقت وہ چھوٹا سا جوہڑ کیا، میں پورا دریا بھی ایک ہی گھونٹ میں پی جانا چاہتا تھا۔ ''خبردار.....گھونٹ بھر پینے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ دل بند ہو جائے گا۔'' میں نے سر جھٹکا ''نہیں، اب اور کوئی نصیحت نہیں۔ اس شدید پیاس کے عالم میں مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں دو گھونٹ پی کر ہی مر جاؤں۔'' اُس وقت مجھے ادراک ہوا کہ لوگ مرنے سے پہلے پانی کیوں مانگتے ہیں۔ میری نسوں میں بہتا خون گاڑھا ہو کر میرے اندر موجود پانی کا آخری قطرہ تک چُوس چکا تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے کنپٹی پر پھڑکتی میری نس اس زور سے پھٹے گی کہ سارے صحرا کو لال کر جائے گی۔ میں نے جلدی سے ہتھیلیوں میں پانی بھرا اور خانو پھر چھم سے کود کر میرے سامنے کسی کے بندھے ہاتھوں کی صورت آن کھڑا ہوا ''نہیں عبداللہ، نہیں، یہ پانی نہیں موت ہے۔'' دفعتاً میری ہتھیلی میں کوئی مُوٹی سوئی زور سے گڑ گئی۔ تکلیف سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا، جن کے کٹورے میں ابھی تک جوہڑ سے نکالا گیا پانی ٹپک ٹپک کر گر رہا تھا۔ ایک لمبی اور موٹی سی کالی جونک میری ہتھیلی کی جلد میں ماس تک اپنے نوکیلے دانت گاڑ چکی تھی اور ایک دوسری جونک چلتی ہوئی میری کلائی کے قریب خُون چُوسنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے گھبرا کر پانی پھینک دیا۔ کلائی والی جونک تو پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہی گر گئی، لیکن ہتھیلی والی سرمئی جونک، میرے سیاہ مقدر کی طرح میرے گوشت سے چپکی ہی رہی۔ درد، جلن اور چبھن کی ایک کٹیلی لہر میری انگلیوں کی پوروں سے ہوتی ہوئی، پورے بازو میں پھیل گئی۔ میرا ہاتھ نیلا پڑنے لگا اور میں نے بے اختیار شدید تکلیف کے عالم میں اپنا ہاتھ گرم جلتی ریت میں گھونپ دیا۔ جُونک کی نازک اور لجلجی سی چمکیلی جلد سے شدید تپتی ریت ٹکرائی، تو ہلکی سی ایسی آواز بلند ہوئی، جیسے جلتے ہوئے انگاروں پر کوئی پانی کا چھینٹا مار دے۔ جونک تڑپ کر اُچھلی اور اس کا نوکیلا ڈنک میری ہتھیلی سے نکل گیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی جیب سے رومال نکال کر پانی میں بھگویا اور اُسے اپنے خشک چٹختے ہونٹوں سے لگا لیا۔ میرے ہونٹوں کی جلی ہوئی جلد کو ذرا سی نمی میسّر آئی، تو اِن کی حالت مزید خراب ہو گئی اور خُون کی پتلی سی چند لکیریں رومال کی سطح پر ابھر آئیں۔ دوسری مرتبہ بھیگا رومال میں نے چہرے پر پھیرا اور تیسری مرتبہ اسے بھگو کر، اپنے سر پر باندھ ہی رہا تھا کہ مجھے میری قضا کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہاں.....یہ وہی بھونکتے کتوں کے دوڑنے اور غرّانے کی آواز تھی۔ مطلب وہ قریب تر ہو رہے تھے، میں اُٹھ کر بھاگا۔ فی الحال وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے اور مجھے ایک گمان یہ بھی تھا کہ ساتویں ٹیلے کے بعد اگر وہ اپنی جھونک میں مزید کچھ آگے بڑھ گئے، تو انہیں پلٹنے میں دو چار منٹ مزید لگیں گے، کیوں کہ اس وقت صحرا میں چلتی گرم لُو کا رُخ بھی اسی سمت تھا، جس طرف میں دوڑ رہا تھا، لہٰذا ان تک میرے جسم کی بُو پہنچتے پہنچتے بھی کچھ وقت ضرور لگے گا، لیکن اب خود میری اپنی رُوح دھیرے دھیرے میرے اندر سے سرکنا شروع ہو چکی تھی۔ اگر میں پچھلے چھ مہینوں سے سلطان بابا کے ساتھ اتنا پیدل نہ چلا ہوتا اور میں نے جبل پور کے بسیرے کے دوران پہاڑی والی درگاہ کے دشوار راستے روزانہ کئی بار طے نہ کیے ہوتے، تو میں یقیناً بہت پہلے ہی گر چکا ہوتا، کیوں کہ کالج اور یونیورسٹی میں اسپورٹس کے بعد صرف ایک گھنٹہ روزانہ اسکواش کا کھیل ہی میری واحد ورزش رہ گیا تھا اور آج اس صحرا نے مجھے ''دوڑ'' کا اصل مطلب سمجھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں، میں نے ریت کے بگولوں کے عقب سے اُس پہلے عفریت کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میرا شک صحیح تھا۔ ساتویں ٹیلے کے بعد وہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے تھے اور یہ پہلا تھا، جس نے میری بُو پائی تھی۔ میرے قدم تیز ہو گئے، لیکن اس کی غرّاہٹیں بتدریج قریب آنے لگیں۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میری اُلجھی سانسیں خود ایک غرّاہٹ میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے اندر بھی تو ایک درندہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اُن آخری لمحات میں میرے اندر کا درندہ بھی بیدار ہو گیا۔ اب میں عبداللہ یا ساحر نہیں.....صرف ایک انسان باقی رہ گیا تھا، جسے اپنی جان بچانے کے لیے ایک خُونی عفریت کا سامنا تھا۔ پتھر کے دور کے انسان کی تمام جبلتیں ایک دم ہی میرے اندر

انگڑائی لے کر جاگ چکی تھیں اور اب دوڑتے ہوئے میری نظر چاروں جانب کچھ ایسا تلاش کر رہی تھیں، جسے میں اپنے دفاع کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ غرّاہٹیں اب بالکل میرے قریب پہنچ گئی تھیں۔ ساتھ ہی ریت پر دوڑنے کی دھمک اور دھپ دھپ کی آوازیں، میرے حواس معطل کیے دے رہی تھیں۔ میرا دشمن بہترین سدھائے ہوئے شکاری کی طرح بنا بھونکے اور حتی الامکان آواز نکالے بغیر میرے تعاقب میں تھا۔ اچانک ریت میں دبی ایک خشک ٹہنی نما لکڑی پر میری نظر پڑی اور میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا اور یہی میری غلطی تھی۔ لکڑی اندر تک ریت میں پھنسی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ چھلنے کے باوجود وہ پوری طرح باہر نہیں نکلی، لیکن اسی اثناء میں پہلا دشمن میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میری نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے دوڑتے ہوئے بنا رُکے مجھ پر زقند بھری اور ٹھیک اُسی لمحے وہ لکڑی ریت سے نکل آئی، جسے میں وحشیانہ انداز میں طاقت لگا کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے غیر اختیاری طور پر وہ خشک لکڑی پوری قوت سے فضا میں لہرائی اور پتا نہیں کتے کو وہ چھڑی کتنی زور سے لگی کہ اس کے منہ سے ایک سسکی کی آواز نکلی۔ میں ایک جانب اور وہ دوسری جانب جا گرا، لیکن اس نے پلٹ کر جھپٹنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا، لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی، لہٰذا اب مجھے اپنے شکستہ بازوؤں ہی پر بھروسا کرنا تھا، لیکن وہ بھاری بھرکم وجود اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سینے پر گرا، تو میرے ہاتھ جیسے ٹوٹ ہی تو گئے۔ اس کے خونی پنجے میرے شانوں میں یوں پیوست ہوئے کہ کئی خراشوں میں مرچیں بھر گئیں۔ اس کی غرّاہٹیں اور گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہی تھیں اور تھوتھنی سے بہتی رال کا دھارا عین میری بائیں آنکھ کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کے کھلے جبڑوں کے چاروں کونوں سے جھانکتے، وہ چار لمبے نوکیلے دانت عین میری شہ رگ میں گڑ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نظر ملی، وہ جھنجھلایا ہوا تھا، اسے میری مزاحمت بُری لگ رہی تھی۔ اس کی نظر نے میری نظر سے کہا ''زیادہ مت تڑپو..... اپنی جان مجھے سونپ دو، میرا مالک انتظار کرتا ہوگا.....'' میرے اندر کا درندہ غرّایا۔ ''نہیں، اتنی آسانی سے نہیں.....'' اچانک ہی مجھے اس بے بس ریچھ کے پینترے یاد آ گئے۔ وہ ریچھ اس طرح کے کئی عفریتوں سے ایک موٹی زنجیر سے بندھے ہونے کے باوجود آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ پوری لڑائی کے دوران مستقل اپنا سر ہلا ہلا کر اپنے نرخرے کو ان کتوں کے جبڑوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب ان سدھائے ہوئے کتوں کا پہلا نشانہ مقابلہ کی شہ رگ ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اس وقت میرے سینے پر بیٹھا میری رگ جان میں اپنے دانت گاڑھنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ میرے حواس یکے بعد دیگرے پھر سے جامد ہونے لگے تھے۔ اصل میں مجھے اس وقت، اس کتے کے وجود سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی، بلکہ اس کی مستقل غرّاہٹ اور سانس کی خرخراہٹ میرے حواس معطل کیے جا رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ اگر کتے کی آواز سے یہ وحشیانہ صفت نکال دی جائے تو شاید اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ ہمارے ہاتھوں پیروں میں سے آدھی جان نکالنے کے لیے وہ سب سے پہلے اسی ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ شاید یہی اثر سانپ کی پھنکار اور کسی بھی درندے کی دھاڑ میں بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اب تک اس کے چہرے کو اس کا گلا دبا کر، اپنے چہرے سے دور رکھنے میں کام یاب تھا، لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کام یابی عارضی ہے، کیوں کہ میرے بازو شل ہو رہے تھے اور اس کے پنجے میرے سارے جسم پر جلتی خراشیں چھوڑے جا رہے تھے۔ اچانک میری مٹھی میں کچھ ریت بھر گئی اور بے اختیار میں نے ساری کی ساری ریت اس کی قاتل آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چیخا اور ایک لمحے کے لیے اس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں نے پوری قوت لگا کر اسے اپنے اوپر سے اچھال کر دور پھینک دیا۔ میرا کُرتا چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً اسے جسم سے علیحدہ کیا اور بچے کھچے کپڑے کو بھاگتے ہوئے اپنے گلے کے گرد اچھی طرح کس کر باندھ لیا۔ اس کا شکار میری شہ رگ تھی، تو مجھے سب سے پہلے اسے ہی بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی، تب تک میرا دشمن اپنا جسم جھٹک کر اپنی آنکھوں سے ریت جھاڑ چکا تھا اور پھر سے میرے پیچھے لپکنے کی تیاری میں تھا۔ اسی اثناء میں پچھلے ٹیلے کی جانب سے اس کے گروہ کے دو اور ساتھی نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے خوشی سے وحشیانہ آوازیں بلند کیں۔

میرے آخری لمحے شروع ہو چکے تھے۔ میری پوری کوشش کے باوجود میری رفتار مدھم پڑ چکی تھی اور قدم ریت میں دھنسنا شروع ہو گئے تھے۔ میرے تین طرف سے وہ تین کتے، میری جسم کو تین حصّوں میں تقسیم کرنے کے لیے اُڑے چلے آ رہے تھے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے سلطان بابا نظر آئے ''موت صرف جسم کا مقدر اور رُوح کی زندگی کی ابتدا ہے۔'' موت کے بارے میں ہم سب ہی ساری زندگی سوچتے ہیں، سُنتے ہیں اور بات کرتے ہیں، لیکن ٹھیک اسی لمحے میں، میں نے خود پر موت کو وارد ہوتے محسوس کیا، ''اچھا تو یہ ہے وہ فسانہ، جس کا سارے شہر میں چرچا تھا۔'' اچانک مجھے سانول کی بانسری سنائی دی۔ وہ دُور سے ہاتھ ہلا ہلا کر مسکراتے ہوئے، مجھے بُلا رہا تھا، نہیں..... سانول کی بانسری نہیں..... یہ تو اس پیانو کی آواز تھی، جو پاپا ہمیں بچپن میں روزانہ ڈنر کے بعد میری اور مما کی فرمائش پر سُناتے تھے۔ مما اور پپا سفید ملبوسات میں اُسی بڑے سے کالے پیانو کے پاس کھڑے مجھ سے کہہ رہے تھے، ''بس کرو ساحر، اب گھر واپس آ بھی جاؤ۔ کتنا انتظار کرواتے ہو تم۔'' کچھ ہی دیر میں اُسی پیانو کے سامنے زہرہ سیاہ لباس میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ''ساحر کیا میری ہر محبت ہمیشہ یونہی تشنہ رہے گی؟'' میں نے گھبرا کر دوسری جانب دیکھا تو کاشف اور میرے باقی سارے دوست کالج میوزک شو کی تیاری کے لیے ڈرم اور گٹار بجا رہے تھے۔ کاشف چلّایا ''اوئے ساحر کے بچے! آج پھر پریکٹس پر نہیں آئے تم۔'' نہیں یہ کالج کا ڈرم تو نہیں تھا، یہ تو وہی ڈھول تھا، جو جبروت کے ہرکارے ریچھ اور کتوں کی لڑائی کے دوران پیٹ رہے تھے۔ کتے..... ہاں..... میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں..... میں ریت پر اوندھے مُنہ گرا ہوا تھا، تینوں کتے میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے کراہ کر کروٹ بدلی۔ سورج کی آگ برساتی کرنوں کا زوردار چانٹا میرے گالوں کو جھلسا گیا۔ ڈوبتی آنکھوں سے میں نے تین طرف سے بڑھتی موت کو گلے لگانے کے لیے سورج کو آخری الوداع کہا، لیکن یہ کیا.....؟ کتے میرے قریب آ کر رک سے گئے۔ کیا وہ مجھ سے میری آخری خواہش پوچھ رہے تھے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے سر کی پچھلی جانب بھی کچھ غرّاہٹیں بلند ہوئی ہیں۔ مطلب یہ کہ باقی تین کتے بھی آن پہنچے تھے، لیکن اس وقت میرے اندر اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھ لیتا۔ سامنے والے تین دشمنوں میں سے ایک نے غرّا کر اپنا جسم تولا۔ اس کی ہڈیاں زقند لگانے سے پہلے جسم کے اندر چٹخیں۔ اس نے اپنا سارا بوجھ اپنے پچھلے پیروں پر ڈالا اور ہوا میں میری جانب اُچھلا۔ میں نے آسمان پر پگھلتے سورج کو اُس کے وجود کے پیچھے پیچھے چھپتے دیکھا۔ مجھ پر دشمن کے قہر کا سایا ہوا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گرتا، ایک عجیب بات ہوئی۔ ابھی دشمن کا جسم ہوا ہی میں معلق تھا کہ ایک اور جسم زوردار چنگھاڑ کے ساتھ غرّاتے ہوئے دشمن کے جسم سے لپٹا، ٹکرایا اور اُسے اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے مجھ سے دُور لے جا کر ریت پر گر گیا۔ چند لمحوں کے لیے چھپا سورج پھر سے میری پلکوں میں بَرچھیاں گھونپ گیا اور میری آنکھیں پھر سے چُندھیا گئیں۔ غرّاہٹیں اب باقاعدہ چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ میں نے بمشکل پلٹ کر کروٹ لی اور حتیٰ الامکان سر اٹھا کر اپنے اس مُحسن جسم کو دیکھنے کی کوشش کی، جس نے ہوا ہی سے میری جانب اُڑ کر آتی قضا کو اُچک لیا تھا اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دشمن کو ہوا ہی میں دبوچ لینے والا ''کالا'' تھا۔ وہ اور اس کے گروہ کے باقی دو ساتھی سینہ تانے میرے اور میرے تین دشمنوں کے درمیان صحرا میں کھڑے تھے۔ اس وقت دونوں گروہ ایک دوسرے کو نظروں نظروں میں تول رہے تھے، غرّا رہے تھے، دھمکا رہے تھے۔ میں کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا، اس وقت میں کالے اور دشمنوں کے گروہ کے درمیان ہوتی گفتگو سمجھ سکتا ہوں۔ دشمنوں کا سرغنہ بولا ''تم ہمارے پرانے ساتھی رہے ہو، اس لیے ہم تمہارا لحاظ کر رہے ہیں۔ ہٹ جاؤ، ہمارے راستے سے..... ہمیں اس کی شہ رگ چیر کر اپنے آقا کے پاس لے جانی ہے۔ وہی آقا، جو کل تک تمہارا بھی مالک تھا۔'' کالا جواباً غرّایا ''نہیں..... وہ کبھی میرا مالک تھا، لیکن اب یہ بھی میرا دوست ہے۔ میں تم کو اس کی جان نہیں لینے دوں گا۔ تم لوگ واپس پلٹ جاؤ.....'' سرغنہ بھونکا۔ ''بس بہت ہو چکا..... کچھ ہی دیر میں میرے تین مزید ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پرائے انسان کے چکر میں ہمارا اپنا پُرانا ساتھی اپنی جان سے جائے۔ ہم نے بہت سے مقابلے ساتھ جیتے ہیں۔ نہ جانے کتنی جنگیں ایک ساتھ لڑی ہیں۔ اپنی یہ آخری جنگ ہمارے خلاف نہ لڑو۔ یہ انسان بڑے کم ظرف اور احسان فراموش ہوتے ہیں۔ اِن کے لیے اپنے ساتھ، اپنے اِن دو بے وقوف ساتھیوں کی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ یہ تو ہماری طرح سدھائے ہوئے ہیں، نہ ہی لڑنا جانتے ہیں ہٹ جاؤ.....'' کالے نے جسم تولا..... ''اگر یہ آخری جنگ ہے تو میں اپنی یہ آخری لڑائی ایک غدّار اور احسان فراموش بن کر نہیں..... بلکہ ایک دوست بن کر لڑوں گا''۔ اتنے میں دُور سے باقی تین کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سرغنہ نے فاتحانہ انداز میں کالے کی جانب دیکھا ''اچھا تو پھر ٹھیک ہے..... مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ.....''

(باقی آئندہ)

.....ہاشم ندیم.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

اس جنگ میں اپنے ساتھ مزید تین ساتھیوں کو پا کر میرے اندر زندگی کی نئی رمق جاگی۔ باقی تین دشمن ابھی کچھ فاصلے پر تھے، لیکن صحرا میں ان کے وحشیانہ انداز میں بھونکنے کی آوازیں بتدریج قریب آ رہی تھیں۔ سامنے والے تین دشمنوں نے پینترا بدل کر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی، لیکن کالا اور اس کے گروہ کے باقی دو جانباز اب میرے اور ان دشمنوں کے درمیان حائل تھے۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی دشمن تین سے چھ ہوئے، تب شاید میرے یہ تین وفادار بھی کچھ نہ کر پائیں، کیوں کہ ان میں سے صرف کالا ہی باقاعدہ سدھایا ہوا تھا اور وہی اس خونیں لڑائی کے گُر جانتا تھا، بہتر یہی تھا کہ ان تین دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا کر میدانِ جنگ تبدیل کیا جاتا رہے اور پھر مجھے تو ہر حال میں آگے ہی بڑھتے رہنا تھا۔ سو، میں ایک بار پھر ہمت مجتمع کر کے اٹھا اور دشمنوں سے پہلو بچاتے ہوئے صحرا میں سڑک کی سمت دوڑنے لگا۔ دشمنوں کے سرغنہ کو کالے نے کچھ دیر الجھائے رکھا، پھر دشمن کو بھی سمجھ آ گئی کہ کالے اور اس کے ساتھیوں سے بھڑنے کی صورت میں ان کا اصل شکار ہاتھ سے نکل جائے گا، لہٰذا وہ بھی لڑائی چھوڑ کر کچھ وقفے سے میرے پیچھے لپکے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ سب سے آگے میں، میرے پیچھے پہلے تین دشمنوں کا گروہ، ان کے پیچھے کالا اور ساتھی اور سب سے آخر میں نئے تین تازہ دم دشمن..... یہ زندگی و موت کی دوڑ اب دھیرے دھیرے میری روح کے ریشے ادھیڑ رہی تھی۔ شدید ترین تھکے ہوئے انسان کی روح شاید سانس بند ہونے سے نہیں، بلکہ تیز تر چلتی سانسوں کے ذریعے ہی جسم سے نکلتی ہے۔ اچانک میرے پیروں کے نیچے زمین سخت ہوتی گئی اور پھر میرے منہ سے ایک طویل کراہ نما چیخ نکل گئی۔ میرے ننگے پیر میں ہاتھ کی انگلی جتنا ایک کانٹا اس طرح گھسا کہ تلوے کو چیرتا ہوا اوپر سے نکل گیا۔ میں اسی قدم لڑکھڑا کر گرا اور پاؤں جیسے شل سے ہو گئے۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کیں اور کانٹے کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر پاؤں سے علیحدہ کر دیا۔ اچانک میرا دھیان نیفے میں اٹکے اپنے جوتوں کی جانب گیا، جو میں نے شروع ہی میں خانو کی ہدایت کے مطابق اپنے جسم کے ساتھ کس کر باندھ لیے تھے۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے۔ زمین سخت ہو رہی تھی، جس کا مطلب تھا کہ اب سڑک کہیں قریب ہی تھی۔ کتوں کی آوازیں بھی پچھلے ٹیلے تک آ پہنچی تھیں اور پھر پہلے تین کا دشمن گروہ، میرے سر پر آن پہنچا۔ اس بار سرغنہ نے پیچھے سے میری گردن میں جبڑے سے وار کیا، لیکن میرے گلے میں بندھی قمیص کے چیتھڑوں کی وجہ سے اس کے دانت ماس میں ٹھیک طرح سے کھب نہیں پائے، لیکن میں اس کے دھکے سے اپنی جھونک میں سامنے جا گرا، تب تک میرے ساتھی بھی پہنچ چکے تھے۔ کالے کا ایک ساتھی، جو میری پہرے داری کے لیے میرے سر کی جانب کھڑا ہو گیا تھا، اسے سرغنہ نے ایک زوردار پنجہ مارا اور خون کے چھینٹے میرے چہرے کو بھگو گئے۔ کالا بھی نہایت بے جگری سے لڑ رہا تھا، لیکن اب دشمنوں کی تعداد چھ ہو چکی تھی۔ میں جب دوڑتے ہوئے آخری ٹیلے پر پہنچا، تو بہت دور کالی تارکول کی سڑک کسی باریک دھاگے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں نے ٹیلے کے دوسری جانب اترتے ہوئے آخری مرتبہ پیچھے نظر ڈالی، تو کالے سے میری نظر ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا، جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہوں ''ہم نے اپنا نمک حلال کر دیا دوست! اب آگے تم جانو اور تمہاری قسمت.....'' لیکن سارا رونا ہی تو اس مقدر کا تھا، تارکول کا باریک دھاگا دھیرے دھیرے چوڑا ہو رہا تھا، لیکن میرے پیچھے تین عفریت اب بھی اسی رفتار اور جوش سے دوڑے چلے آ رہے تھے، ان میں سے ایک کے نرخرے سے لگاتار خون بہہ رہا تھا۔ دفعتاً وہ لڑکھڑایا اور وہیں صحرا میں گر کر تڑپنے لگا۔ خود میری حالت بھی اس بسمل جیسی تھی، جسے زندہ جلتے انگاروں کے اوپر سیخ میں پرو دیا گیا ہو۔ اب مجھ میں ایک قدم بھی مزید دوڑنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی، لیکن دشمن تھا کہ میری جان بخشنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ اچانک میرے پیروں کے نیچے کسی نرم اور لجلجی سطح کا احساس ہوا اور میرے جوتے چپکنے سے لگے۔ ارے یہ تو وہی سڑک تھی، جسے میں اب بھی بہت دور دیکھ رہا تھا۔ یہ سڑک صحرا کے اندر سے ہوتی گزر رہی تھی اور اس کے جس ٹکڑے کی طرف میں بھاگ رہا تھا، وہ اسی سڑک کا تسلسل تھی، لیکن یہ ٹکڑا ریت کے طوفان کی وجہ سے شاید نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ میرے جوتے اسی سڑک کی گرمی اور دھوپ سے پگھلے تارکول کی وجہ سے چپک رہے تھے۔ خانو کی آواز پھر سے میرے کانوں میں گونجی۔ ''اگر تم اس سڑک تک پہنچنے میں کام یاب ہو گئے، تو سمجھو کہ تم نے آدھی جنگ جیت لی۔'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، دونوں دشمن کف بہاتے، رال ٹپکاتے اور اپنے مضبوط پنجوں سے بھاگتے، اسی رفتار سے میرے تعاقب میں آ رہے تھے، بلکہ یہ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میرے پھیپھڑوں کی بچی کھچی سانسیں بھی تیزی سے ختم ہو رہی تھیں، ویسے بھی اس ایک زندگی کے لیے ان پھیپھڑوں کے تمام خلیوں کو جس قدر مشقت سرانجام دینی تھی، پچھلے دو گھنٹوں میں وہ اس سے کہیں زیادہ محنت کر چکے تھے۔ اچانک بے خیالی میں میری نظر آسمان کی جانب اٹھ گئی۔ شاید وہ میری آخری دعا کا وقت تھا، پتا نہیں ہم ہمیشہ دعا کرتے وقت ہر بار اپنی نظر آسمان کی جانب کیوں اٹھاتے ہیں، اپنے دل کی جانب کیوں نہیں دیکھتے، کیا یہ بھی ہمارے کمزور ایمان کی نشانی نہیں ہے۔ کیا وہ صرف آسمان ہی پر بسیرا کرتا ہے۔ میری اس آخری اٹھی نظر نے بھی اسی لمحے مجھے میری ''بے ایمانی'' کی سزا دے دی۔ میرا سر سورج کی تیز روشنی دیکھ کر زور سے چکرایا اور جب تک میری نظر پلٹ کر زمین کی طرف آئی، میری آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں کسی مدہوش مے نوش کی طرح لڑکھڑایا اور اگلے ہی لمحے نرم، لجلجی سڑک پر چاروں خانے چت پڑا تھا، میری کہنیاں اور گھٹنے چھل کر سیاہ ہو چکے تھے۔ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ جسم کا ایک ایک ریشہ اس قدر شدید تھکن سے چُور تھا کہ اب مجھے دوڑتی، غراتی، رال ٹپکاتی اور اپنی طرف بڑھتی ہوئی وہ موت بھی ایک لمبے اور آرام دہ سکون کا ایک وقفہ ہی لگ رہی تھی۔ ہم زندگی بھر اس بے وفا زندگی کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے دیتے ہیں، ایذا دیتے ہیں، لیکن ہمارا آخری حاصل یہی موت ہوتی ہے۔ صحرا میں آج اس دو گھنٹے کی دوڑ اور اس لمحے میری طرف بڑھتی موت نے زندگی کا سارا فلسفہ خوب اچھی طرح مجھے سکھا دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اپنی طرح کے ان سب انسانوں کو، جو اس زندگی کی دوڑ میں خود اپنے آپ کو، اپنے رشتوں کو اور جیو اور جینے دو کے اصولوں کو بھول چکے ہیں، ایک بار صحرا کی اس دوڑ میں لا کھڑا کروں اور جب وہ بھی میری طرح نڈھال ہو کر گر پڑیں، موت اپنے خونیں جبڑے ان کی شہ رگ میں پیوست کرنے لگے، تو ان سے بس ایک ہی سوال پوچھوں، ''کیا یہ بے وفا زندگی واقعی اس قابل تھی، جس قدر تم نے اسے پیار دیا؟'' میرے دشمن بس اب چند گز ہی دور تھے، میں

نے ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں سے ان میں سے اگلے والے کو مجھے یوں زمین پر بے بس گرا دیکھ کر خوشی سے ہُو کتے ہوتے ہوئے سنا، انہیں بھی تو عرصے بعد کوئی ایسا دشمن میسر آیا تھا، جس نے آج ان کے مساموں سے بھی پسینہ چھلکا دیا تھا۔ آخری لمحے میں، میں نے اس کے خونیں جبڑے کو ایک خاص زاویے پر کھلتے اور اس کے چار لمبے نوکیلے دانتوں کو خاص میکانزم کے تحت آگے نکلتے ہوئے دیکھا، ظاہر ہے کہ اس قاتل جبلت کا خاص نشانہ میری شہہ رگ ہی تھی، میرے دل نے کہا ''خوش آمدید'' اور ٹھیک اسی لمحے فضا میں فائر کی ایک آواز گونجی، دشمن کی اپنی شہہ رگ سے خون کا ایک فوارہ چھوٹا اور مجھ سمیت سڑک کے ابلتے تارکول کو رنگ گیا۔ زمین پر خون گرنے سے ایسی آواز ابھری، جیسے شدید گرم اور تپتے ہوئے توے پر کوئی ٹھنڈا پانی چھڑک دے۔ فضا میں ایک نعرہ گونجا ''اللہ اکبر'' اور دوسرے فائر کی آواز آئی۔ مجھ پر چھلانگ لگانے والا پہلا دشمن، بالکل میرے مقابل گرا ہوا تھا اور اس کی گردن سے بہتے خون کی دھار، ہم دونوں کے چہروں کے درمیان ایک چھوٹے سے سرخ جوہڑ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میری طرح اس کی سانسیں بھی تیز، لیکن اکھڑی ہوئی تھیں اور ہم دونوں کی اس الجھی سانس کے بہاؤ سے سڑک پر پڑی ریت اور دھول اڑ اڑ کر ہمارے چہروں کو خاک کر رہی تھی۔ دشمن کی نبض بھی ڈوب رہی تھی اور آنکھیں میری طرح پلکوں کے بوجھ سے بوجھل ہو کر بند ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نظر آپس میں ٹکرائی، مجھے لگا، جیسے اس نے مجھ سے کہا ہو ''الوداع اے دشمن! تم نے بھی خوب دشمنی نبھائی۔'' لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھے اور پھر دشمن کی آنکھیں بھی میری آنکھوں کے ساتھ ہی بند ہو گئیں، آخری چند لمحوں میں مجھے اس کی آنکھوں میں وہی معصومیت دکھائی دی، جو کسی بچے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ واقعی خدا ہمیں اس دنیا میں شفاف اور معصوم ہی بھیجتا ہے، مگر ہم رفتہ رفتہ خود کو میلا اور داغ دار کرتے جاتے ہیں۔ نفرت، غیبت، جھوٹ، حسد، برائی اور بے وفائی کے داغ ہماری روح اور جسم سیاہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم خود کتنا ظلم کرتے ہیں اپنی اس روح پر، اپنے جسم پر، کبھی معاشرے کے دھارے میں بہہ کر اور کبھی تو صرف اوروں کی دیکھا دیکھی، ہم اپنے نفس کے غلام بنتے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ تو پھر بھی جسم کے گناہ روزانہ وضو کر کے اور روح کے گناہ رات کو سوتے وقت توبہ کر کے دھونے کی کام یاب یا ناکام سعی کر ہی لیتے ہیں، لیکن ان میں سے وہ، جو میری طرح ان تمام داغوں سمیت ہی دنیا سے رخصت ہونے کو ہوں، انہیں ان آخری لمحوں میں کیسا محسوس ہوتا ہوگا؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف یہی داغ سمیٹنے کے لیے بھیجا جاتا ہے؟ کیا سزا اور جزا کا فیصلہ صرف ان داغوں کی گنتی کم یا زیادہ ہونے ہی پر منحصر ہوگا؟ ''نہ اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے.....'' مجھے اس سڑک پر پڑے ان آخری لمحوں میں ایک عجیب سا ادراک ہوا کہ ہم میں سے زمین پر بسنے والے ہر ذی روح کا سفر بس ''معصوم سے معصومیت'' تک واپسی کی ایک کہانی ہی ہے۔ میں یونیورسٹی میں اپنی انگریزی کی پروفیسر مارتھا سے ایک اصطلاح ہمیشہ سنتا تھا ''Back to the innocense'' لیکن ''معصومیت کی طرف واپسی'' کی اس اصطلاح کا مطلب مجھے اس روز سمجھ میں آیا، ہم کامل معصوم پیدا ہوتے ہیں، لیکن گناہ ہمیں غیر معصوم اور عاصی بنا دیتے ہیں۔ دراصل مذہب ہم پر وارد ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ ہمیں پھر سے معصوم بنا دے اور تمام عمر مذہب کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ ہماری اس ''معصومیت سے معصومیت تک'' کی واپسی کی راہ کو ہموار کر دے۔ دراصل اس دنیا کا سارا کھیل اور بکھیڑا ہی معصومیت کی طرف واپسی کا ہے۔ اسی لیے بڑھاپے کو ''دوسرے بچپن'' کا نام دیا جاتا ہے اور شاید ٹھیک موت کی گھڑی میں چند لمحوں کے لیے ہم سب پھر سے معصوم ہو جاتے ہیں۔ تب ہی ہماری کول روح کو تحلیل ہونے کا موقع ملتا ہے، ورنہ گناہوں سے لتھڑے اس کثیف جسم کے پنجرے سے اس نورانی ہیولے کا نکلنا ناممکن ہو جاتا۔ روح جس معصوم وجود میں داخل ہوتی ہے، اسی معصوم وجود کی شفاف حالت ہی میں ہمارے جسم کو چھوڑتی ہوگی۔ کیا میری روح بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ میرا جسم تو ابھی گناہوں کے بوجھ سے آزاد نہیں ہوا تھا، ابھی اتنا ہی کثیف تھا، جتنی بوجھل میری پلکیں تھیں، تب ہی تو آنکھیں کھلنے میں اتنی ہی دیر لگی۔ میرے سر پر سبز آسمان تھا، کیا وہاں فلک کا رنگ بدل جاتا ہے؟ اچانک میرے کانوں میں آواز گونجی ''اٹھ گیا بھئی جوانا، شاباشے'' میں نے چونک کر داہنی طرف آواز کی جانب دیکھا، رینجرز کا ایک سپاہی اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ اوہ..... تو میں زندہ تھا اور جسے میں سبز آسمان سمجھ رہا تھا، وہ پیراشوٹ کے کپڑے سے بنے ہرے خیمے کی چھت تھی۔ میرے ذہن میں خانو کا آخری جملہ گونجا ''اگر یہ سڑک تمہیں سرحد پر بنی کسی فوجی چوکی تک پہنچا دے، تو سمجھ لینا کہ یہی تمہاری جیت ہے۔'' میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے پورے جسم میں شدید درد کی ایک ٹیس اٹھی، سپاہی جلدی سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ ''اوئے آرام سے جوان آرام سے، پورے چھ گھنٹے بعد تم ہوش میں آئے ہو۔ میرا نام حوالدار شیر محمد ہے۔ ہم چھ سپاہی ہیں، اس چوکی کی دن کی ڈیوٹی پر..... میں ہی شفٹ انچارج ہوں اور اس وقت میں ہی چوکی سے باہر کھڑا علاقے کا جائزہ لے رہا تھا، جب میں نے دور سے پہلے تمہیں اور پھر تمہارے پیچھے ان کتوں کو دوڑتے دیکھا۔ واہ بھئی..... عجب دوڑ تھی وہ بھی..... اور جب تک میں بھاگ کر اندر خیمے سے اپنی بندوق لے کر آیا، تم زمین پر گر چکے تھے، ٹھیک لمحے پر اپنی بندوق اور اپنا نشانہ آزمانے کو ملا۔ خدا نے سرخرو کیا، ورنہ مجھے بندوق پر لگے دوربینی نشانے پر کبھی بھروسا نہیں رہا، لیکن مجبوری تھی، کیوں کہ فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ بہر حال میں نے اللہ کو یاد کیا اور گولی چلا دی۔ مجھے تمہارے اور اس کتے کے تیزی سے قریب آتے سروں میں سے کتے کے سر کو علیحدہ رکھ کر گولی چلانی تھی اور یقین کرو کہ ایک لمحے کے لیے بھی اگر میری انگلی کانپ جاتی، تو مجھے وزیرے کی ماں سے بہت صلواتیں سننی پڑتیں۔'' حوالدار زور سے ہنسا ''وزیرا، وزیر محمد میرا پانچ سال کا بیٹا ہے.....'' میں نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ ''مجھے کہیں بہت جلدی پہنچنا ہے۔'' ''وہ تو تمہاری دیوانہ وار دوڑ ہی سے پتا چل رہا تھا۔ ویسے تو میں نے قریب یونٹ سے ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا۔ وہ دو گھنٹے پہلے آ کر تمہیں ضروری انجیکشن وغیرہ لگا چکا ہے اور تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر گیا ہے، لیکن اس نے جاتے جاتے یہ بھی کہا ہے کہ تم ایک ہفتے تک بستر سے اٹھنے کی کوشش بھی نہ کرنا..... ویسے یہ ماجرا کیا تھا.....؟'' میں نے جلدی جلدی شیر محمد کو ضروری تفصیل بتائی کہ میرے لیے ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہے۔ شیر محمد حیرت سے منہ کھولے میری بات سنتا رہا اور پھر بات ختم ہوتے ہی اس کی زبان سے جبروت کے لیے ایک موٹی سی گالی نکل گئی۔ ''اوئے..... پر، تم اکیلے واپس وہاں پہنچ کر بھی کیا کرو گے جوان..... وہاں تو پھر اس کی پوری فوج بیٹھی ہوگی، تمہارے استقبال کے لیے..... بلکہ شاید اب کتوں کے واپس نہ لوٹنے کی وجہ سے وہ ان کی تلاش میں صحرا کی خاک چھاننے کے لیے باہر بھی نکل آئے ہوں۔'' حوالدار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آئی جی نصیر صاحب کا خیال آیا۔ کمال آباد اگرچہ یہاں سے تین دن ٹرین کے فاصلے پر تھا، لیکن ان کے حکم پر کسی قریبی ضلع کی پولیس میری مدد کو کال گڑھ آ سکتی تھی۔ میں نے جلدی سے شیر محمد سے پوچھا ''کیا میں یہاں سے کمال آباد ایک فون کر سکتا ہوں۔'' ''ہاں جی! کیوں نہیں، ایک کیا دس فون کرو۔'' اس نے خیمے میں رکھے ایک پرانی وضع کے لوہے کے ڈبے کو اٹھا کر دو تین مرتبہ اس کی چرخی گھمائی۔ دوسری جانب سے شاید کسی آپریٹر نے اٹھایا۔ شیر محمد نے مجھ سے کمال آباد کا نمبر پوچھا، میں نے اسے بتایا کہ مجھے نمبر تو زبانی یاد نہیں ہے، لیکن کمال آباد میں آئی جی نصیر کا کوئی بھی نمبر ملا دیں۔ آخر کار پانچویں کوشش پر دوسری جانب سے گھر کے نمبر پر پہلے کسی آپریٹر نے فون اٹھایا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سلطان بابا کے حوالے سے عبداللہ بات کر رہا ہوں اور مجھے نصیر صاحب سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ کچھ دیر بعد دوسری جانب سے نصیر صاحب کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی، وہ شاید آرام کر رہے تھے۔ وہ تعارف کروانے سے پہلے ہی مجھے پہچان چکے تھے اور جب میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی، تو ان کے لہجے میں فکر مندی کے ساتھ ساتھ روایتی پولیس

والوں کی تیزی بھی در آئی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر قریب ترین ضلع کے ایس پی اپنی تمام تر مہیا کمک کے ساتھ کال گڑھ کے لیے نکل چکے ہوں گے اور جب تک میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچوں گا، تب تک وہ بھی مجھے وہیں میرا انتظار کرتے ملیں گے۔ انہوں نے سختی سے مجھے منع کیا کہ میں تنہا دوبارہ کال گڑھ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کروں۔ جب میں نصیر صاحب سے بات کر کے خیمے سے باہر نکلا، تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ باہر کچھ فاصلے پر میرے دونوں دشمنوں کی لاشوں کو دو سپاہی ایک گہرا گڑھا کھود کر دفنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حوالدار نے اپنے انچارج کپتان صاحب سے شفٹ ختم ہونے کے بعد مجھے اپنی جیپ میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچانے کی اجازت لے لی تھی۔ جیپ روانہ ہونے سے پہلے دو سپاہی کود کر پچھلی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے، شیر محمد خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم اسی تارکول کی سڑک سے ہوتے ہوئے واپس صحرا کی جانب روانہ ہو گئے۔ سورج کی تپش ابھی باقی تھی اور جب جیپ نے صحرا کی طرف موڑ کاٹا، تو مجھے جبروت کے جانبازوں میں سے وہ تیسرا بھی ایک جانب پڑا دکھائی دیا، جو میرے تعاقب میں سڑک تک پہنچ کر جان ہار گیا تھا۔ شیر محمد نے اسے غور سے دیکھا، لیکن کچھ کہے بنا، جیپ آگے بڑھا دی۔ کچھ گھنٹے قبل ہی قاتل صحرا میری سانسیں گھونٹنے کے لیے کسی اور انداز میں مجھ پر کھلا تھا اور ابھی اس وقت اس جیپ میں گزرتے ہوئے یہ سب کچھ کتنا مختلف اور کتنا مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے دوڑتے دوڑتے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ جیپ ریت کے ٹیلوں سے اترتی چڑھتی کال گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھی اور پھر ایک ٹیلہ اترتے ہی میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”روکو..... جیپ روکو.....“ حوالدار نے چونک کر جلدی سے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ میں تیزی سے کود کر ٹیلے کی پچھلی جانب دوڑا اور پھر میرے قدم ریت ہی میں دھنس کر رہ گئے۔ شیر محمد اور سپاہی بھی میرے پیچھے ہی بھاگے چلے آئے اور پھر ان کی نگاہوں نے بھی میری نظروں کے تعاقب میں وہ نظارا دیکھ لیا۔ سامنے ہی کالا اپنے دو ساتھیوں سمیت بے جان پڑا تھا اور چند قدموں کے فاصلے پر اِدھر اُدھر تین دشمنوں کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ میں دوڑتا ہوا کالے کے پاس پہنچا۔ میرے دوست نے زندگی کی بازی ہارنے سے پہلے شدید جدوجہد کی تھی۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھے بیٹھے رو پڑا۔ حوالدار حیرت سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ حیرت انگیز نظارا نہیں دیکھا جوان..... صاف لگ رہا ہے کہ یہ تین کتے اس دوسری خاص نسل کے تین کتوں سے شدید لڑائی کے بعد ہارے تو ضرور ہیں، لیکن جاتے جاتے وہ اپنے ساتھ تینوں کو بھی لے گئے ہیں..... کیا یہ تین تمہارے محافظ تھے۔“ میری آواز بمشکل نکلی ”نہیں۔ یہ تین میرے دوست تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کے لیے اپنی جان دی ہے۔“ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر روؤں۔ حوالدار میری حالت سمجھ چکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور خود بھی جیپ کے پیچھے سے ترپال کے نیچے رکھے بیلچوں میں سے ایک اٹھا لایا اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک گہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ میں نے کالے کو الوداعی سلامی پیش کی اور انہوں نے میرے تینوں دوستوں کو منوں ریت تلے دبا دیا۔ میں نے شیر محمد کی جانب دیکھا۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں جوان! تم اپنے دشمنوں کو بھی یوں پڑا رہنے نہیں دو گے۔ یہی بڑے دشمن کی نشانی ہوتی ہے۔“ کچھ ہی دیر میں اتنے ہی گہرے گڑھے میں میرے تینوں دشمن بھی ریت نشین ہو چکے تھے۔ وہ میرے دشمن تھے، لیکن وفادار تھے۔ میں نے حوالدار سے سڑک کے قریب پڑے جسم کو بھی واپسی پر دفنانے کی درخواست کی۔ اس نے جیپ آگے بڑھاتے ہوئے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر مجھے بے فکر رہنے کا کہا۔

جب ہم کال گڑھ کی سرحد سے کچھ فاصلے پر تھے، تو میں نے ایک جیپ کے ہیولے کو تیزی سے واپس پلٹتے دیکھا، لیکن شام کے جھٹپٹے اور فاصلے کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے گاڑی پہچان نہیں سکا۔ حوالدار کا خدشہ صحیح تھا۔ کتوں کے واپس نہ پہنچنے پر جبروت کے ہرکارے صحرا میں ان کی تلاش میں نکل آئے تھے۔ انہوں نے پہلے اسٹیشن تک کا سارا راستہ چھان مارا ہوگا، لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں ساتویں ٹیلے سے دائیں جانب مڑ چکا ہوں گا اور اتنے وسیع صحرا میں جہاں ریت ہر پل قدموں کے نشان مٹا رہی ہو، صرف اندازے پر کسی کی تلاش انتہائی مشکل کام تھا، تب ہی انہیں اتنا وقت لگا تھا۔ جب ہم کال گڑھ کی بیرونی حد تک پہنچے، تب تک اندھیرا چھا چکا تھا اور دور سے پولیس کی جیپوں اور ایک بڑے ٹرک کی جلتی بجھتی بتیاں قریب آتی نظر آ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد پولیس کے جوانوں کا ایک جمِ غفیر ایک ایس پی اور ڈی ایس پی کی قیادت میں وہاں آ پہنچا۔ افسروں نے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ آئی جی صاحب کی خاص ہدایت پر یہاں پہنچے ہیں۔ شیر محمد نے مجھ سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے زور سے گلے لگا لیا اور بولا ”مجھے یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے جوان، ورنہ میں بھی تمہارے استاد سے ملنے ضرور چلتا تمہارے ساتھ“ میں نے اسے رخصت کرتے ہوئے دھیرے سے اس سے کہا۔ ”جب تم وزیرے کی ماں سے فون پر بات کرو، تو اسے بتانا کہ تمہارا نشانہ واقعی بہت اچھا ہے۔“ جیپ میں بیٹھتا ہوا شیر محمد زور سے ہنس پڑا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ایس پی نے وہیں ریت پر لکڑی کی ایک چھڑی کی مدد سے میری معلومات کے مطابق کال گڑھ کا ایک چھوٹا سا نقشہ بنا لیا اور قلعے کا جغرافیہ اور آنے جانے کے تمام ممکنہ راستے اپنی فورس کو اچھی طرح ذہن نشین کروا دیے۔ آدھے سپاہی ڈی ایس پی کی قیادت میں دوسری جانب سے صحرا کی طرف نکلتے راستوں پر پہرے کی چوکیاں بناتے ہوئے، کال گڑھ کا محاصرہ کرتے ہوئے بڑھتے گئے، جبکہ ایس پی صاحب میرے ساتھ آدھے سپاہی لیے کال گڑھ میں داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی نصیب ہماری پوری گنتی الٹی کر دیتا ہے، ہر توقع برعکس ثابت ہو جاتی ہے، شاید آج یہی جبروت کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس قید خانے میں خانو مجھے صحرا کے دوزخ سے نکلنے کے راستے اور گُر بتا دے گا اور میں اس کے جانبازوں کو کالے اور اس کے دو ساتھیوں کی مدد سے پچھاڑ کر صحرا پار کر جاؤں گا اور ایک سرحدی چوکی تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ چوکی والے بھی اپنے فرائض کی حد بندی کی وجہ سے اتنی جلدی میری مدد نہ کر پاتے، کیوں کہ یہ پولیس کا کیس تھا۔ ایسے میں جبروت نے یہ بھی کہاں سوچا ہوگا کہ مزار پر رہنے والے یہ دو فقیر، اتنی پہنچ بھی رکھتے ہوں گے کہ ایک ٹیلی فون پر ضلع کے ایس پی کو تمام لوازمات کے ساتھ کال گڑھ آنے پر رضامندی کر سکیں گے، کیوں کہ عام حالات میں اس سارے انتظام کے لیے کم از کم مہینہ درکار ہوتا، لیکن اس کی تمام توقعات کے برعکس میں اس وقت ایس پی سمیت قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دربان کو دروازہ کھولتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اندر سے کچھ مزاحمت ہوئی اور چند کارندوں نے پولیس پر فائر کھولنے کی کوشش کی، لیکن آدھے گھنٹے کے اندر ہی قلعے کے اندر موجود دس بارہ محافظ گرفتار ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے راہ داریوں میں دوڑتا ہوا قید خانوں کی طرف بڑھ گیا۔ نوری اور اس کے باپ سمیت گیارہ مزید قیدی اس زندان سے برآمد ہوئے، لیکن میری نظریں سلطان بابا کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ میں نے ایک ایک کال کوٹھڑی میں خود جھانک کر دیکھا، لیکن ان کا کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ قیدی آزاد ہونے کے بعد قلعے کے صحن میں جمع تھے اور خوشی سے نعرے لگا رہے تھے، قلعے سے باہر کال گڑھ کی ساری بستی، رات ہونے کے باوجود جمع ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے بچھڑوں کے لیے رو رہے تھے، چلا رہے تھے۔ جبروت کے ظلم کا سورج آج ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا، لیکن خود جبروت نہ جانے کہاں غائب تھا۔ اکرم اور اس کے دو مزید خاص ہرکاروں کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میری سانسیں رُکنے لگیں، کہیں اس نے سلطان بابا کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔

نوری بھی اپنے باپ سمیت، صحن ہی میں کھڑی رو رہی تھی۔ میں واپس دوڑتا ہوا ایس پی کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ سلطان بابا کا کہیں کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ایس پی وائرلیس پر اپنی فورس کو ہدایت دینے میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں قیدیوں کے ہجوم سے ایک قیدی باہر نکلا اور اس نے مجھے گلے لگا لیا ”میں جانتا تھا..... تم کامیاب واپس لوٹو گے.....“ آواز سنتے ہی میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ خانو تھا۔ میں بھی روہانسا سا ہو گیا۔ ”یہ سب تمہاری مدد کی وجہ سے ممکن ہوا ہے خانو..... لیکن میرے سلطان بابا نہ جانے کہاں ہیں۔ سارا قلعہ چھان مارا ہے لیکن.....“ خانو چلایا ”ٹھہرو، وہ ضرور بابا کو قلعے کی اس خفیہ سرنگ کے ذریعے لے جانے کی کوشش میں ہوں گے، جو سیدھی صحرا کو جا نکلتی ہے.....“ ایس پی نے خانو کی بات سنتے ہی مزید ایک لمحہ ضائع کیے بنا، کچھ سپاہیوں کو خانو کے ساتھ اس سرنگ کا پتا لگانے کے لیے دوڑا دیا۔ میں نے بڑھنے کی کوشش کی، تو مجھے روک دیا گیا۔ ”آپ رک جائیں..... وہاں خطرہ ہو سکتا ہے.....“ میرے بس میں ہوتا، تو سب سے آنکھ بچا کر وہاں سے بھاگ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ایک سپاہی ہانپتا ہوا دوڑ کر واپس آیا اور اس کی بات سن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ زور سے چیخا ”سرنگ مل گئی ہے صاحب، وہاں ایک بوڑھا اوندھے منہ پڑا ہے.....“

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

.....ہاشم ندیم.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

اس سپاہی کی بات سُن کر مجھے یوں لگا، جیسے ابھی آسمان پھٹ کر ہمارے سروں پر آ گرے گا۔ میں تڑپ کر آگے بڑھا، تو کسی دوسرے سپاہی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی، لیکن میں اُسے دھکیل کر قلعے کی اس غلام گردش کی طرف بھاگا، جہاں خانو سُرنگ دکھانے کے لیے باقی سپاہیوں کو لے گیا تھا۔ وہاں تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے اندر جاتی سیڑھیاں نظر آ گئیں، جو بہ ظاہر کسی تہہ خانے کا راستہ دکھائی دے رہی تھیں۔ جانے جبروت جیسے ہر قلعے دار کو اپنے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ میں نے تاریخ میں بھی ایسے بہت سے بادشاہوں کا تذکرہ پڑھا تھا، جو اپنے محل سے فرار کا ایسا کوئی پوشیدہ راستہ ضرور بنا کر رکھتے تھے۔ کیا جبر اور اقتدار ہمیشہ ہی سے چور راستوں کا محتاج رہا ہے؟؟ سرنگ کے اندر سپاہیوں کا جمگھٹا سا تھا۔ انتہائی تنگ ہونے کے باوجود نہ جانے اس سرنگ میں ہوا کہاں سے آ رہی تھی۔ میں ٹارچ کی روشنی میں بنے دائروں سے ہوتا ہوا، وہاں تک پہنچا، جس جگہ کی سپاہی نے نشان دہی کی تھی۔ ہاں، وہ سلطان بابا ہی تھے، ہوش و حواس سے بیگانہ، نہایت زرد رنگت اور اُکھڑی سانسوں کے ساتھ بے سدھ پڑے ہوئے۔ کچھ سپاہی ان کے ہاتھ پاؤں مَسل کر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا کو اٹھا کر باہر کھلی فضا میں پہنچا دیا گیا۔ بہ ظاہر انہیں کوئی چوٹ لگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایس پی صاحب نے جب کسی سپاہی کو اپنی گاڑی سے میڈیکل بکس لانے کا حکم دیا، تو عقدہ کُھلا کہ وہ ڈاکٹر پہلے ہیں اور سی ایس ایس آفیسر بعد میں۔ انہوں نے سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایک انجیکشن بھی لگا دیا۔ انہیں بھی بہ ظاہر گھٹن اور تھکن کے علاوہ، کوئی خاص علامت دکھائی نہیں دی، لیکن انہوں نے مجھے تلقین ضرور کر دی کہ پہلی فُرصت میں انہیں کسی بڑے اسپتال میں مکمل طبّی معائنے کے لیے ضرور لے جاؤں۔ قلعے میں ابھی تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ سپاہیوں کے ساتھ زنانہ پولیس بھی تھی، جس نے قلعے کی تمام خواتین کو اندرونی احاطے میں جمع کر کے انہیں تسلّی دی کہ فی الوقت اُن میں سے کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کریں، البتہ واضح رہے کہ اُن میں سے کسی کو بھی قلعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ رات تیزی سے ڈھل رہی تھی اور میں وہیں سلطان بابا کے سرہانے پریشان بیٹھا بار بار ان کا ماتھا چُھو کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ حدّت سی محسوس ہوئی تو میں جلدی سے ایس پی صاحب کو بلا لایا، انہوں نے تصدیق کر دی۔ ''ہاں..... کچھ بخار سا تو ہے، لیکن اتنی تھکن کے بعد یہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔'' میں نے ان سے جبروت کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے بتایا کہ سارے علاقے کا محاصرہ کر لیا گیا ہے، لیکن فی الحال اُس کی جراست کی اطلاع نہیں آئی۔ میں نے بھیڑ میں سکینہ کے نانا نانی کو دیکھا، تو میرا جی چاہا کہ دوڑ کر کہیں چُھپ جاؤں، لیکن وہ تو خود ہی مجھے تلاش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے، ان کے پاس وہی ایک سوال تھا، جس کے بارے میں سوچ کر ہی میری سانسیں گھٹنے لگتی تھیں۔ اچانک ہجوم میں خانو مجھے ایک جانب کھڑا نظر آیا۔ میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ جلدی سے میری جانب بڑھا ''تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے نا.....؟''، ''ہاں، اور اسی لیے میں نے خود کو پولیس کو اپنے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھے جبروت کے خلاف ''سلطانی گواہ'' بنانے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ مجھے جبروت کے ہر گناہ کا اقرار بیان کی صورت میں بھری عدالت میں کرنا ہوگا اور میں اس کے لیے تیار ہوں، بلکہ پولیس اگر مجھے سلطانی گواہ نہ بھی بنائے، تب بھی عدالت میں بیان ضرور دوں گا۔'' میں نے غور سے خانو کی طرف دیکھا۔ ''نہیں تم ضرور سلطانی گواہ ہی بنو گے، لیکن یہ تمہارا کفارہ نہیں ہوگا۔ تمہارا اصل کفارہ تمہاری رہائی کے بعد شروع ہوگا۔ بولو، منظور ہے؟'' خانو نے میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ ''تمہارے لیے خانو کی جان بھی حاضر ہے۔ تم صرف کفارے کی بات کرتے ہو؟'' میں نے اسے دور کھڑے بوڑھے جوڑے کی طرف اشارہ کر کے بتایا ''یہ بوڑھا اور بڑھیا اُسی سکینہ کے نانا اور نانی ہیں، جو اسی قلعے کی کھولی نمبر سات میں دفن ہے۔ تمہارا پہلا کفارہ یہی ہے کہ تم انہیں لے جا کر سکینہ کی قبر دکھاؤ اور اس بڑھیا کے شانوں پر پڑی وہ آدھی پھٹی ہوئی پھولوں والی چادر اس بدنصیب کی قبر پر ڈال دو۔'' خانو کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ یوں ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، جیسے اس کے قدموں تلے کوئی بچھو نکل آیا ہو۔ ''نہیں نہیں! مجھ سے نہیں ہوگا۔ تم چاہو تو میرا سر کاٹ کر اُن کے قدموں میں ڈال دو، لیکن.....''، ''لیکن کیا.....؟ ابھی تو تم دعویٰ کر رہے تھے کہ کفارے کے لیے ہر حد سے گزر جاؤ گے، پھر اس پہلی حد کو پار کرنے سے پہلے ہی تمہارے پاؤں کیوں جلنے لگے.....؟'' وہ بے بسی سے تلملایا ''نہیں، یہ بات نہیں ہے، لیکن میں ان کا سامنا کیسے کروں گا؟'' میں نے اس کا چہرہ اپنی جانب موڑا ''تمہیں صرف آج نہیں، ساری عمر اُن کا سامنا کرنا ہے، کیوں کہ تمہارا اصل کفارہ اب ان لاچاروں کی کفالت ہی ہے۔ اب تم ہی کو عمر بھر ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ زندگی بھر کے گناہ دھونے کا اس سے بہترین موقع بھلا اور کیا ہوگا؟'' خانو نے شدید کش مکش کے عالم میں سکینہ کے بزرگوں کی جانب دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اُسے ان کی جانب دھکیل دیا۔ بڑھیا اپنے آس پاس سے گزرنے والے ہر شخص سے یہی پوچھ رہی تھی کہ کیا قلعے کے سارے قیدی رہا ہو چکے ہیں اور کیا ان میں سے کسی نے ان کی سکینہ کو کہیں دیکھا؟ خانو دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا تھا، بوڑھی آنکھوں نے اس سے بھی یہی سوال پوچھا۔ خانو نے بنا کچھ کہے، ان دونوں کا ہاتھ پکڑا اور اندرونی راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔ خانو کے قدموں میں واضح لرزش مجھے اتنی دور سے بھی نظر آ رہی تھی، لیکن یہ لڑکھڑاہٹ اُن قدموں کی تھی، جو آج زندگی میں پہلی مرتبہ کفارے کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ جانے ہمارے قدم تب اس طرح کیوں نہیں لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے، جب ہم گناہ کے راستے پر بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے قدرت ہم کم زور و کم حوصلہ انسانوں کو اس قدر ثابت قدم اور مضبوط

کیوں سمجھتی ہے۔؟ سچ ہے کہ انسان کا مقدر یہ عمر بھر کی پھسلن ہی ہے۔ کم ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں، جو اس ازلی ڈھلان سے پھسلے بنا ہی سیدھے نیچے اتر جاتے ہیں۔ خانو کو اُن کوٹھڑیوں کی جانب گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بڑھیا کی چیخوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ساتھ ہی بوڑھے کے رونے کی آواز بھی سنائی دی، تو ساری بستی والے اُس جانب دوڑے، میں وہیں گم صُم سا سلطان بابا کے سرہانے بیٹھا رہا کہ میں جانتا تھا کہ ان بدنصیبوں پر کیا قامت گزر چکی ہے۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ میں نے سکینہ کے نانا نانی کی آس سدا کے لیے توڑ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ کیا بُرا تھا، اگر میں اُنہیں ان کی عمر کے آخری چند برسوں میں اسی بھرم ہی میں جینے دیتا کہ ان کی لاڈلی نواسی گم شدہ ہے، لیکن زندہ ہے۔ ہم میں سے کتنے بہت سے انسان اپنی پوری زندگی ایسے ہی کسی جھوٹے بھرم میں گزار دیتے ہیں کہ ''وہ مجھے چھوڑ گئی، لیکن بے وفا نہ تھی''، ''وہ واپس لوٹا تو پھر میرا ہی ہوگا''، ''یہ دنیا ہماری نہیں تو کیا، آخرت تو ہماری ہی ہے'' یا پھر ''اگلی زندگی کس نے دیکھی ہے، جتنا بھی جینا ہے، یہیں جی لیں۔'' تو اگر ایک بھرم اور بڑھ جاتا، تو ایسا کیا گناہ ہو جاتا، لیکن میں اس عمر بھر کی اذیت سے بھی واقف تھا، جو کسی کے نہ ختم ہونے والے انتظار کی صورت میں جھیلنی پڑتی ہے۔ انتظار تو خود پل پل وارد ہوتی موت کا نام ہے اور میں اُن دونوں کی بوڑھی آنکھوں کو انتظار کی اس اونچی صلیب پر مزید نہیں لٹکانا چاہتا تھا، ورنہ شاید ان کی پلکیں موت کے بعد بھی کھلی رہ جاتیں۔

کچھ دیر میں سلطان بابا نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں جلدی سے ان پر جُھکا ''اب کیسے ہیں آپ..... آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی، ہوا کیا تھا؟'' میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے۔ ''ابھی تک بہت جلد باز ہو۔'' پھر انہوں نے آہستہ آہستہ مجھے بتایا کہ جبروت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں صرف بارہ گھنٹے کے قلیل وقفے میں ضلع بھر کی پولیس نفری لے کر قلعے کے دروازے پر آ پہنچوں گا۔ جیسے ہی اُسے پولیس کی آمد کی اطلاع ملی اور صحرا سے آئی جیپ والوں نے اُسے بتایا کہ صحرا میں صرف اور صرف پولیس ہی کی گاڑیاں نظر آ رہی ہیں، تو اس نے سب سے پہلے حکومت میں موجود اپنے اُن اعلیٰ عہدے داروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، جو اس کے در پردہ ہمدرد تھے، لیکن حسبِ معمول اس موقع پر سب ہی نے کسی نہ کسی بہانے سے معذرت کر لی۔ ایک آدھ نے پولیس کے دربار کی گھنٹی ہلانے کی کوشش کی بھی، تو وہاں نصیر صاحب کی ہدایات کا قُفل پڑا پایا۔ جبروت کے پاس وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور فورس کال گڑھ میں داخل ہو چکی تھی۔ تب ہی اس نے سلطان بابا کو طلب کیا اور جھنجھلا کر ان سے پوچھا کہ آخر وہ ہیں کون؟ لیکن اس سے پہلے کہ سلطان بابا کوئی جواب دے پاتے، پولیس کی گاڑیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں اور مجبوراً جبروت کو افراتفری میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جاتے جاتے اُس نے اپنے ہرکاروں کو سلطان بابا کو بھی ساتھ ہی لے جانے کا حکم بھی دے دیا، لیکن اس بھاگ دوڑ میں سلطان بابا کو دو چار دھکے سینے پر اس زور سے لگے کہ وہ بھاگنے والوں کے تیز قدموں کے لیے زحمت بن گئے۔ جبروت آگے نکل چکا تھا، پیچھے والوں میں سے کسی نے ان کے سر پر وار کیا اور وہ لوگ اُنہیں بے سدھ پڑا چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے۔ شاید ان کے ذہن میں کہیں یہ اطمینان بھی ضرور ہوگا کہ اس خُفیہ سُرنگ میں یہ ضعیف شخص ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی جان دے دے گا، کیوں کہ عام حالات میں اُس تہہ خانے کی دیواروں میں چُھپے، اس سُرنگ کے دروازے کو ڈھونڈنے میں ہمیں شاید ہفتوں لگ جاتے، لیکن ایک بار پھر یہاں خانو کا کفارہ جبروت کی تمام چالوں اور گناہوں پر بازی لے گیا اور چند لمحوں بعد ہی ہم نے انہیں کھوج لیا۔ میں نے انہیں مختصراً سکینہ کے بارے میں بتایا، تب تک اندر سے سکینہ کے بِڈھال نانا نانی کو کچھ لوگ سہارا دیے ہوئے باہر نکال لائے۔ خانو بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ ایس پی صاحب کو سلطان بابا کے ہوش میں آنے کی خبر ملی تو انہوں نے فوراً آئی جی صاحب کو کنٹرول لائن کے ذریعے اطلاع کروا دی۔ رات ڈھلنے ہی والی تھی۔ میرے شدید اصرار کے باوجود سلطان بابا نے مزید آرام کرنے سے منع کر دیا اور مؤذن کو وہیں قلعے کی فصیل پر چڑھ کر اذان دینے کی ہدایت کی۔ وہ بہت بِڈھال سے لگ رہے تھے، لیکن انہوں نے وہیں قلعے کے پکے صحن کو دھلوا کر چادریں بچھوائیں اور امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ آج یہیں قلعے میں فجر کی جماعت کروائیں، قلعے کی دیواروں نے صدیوں بعد یہ نظارا بھی دیکھا۔ امام کی قرأت کی آواز اس چار دیواری میں گونجی تو بستی کے سب ہی مکین نم دیدہ ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ ظہر کی نماز کے بعد سکینہ کی آخری رسومات یہیں قلعے میں ادا کی جائیں گی۔ بوڑھا جوڑا بھی اسی حق میں تھا کہ اب اسی کوٹھڑی کو سکینہ کی قبر کے طور پر رہنے دیا جائے، البتہ وہاں باقاعدہ مٹی کی ڈھیری اور قرآن و دعا وغیرہ کا انتظام کروا دیا گیا۔ میرا ذہن پھر سے جسم اور رُوح کے اَن دیکھے تعلق کے الجھے دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش میں خود اپنے بخیے ادھیڑنے لگا۔ رُوح کا عکس کیسا ہوتا ہوگا؟ کیا ہمارے ظاہری جسم کی شباہت کا بھی اس عکس پر کچھ اثر پڑتا ہوگا یا پھر وہ ہوا کے کسی جھونکے کی طرح بے رنگ، بے شکل ہوتی ہوگی اور مجھے سکینہ کا جو عکس صحرا میں نظر آیا تھا، وہ تو اس کی موت کے بعد دکھائی دیا تھا، گویا وہ عکس رُوح کے بغیر کی تصویر تھی۔ ہم خواب میں جو چلتی پھرتی تصویریں دیکھتے ہیں، وہ بھی تو بے جان ہی ہوتی ہیں۔ جس شخص کو میں اپنے خواب میں چلتا پھرتا، دوڑتا بھاگتا دیکھتا ہوں، وہی اُس وقت اپنی رُوح سمیت کہیں اور جیتا جاگتا موجود ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ذہن کے پردے پر بنا روح جو فلم چل رہی ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ کبھی ہمارا اس شخص کے جسم اور رُوح سے کوئی خونیں رشتہ بھی رہا ہو۔ ہم بالکل ان جان اور نئے چہرے بھی اپنے خواب میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان کا خاکہ کیسے تراش لیتا ہے؟ اُن میں سے کئی چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں ہم باقی پوری زندگی کبھی دوبارہ نہیں دیکھ پاتے، لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی خواب کا شناسا چہرہ مل بھی جاتا ہے، تو کیا ہم عالمِ ارواح میں پہلے اُس چہرے کی روح سے مل چکے ہوتے ہیں؟ سلطان بابا کی حالت اُس وقت ایسی نہیں تھی کہ میں انہیں مزید سوال پوچھ پوچھ کر پریشان کرتا، لیکن خود میں الجھتا ہی چلا گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں، جو مستقبل کی جھلکیاں اپنے خواب میں دیکھ لیتے ہیں، ان میں سے بعض تو جاگتی آنکھوں سے چند لمحوں میں آنے والے کسی واقعے کی کچھ تفصیل، کبھی کچھ اشاروں میں اور کبھی باقاعدہ چہرے، نام اور جگہ کی تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، لیکن انہیں وہ اجنبی چہرے اور انجان جگہیں کس طرح خواب میں دکھائی دی جاتی ہیں، ضرور میرا اور سکینہ کی تصویر کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ میرے لیے بہ ظاہر ان جان ہونے کے باوجود ان جان نہیں تھی۔ میرا پورا دن اسی سوچ بچار میں گزر گیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ سلطان بابا جس قدر ہو سکے، آرام کریں، لیکن بستی والوں نے ہمیں مزار واپس لوٹنے ہی نہیں دیا اور نُوری کا باپ ضد کر کے ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ میں نے بستی کے ڈاکیے کے ذریعے شیر محمد کو بھی ایک رقعہ بھجوا دیا تھا کہ اگر ہو سکے تو اپنی یونٹ کا ڈاکٹر لے کر کچھ دیر کے لیے کال گڑھ آ جائے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کروا کے اپنا پورا اطمینان کر لوں اور پھر وہ ''شاباشے جوانا شاباشے'' کرتا ہوا عصر کے بعد اپنی جیپ میں ڈاکٹر کو لے کر پہنچ بھی گیا۔ ڈاکٹر نے نہایت تفصیل سے سلطان بابا کا معائنہ کیا، وہ ان کے سر کی چوٹ کے بارے میں کچھ فکر مند نظر آ رہا تھا، اس نے چند تفصیلی ٹیسٹ لکھ کر دے دیے کہ دو دن آرام کے بعد جب سلطان بابا سفر کے قابل ہو جائیں، تو فوراً شہر کی کسی بڑی لیبارٹری سے یہ ٹیسٹ کروا لیے جائیں۔ تب تک اس نے سلطان بابا کو سختی سے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

مغرب کے بعد شیر محمد اور ڈاکٹر کو رخصت ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مکمل اندھیرا چھاتے ہی سرحد کی جانب سے شدید فائرنگ کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ پولیس کی نفری بھی ابھی تک کال گڑھ میں موجود تھی اور پھر کچھ دیر بعد ہی ایس پی صاحب نے آ کر ہمیں وہ خبر سنائی، جو ایک خدشے کی طرح میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں صبح سے کھٹک رہی تھی۔ جبروت اور اس کے چار ساتھی سرحد پار کرنے کی کوشش میں سرحدی رینجرز سے بھڑ گئے اور میری توقع کے عین مطابق جبروت نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے ایک بار سلطان بابا نے بتایا تھا کہ معافی اور توبہ کی توفیق بھی مقدر والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے، ورنہ آنکھوں پر لوہے کے پردے اور کانوں میں سیسہ پگھلا دیا جاتا ہے۔ انسان کے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔ شاید یہی سب کچھ جبروت کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اس کی انا اُسے کفارے کے راستے پر بڑھنے سے روک رہی تھی۔ موت دونوں جانب ہی اس کا مقدر

تھی۔ وہ گرفتاری دے دیتا، تب بھی صرف سکینہ کا قتل ہی اُسے پھانسی پر چڑھانے کے لیے کافی تھا اور شاید خود کو اپنی مرضی سے دار کے حوالے کر دینے سے قدرت اس کے چند گناہ دھو بھی ڈالتی، لیکن اس نے گناہوں کی کالک ماتھے پر لیے ہی اس جہاں سے جانے کی ٹھان لی تھی۔ پولیس کنٹرول کے ذریعے ہمیں پل پل کی خبر مل رہی تھی کہ اب جبروت کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا ہے۔ اب اس کے ساتھی بھاگ رہے ہیں اور پھر اس کا پہلا محافظ گرا پھر دوسرا اور اب جبروت کو آخری تنبیہ کی جا رہی ہے کہ ہتھیار ڈال کر سامنے آ جائے اور پھر مکمل خاموشی..... ایک آخری فائر کی آواز گونجی اور پھر پولیس کے وائرلیس سیٹ چیخ پڑے، ہر جانب ایک شور سا مچ گیا۔ جبروت نے خود کو کنپٹی پر گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔ بستی کی ساری آبادی، جو پولیس کے صحرا میں قائم کردہ عارضی کنٹرول روم کے گرد جمع تھی، گنگ سی رہ گئی۔ چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا، ظلم کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ابھی چوبیس گھنٹے پہلے تک، جوان سب لوگوں کی قسمت کا فیصلہ گر تھا، آج ایک بے جان لاشے کی صورت ریت پر بے بس پڑا تھا۔ سرخ رنگ اور خون کی دھار، تو اس کا پسندیدہ کھیل تھا اور آج جاتے جاتے بھی وہ یہ کھیل کھیل ہی گیا۔ سلطان بابا کو خبر پہنچی، تو ان کی زبان سے ایک ہی جملہ نکلا ''انا للہ وانا الیہ راجعون.....'' وہ ابھی نوری کے گھر ہی میں آرام کر رہے تھے اور پھر اگلی صبح سورج نکلتے ہی پہلے سانول اور پھر اس کا باپ یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے۔ سانول مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گلے لگ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کا باپ بھی شرمندہ سا پیچھے کھڑا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے چپ کروایا۔ سانول کے باپ نے پوری بستی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ وہ جبروت کے ڈر کی وجہ سے کھل کر بستی والوں کا ساتھ نہیں دے سکا، نہ ہی اُس نے اپنے بیٹے کو جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے اور اس تمام معاملے کی خبر ہونے دی، کیوں کہ اسے خدشہ تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے جُڑے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔ وہ خوف زدہ تھا اور زمانے میں خوف سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ کال گڑھ والوں کے سر سے جبروت کے خوف کے بادل چھٹے، تو ان کی زرد رنگت میں بھی دھیرے دھیرے سرخی شامل ہونے لگی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ صرف سانس لینے کی مجبوری سے نکل کر جینے کے سپنے دیکھنے لگے تھے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اگلے دن بستی والوں سے رخصت لے کر سلطان بابا کو شہر کے کسی بڑے اسپتال میں داخل کروا دوں، تاکہ ان کے تمام ٹیسٹ ہو سکیں۔ ویسے بھی کال گڑھ میں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا، لیکن جیسے ہی میں نے اپنی اس خواہش کا بستی والوں کے سامنے اظہار کیا، سب ہی بگڑ گئے۔ سانول تو باقاعدہ لڑنے کے لیے آ پہنچا کہ اگر سلطان بابا کا طبی معائنہ ہی کروانا ہے، تو وہ خود میرے ساتھ شہر جا کر دو چار دن میں تمام کام مکمل ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آ جائے گا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ ہمارے پاؤں میں چکر تھا، جانے قدرت نے ہمارا اگلا پڑاؤ کہاں لکھا تھا اور اب مزید کون سا امتحان درپیش ہوگا۔ اُسی شام سانول کے باپ کی درخواست پر نوری کو باقاعدہ نشانی پہنانے کی رسم بھی رکھی گئی تھی۔ شام ہی سے بستی کے سب ہی گھروں کی دیواروں کی مُنڈیر پر دیے جلا دیے گئے۔ یہ اس صحرا کا پہلا چراغاں تھا، جو قلعے کی دیواروں کے باہر خود بستی والوں کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ مردوں نے برسوں سے صندوقوں میں پڑی اپنی سفید لٹھے کی گھیر دار شلواریں نکلوا کر انہیں مانج لگا کر تیاری کی۔ بوسکی کی دو گھوڑوں کے نشان والی قمیصیں اور سر پر نیا صافہ یا سرخ پگڑی، عورتوں نے بھی اپنے بازو کہنیوں سے اوپر تک چوڑیوں سے بھر لیے۔ سرخ، نیلے، پیلے، اودے اور سفید بڑے گھیر والے پلو اور ناک میں چمکیلے لَوکے۔ جانے ایسی رسموں کا مہندی سے ایک خاص تعلق کیوں جُڑا ہوتا ہے۔ شاید رنگ اور خوشی کا آپس میں کوئی گہرا ناتا ہوگا۔ اسی لیے تو جہاں خوشی بکھرتی ہے، وہیں بہت سے رنگ بھی دَر آتے ہیں۔ میں خود تو ابھی تک اس ''خوشی'' نامی جذبے یا احساس کی گتھی ہی نہیں سلجھا پایا تھا۔ خوشی کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو ہمیشہ ہی سے زیادہ خوشی مزید افسردہ کر دیتی ہے۔ شاید میرے اندر خوشی جھیلنے کا ظرف ہی نہیں تھا اور کسی ایسے احساس کا جشن کیا منانا، جو چند گھڑیوں سے لے کر بس چند گھنٹوں تک ہی آپ کا ساتھی ہو۔ شاید خوشی کا واسطہ ہی اس کی اس کم یابی کی صفت سے جُڑا ہے۔ بڑی سے بڑی خوشی ہمیں بس کچھ دیر کے لیے ہی تو مکمل مسرور رکھ پاتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے یہ سرور ایک اطمینان میں ڈھلنے لگتا ہے اور چند گھنٹوں بعد ہی کسی احساس کی تکمیل کی طمانیت میں تبدیل ہو کر ذہن کے کسی گوشے میں کروٹ لے کر سو جاتا ہے، پھر جب تک ہم خود اس لطیف احساس کو نہ ٹٹولیں، یہ اپنے آپ نہیں جاگتا، لیکن اس کے برعکس ''غم'' ہر لمحہ بوند بوند ہو کر ہمارے دل کی زمین پر ٹپکتا رہتا ہے۔ ہمیں خوشی کو کچھ دن کے بعد یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جب کہ غم ہمیں کبھی بھولتا نہیں۔ کسی وفادار دوست کی طرح ہر پل ہمارے وجود کے اندر رہتا ہے، خوشی اپنے ساتھ ہمیشہ رخصت ہونے کا تصور لاتی ہے، جبکہ غم کا کانٹا ایک دائمی چُبھن، کاٹ اور جلن لیے، دل کے اندر ہی پیوست ہو جاتا ہے، تو پھر نہ جانے ہم ہمیشہ خوشی کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں، اُس بے وفا کو ہر لمحہ خوش آمدید کہنے کے لیے کیوں تیار رہتے ہیں، جو ہمیشہ اپنے ماتھے پر ''الوداع'' لکھوا کر آتی ہے، اُسے کیوں اٹھا کر سدا کے لیے اپنے سینے سے نہیں لگا لیتے، جو عمر بھر ہماری چوکھٹ پر پڑا ہمارا انتظار کرتا رہتا ہے۔

سانول بھی آج اس بے وفا خوشی کے وار کا شکار تھا۔ جب میں مزار کی دہلیز پر پڑے غم کی چوکھٹ پار کر کے بستی کے لیے نکلا، تو شام ڈھل چکی تھی۔ غم مجھے جاتے دیکھ کر بولا ''جاؤ مل آؤ، اس دو گھڑی کی ساتھی سے، میں یہیں پڑا رہ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ پر دیکھو، کہیں دیر نہ کر دینا کہ میرا تمہارا تو سدا کا ساتھ ہے۔'' سلطان بابا کی دیکھ بھال کے لیے پیش امام صاحب نے مسجد سے دو طلبا کو مزار بھیج دیا تھا، کیوں کہ سلطان بابا اس شور شرابے سے گھبرا کر آج شام ہی واپس مزار لوٹ آئے تھے۔ میں جب سانول کے گھر کے قریب پہنچا، تو دور ہی سے مجھے عورتوں کی گنگناہٹ سنائی دی۔ صحرائی گیت کے بول سانول کو مبارک باد دے رہے تھے ''کہ آج تم سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا۔ تمہاری محبوب سولہ سنگھار کیے اور اپنے ماتھے پر تمہارے نام کی بندیا لگائے، کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے..... لیکن خدا مارے ان چوڑیوں والیوں کو..... یہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہیں..... شاید وہ تمہاری محبوب سے جلتی ہیں۔'' عورتیں زور سے ہنسیں اور کسی دوسری جانب سے کوئی اور ٹولی گنگنائی، یہ چوڑی والیوں کا جواب تھا ''ہاں ہاں..... ہم کیوں جلدی کریں؟ ہمارے تو دل جل رہے ہیں..... بستی میں ایک ہی تو چھیل چھبیلا تھا، جس کی بانسری سننے کے لیے ہم ساری صحرا میں جمع ہوتی تھیں..... خدا کرے آج اس زور کی آندھی چلے کہ صحرا کا شہزادہ اپنا راستہ بھول کر چوڑی والیوں کی بستی میں آ جائے.....'' سب عورتیں ہنس پڑیں۔ جانے یہ صحرائی گیت اور ٹپے کون لکھتا ہوگا۔ جانے ایسے کتنے گم نام شاعر ہوں گے، جنہیں دنیا کبھی جان ہی نہیں پائی، لیکن ان کے الاپ اور گیت سدا کے لیے امر ہو کر ان صحراؤں، بستیوں اور گاؤں گلیوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

سانول کی منگنی کی تقریب کا ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ لڑکے والیاں ترکی بہ ترکی لڑکی والیوں کے سوالوں کا جواب دے رہی تھیں۔ مرد قہقہے لگا رہے تھے، صحرا کے بنے ہوئے خاص سونف اور شکر کے مشروب سے ساری تقریب کی خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ بچے اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے، ہر طرف نور، رنگ، شور اور قہقہے تھے۔ سانول کو عورتوں کے جھرمٹ میں باہر لایا گیا، تو سب ہی اسی جانب دوڑے۔ کچھ ایسا ہی منظر نوری کے صحن کا بھی تھا۔ اس وقت نوری کے چہرے پر شام کی لالی اور صبح کے نور جیسے دو موسم بہ یک وقت جھلملا رہے تھے۔ یہ لڑکیاں ایسے مواقع پر اتنے بہت سے رنگ بہ یک وقت کیسے سمیٹ لیتی ہیں۔ اب عورتوں کے تیروں کا رخ میری جانب ہو گیا تھا۔ ایک نے لَے لگائی ''جانے لوگ کس کے غم میں جوگی بن بیٹھے ہیں۔ کاش آسمان پر اڑتی یہ نیلی پتنگ مزار کے مجاور تک میرا پیغام بھی پہنچا دے.....'' سب زور سے ہنسے، دوسری ٹولی نے تان چھیڑی۔ ''مزار کے مجاور کی آنکھوں کا سرمہ جانے کس کان سے آتا ہے..... اگر وہ چاہے تو ہم سب اپنی اپنی سرمے دانیاں مزار کی چوکھٹ پر چھوڑ آئیں.....'' سانول میرے قریب ہی بیٹھا ہنس ہنس کر اس صحرائی بولی کا ترجمہ مجھے سنا رہا تھا۔ لفظ چاہے کسی بھی زبان کے ہوں..... ان گیتوں کا مطلب سدا ایک سا ہی ہوتا ہے۔ ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ صحن کا دروازہ کھلا اور ایک طالب، جسے میں مزار چھوڑ آیا تھا، گھبرایا ہوا سا اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف بڑھا۔ اس کی کچی پکی اردو سے میں صرف اتنا ہی سمجھ پایا کہ سلطان بابا کو خون کی قے ہوئی ہے اور ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے جسم میں سے جیسے کسی نے پل بھر ہی میں ساری جان نکال دی۔ میں نے سانول سے کہا کہ وہ یہیں رہے، لیکن مجھے ابھی مزار لوٹنا ہوگا، لیکن سانول بھی میرے پیچھے ہی لپکا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دیگر بہت سے لوگوں سمیت مزار کی جانب دوڑے چلے جا رہے تھے۔

(باقی آئندہ)

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

سلطان بابا کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ چند لمحوں ہی میں وہ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔ رات کی گاڑی چھوٹنے میں ابھی سوا گھنٹہ باقی تھا، لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سواری کا تھا۔ گھنٹہ بھر کی تو یہاں سے ریلوے اسٹیشن کی مسافت تھی، لیکن کسی مریض کو پنا کسی سواری، یہ صحرا پار کرانے میں ہمیں صبح ہو جاتی۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ ہم دو، دو کی ٹولیوں میں اونٹوں پر سفر کریں گے۔ بستی میں سواری کے لیے پانچ اونٹ موجود تھے۔ عام حالات میں ان کے پیچھے دو پہیوں والی ٹھیلہ گاڑی بھی لگا دی جاتی تھی، لیکن اس وقت وہ پہیے ریت میں دھنس کر چلنے کی وجہ سے تاخیر کا باعث بن سکتے تھے، لہٰذا ہمیں اونٹوں کے مضبوط قدموں ہی پر انحصار کرنا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دس آدمی پانچ اونٹوں پر سوار، صحرا میں دوڑے جا رہے تھے۔ سلطان بابا میرے ساتھ تھے، سانول اور اس کا باپ ایک اونٹ پر اور نوری کا باپ اور پیش امام صاحب ایک ساتھ سوار تھے۔ خانو، اکرام صاحب اور بزرگ بقیہ اونٹوں پر تواتر سے ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے جب ہم بستی کی سرحد سے گزر رہے تھے، تو سب ہی مرد اور عورتیں مجھے اور سلطان بابا کو الوداع کہنے کے لیے باہر نکل آئے۔ میں نے صحرا میں پلٹ کر دیکھا اور مجھے یوں لگا، جیسے ہوا دھیرے سے میرے کان میں سکینہ کے آخری پیغام کی سرگوشی کر کے ہولے سے گنگنائی ہو ''الوداع.....''

ہم تیزی سے صحرا عبور کر کے اسٹیشن تک پہنچ تو آئے، مگر جس وقت میں نے دورِ صحرا میں ریلوے اسٹیشن کی اجاڑ عمارت اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جلتی مٹیالی سے گیس بتی دیکھی، تب تک ہمیں گھنٹہ بھر سے کہیں زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچے تو کانٹا بدلنے والے نے خوش خبری سنائی کہ آج گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے، اس لیے ابھی کال گڑھ نہیں پہنچی۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں پلیٹ فارم پر بچھے، لکڑی کے تختے نما بینچ پر لٹا دیا، نہ جانے کن فکروں میں وقت گزر گیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ سب ہی کی آنکھیں نم اور چہرے افسردہ تھے۔ سانول میرے ساتھ شہر جانے پر مُصر تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے واپس جانے پر آمادہ کیا، سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بھیڑ کے باوجود مجھے سلطان بابا کو لٹانے کی جگہ مل ہی گئی۔ یہاں سے قریب ترین شہر، رحیم پور بھی کم از کم بارہ گھنٹے کی مسافت پر تھا اور میں سارا راستہ یہی دعا کرتا رہا کہ ہمارے وہاں پہنچنے تک مزید کوئی ان ہونی نہ ہو جائے۔ بارہ گھنٹے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب جب ٹرین نے رحیم پور کے بڑے سے پلیٹ فارم کو چھوا، تو میں نے سب سے پہلے گھر فون کر کے مما، پپا سے بات کی اور انہیں کچھ پیسے بھیجنے کو کہا۔ شہر کے سب سے بڑے اسپتال کا پتا میں پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ چکا تھا۔ دوسرا فون میں نے آئی جی نصیر کو کیا، کیوں کہ انہوں نے ایس پی کے ذریعے سلطان بابا کی پل پل کی خبر دینے کی ہدایت کی تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں رحیم پور میں ہوں، تو فوراً اپنے ایک ریٹائرڈ سینئر کا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا کر تاکید کی کہ اسپتال پہنچ کر انہیں بھی ضرور مطلع کر دوں۔ یہ صاحب پولیس کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اب رحیم پور ہی میں اپنا فارم ہاؤس اور مالٹے کینو کے باغات کا کام سنبھالتے تھے۔ میں نے بے دھیانی میں تمام تفصیل کاغذ کی ایک چٹ پر لکھ کر جیب میں ڈال لی۔ اس وقت میری تمام توجہ اس جانب تھی کہ کسی طرح جلد از جلد سلطان بابا کو اسپتال پہنچا دوں، اسٹیشن کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ سے گاڑی لے کر میں لشتم پشتم اس بڑے نجی اسپتال تک پہنچا اور یہاں ایک بار پھر میرا حلیہ میرے آڑے آ گیا۔ باہر کھڑے دربان کو اس بات کا یقین ہی نہیں تھا کہ میں اتنے بڑے اسپتال کی فیس بھر سکوں گا۔ تب قریب سے گزرتے ایک معمر ڈاکٹر کو روک کر میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اندر جانے کی اجازت دلوائے۔ پپا رقم پہلے ہی اسپتال کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا چکے تھے۔ وہ کوئی بھلا انسان تھا، اس نے ہمدردی سے میری بات سنی اور گارڈ کو ڈانٹا کہ ''کتنی بار منع کیا ہے، یوں مریضوں کو گیٹ پر روک کر بحث نہ کیا کرو۔'' میں سلطان بابا کو ان ہی ڈاکٹر صاحب کی معیت میں انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف بھجوا کر خود استقبالیہ کی طرف دوڑا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی کو میں نے پاپا کا اور اپنا نام بتایا کہ کیا اس مد میں کوئی رقم اسپتال کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی ہے۔ اس نے مستعدی سے جانچ پڑتال کے بعد مسکراتے ہوئے اطلاع دی کہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ پپا نے اتنے پیسے بھیج دیے تھے کہ اگر ہمیں مہینہ بھر سے زیادہ بھی یہاں رہنا پڑتا، تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ تب میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ ''اب تو مسیحا بھی گراں ہو گئے'' اگر انسان کی جیب میں مناسب رقم نہ ہو تو یہ مسیحائی بھی اس کا مقدر نہیں۔ سلطان بابا کے سر کے بہت سے ایکسریز اور سی ٹی اسکین وغیرہ کے بعد انہیں ایک کشادہ کمرے میں داخل کر لیا گیا۔ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں تھے اور انہیں مستقل یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں خوامخواہ انہیں اتنے مہنگے اسپتال میں کیوں لے آیا ہوں، بقول ان کے، وہ بھلے چنگے تھے اور اب ہمیں وہاں سے چل پڑنا چاہیے تھا، لیکن ڈاکٹروں کی رائے اس کے بالکل برعکس تھی۔ انہوں نے سر کی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا تھا اور ان کے کلیے کے مطابق اب تک سلطان بابا کا چلنا پھرنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ بہرحال طے یہ ہوا کہ صبح بڑے ڈاکٹروں کا ایک پینل بابا کی تمام رپورٹس کی جانچ کرے گا اور پھر کوئی حتمی بات کی جائے گی۔

اس تمام ہنگامے میں شام ہو چلی تھی اور جب مجھے سلطان بابا کی نگرانی پر مامور نرس نے یہ اطلاع دی کہ یہاں رات بھر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی، تو مجھے ایک دوسری تشویش نے آ گھیرا۔ میں سلطان بابا کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا، لیکن اسپتال کے اصول بھی اٹل تھے۔ ابھی میں اسی کش مکش میں مبتلا تھا کہ ایک بزرگ، جو نفیس سے سفاری سوٹ میں ملبوس تھے، ہونٹوں میں پائپ دبائے بوکھلائے ہوئے سے دستک دے کر اندر داخل ہوئے۔ سلام کے بعد دھیرے سے نرس پوچھنے لگے ''کیا عبداللہ صاحب کا یہی کمرا ہے، میرا نام شیخ امتیاز ہے۔'' اچانک میرے ذہن میں بھی نام گونجا

''اوہ! یہ تو وہی حضرت تھے، جن کا پتا صبح نصیر صاحب نے بطورِ خاص لکھوایا تھا۔'' میں جلدی سے درمیانی حصے کا پردہ ہٹا کر کمرے کے دوسرے حصے میں آ گیا اور انہیں سلام کیا ''جی..... میرا نام عبداللہ ہے۔'' وہ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹکے اور پھر جلدی سے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے ملنے لگے ''اوہ! معذرت چاہتا ہوں، دراصل میرے ذہن میں کسی بزرگ کا خاکہ تھا۔ مجھے نصیر نے کچھ دیر پہلے ہی فون کر کے تمام تفصیل بتائی ہے۔ وہ بزرگ کیسے ہیں، جن کی طبیعت ناساز تھی؟'' میں انہیں اندر سلطان بابا کے پاس لے گیا۔ وہاں انہوں نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا کہ وہ اور نصیر صاحب ملازمت میں ایک دوسرے سے سنیارٹی میں کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود، بہت قریب تھے اور یہ تعلق شیخ صاحب کی ملازمت سے فراغت کے بعد بھی بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے سلطان بابا سے درخواست کی کہ ان کے لائق کوئی بھی خدمت ہو، تو ضرور حکم کریں۔ سلطان بابا نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ وہ یہاں تک آ گئے، یہی ان کے لیے باعثِ تسلی ہے۔ شیخ صاحب نے جھجکتے ہوئے اسپتال کی فیس کا پوچھا، تو نرس نے انہیں بتایا کہ مہینے بھر کی پیشگی ادائیگی ہو چکی ہے۔ وہ ذرا سے حیران ہوئے، لیکن چہرے کے تاثرات چھپا گئے۔ ہمارے ظاہری حلیوں کو دیکھتے ہوئے ان کی حیرت بجا تھی کہ کاغذ کے ان مخصوص ٹکڑوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اتنے میں نرس نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ مریض کے پاس رہنے کے اوقات ختم ہو چکے ہیں۔ سلطان بابا کو اب بھی میری ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں رات کہاں بسر کروں گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں قریب ہی کوئی جگہ تلاش کر لوں گا۔ وہ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں۔ اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا لیتے رہیں۔ شیخ صاحب، جو دروازے کے قریب ہی کھڑے تمام بحث سن رہے تھے، جلدی سے بولے ''آپ اس نوجوان کی فکر نہ کریں۔ میرا اتنا بڑا گھر کس دن کام آئے گا۔ عبداللہ میاں کو میں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا اور صبح ٹھیک وقت پر دوبارہ یہاں پہنچا بھی دوں گا۔'' سلطان بابا میرے چہرے پر پیش و پیش کے آثار دیکھ کر سمجھ گئے کہ میں ان تکلفات میں پڑنے سے کترا رہا ہوں۔ انسان جب تک اکیلا اور اپنے بس میں ہو تو آزاد رہتا ہے۔ کسی اور کے کرم پر ہو تو جکڑ جاتا ہے۔ میں جب تک اپنے گھر میں بھی تھا، تب بھی مجھے گھر کی پابندیاں اور مما، پپا کی نصیحتیں کبھی مخصوص اوقات کا پابند نہیں کر سکی تھیں۔ بیرونی گیٹ کی ایک چابی ہمیشہ میری گاڑی کی چابی کے چھلے میں موجود رہتی تھی، تاکہ جب کبھی میں آدھی رات کو اپنی مٹرگشت کے بعد گھر پہنچوں تو مجھے ہارن بجا کر دروازہ نہ کھلوانا پڑے۔ مجھے بندھے دروازوں، لگے بندھے نظام الاوقات اور ایسی ہر پابندی سے خدا واسطے کا بیر تھا، جو میرے اندر کی آزاد دنیا کو قید کرنے کی کوشش کرتی اور شاید وہ آوارہ گرد ساحر، اب بھی مجھ میں کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ سلطان بابا میرے ساتھ ہوتے تو بات اور ہوتی، کیوں کہ ان کی موجودگی میں، میں کہیں بھی آزادی محسوس کرتا تھا، لیکن یوں تنہا شیخ صاحب کے ساتھ جانے میں مجھے بہت ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ امتیاز صاحب بھی میری ہچکچاہٹ جان گئے اور مسکرا کر بولے ''بھئی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ نصیر آج کے بعد مجھ سے کبھی بات نہ کرے تو ضرور کہیں اور ٹھہر جانا، کیوں کہ وہ پکا پولیس والا ہے، ایک بار روٹھ جائے تو منانا مشکل ہے۔ جب اسے پتا چلے گا کہ میرے شہر میں اس کے مہمان کہیں اور قیام کر رہے ہیں، تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا سوچے گا.....؟'' سلطان بابا نے بھی میرا ہاتھ دبا کر مصلحت سمجھانے کی کوشش کی۔

ہم اسپتال کی پارکنگ میں آئے، تو ان کی بی ایم ڈبلیو کے ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور کچھ ہی دیر میں ہم ان کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ راستے میں انہوں نے اپنے خاندان کا غائبانہ تعارف بھی کروایا۔ ان کی اہلیہ چار سال پہلے داغِ مفارقت دے چکی تھیں۔ گھر میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑا لڑکا کاروبار کے سلسلے میں گزشتہ ایک ہفتے سے بیرونِ ملک تھا، اس کی آمد دو ہفتے میں متوقع تھی۔ بیٹے سے چھوٹی دونوں بیٹیاں اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھیں اور سب سے چھوٹا بیٹا ابھی بی اے کا طالب علم تھا۔ میں چپ چاپ ان کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ کافی زندہ دل انسان معلوم ہوتے تھے، جو اپنی اولاد کی ہر چھوٹی بڑی دل چسپی میں پوری طرح شامل ہو اور اپنے گھر ہی کو اپنی کل کائنات سمجھتا ہو۔ میں نے اپنے بارے میں مکمل تفصیلات بتانے سے اجتناب کیا اور اتنا ہی بتایا کہ ماں باپ کے بعد اب سلطان بابا ہی میرے اپنے اور بزرگ ہیں۔ اسی اثناء میں ان کا گھر بھی آ گیا۔ کافی بڑا بنگلہ تھا۔ جدید طرزِ تعمیر کا ایک شاہکار۔ اتنے دن صحرا میں گزارنے کے بعد اتنا زیادہ سبزہ اور ہرے بھرے درخت دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے اچانک ہی دنیا بلیک اینڈ وائٹ سے تبدیل ہو کر رنگین ہو گئی ہو۔ جلتی ہوئی لُو کی جگہ گاڑی سے اترتے ہی بھیگی ہوئی نرم ہوا کے جھونکے نے میرا چہرہ چوم لیا۔ دو نوکر اندر سے دوڑے چلے آئے اور آگے بڑھ کر ہاتھ سے میرے کپڑوں کا تھیلا تھام لیا۔ شیخ صاحب نے انہیں ہدایت کی کہ مجھے انیکسی میں لے جائیں۔ اب میرا قیام وہیں ہوگا۔ انہوں نے رات کے کھانے کے لیے میری پسند پوچھی، تو میں ٹال گیا کہ جو بھی بنا ہو، وہی میری پسند ہوگا۔ میں نوکروں کے پیچھے انیکسی کی طرف بڑھنے لگا، تو انہیں کچھ یاد آیا۔ ''ارے ہاں، عبداللہ میاں! انیکسی کے دوسرے کمرے میں اپنے شہریار میاں بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک ماہ پہلے ہی دارالحکومت سے تشریف لائے ہیں۔ میرے بہت گہرے دوست کے صاحب زادے ہیں۔ تمہارے ہی ہم عمر ہیں، امید ہے کہ تم دونوں کا وقت اچھا گزرے گا۔ تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ..... ہم کھانا انیکسی ہی میں کھائیں گے'' میں انیکسی پہنچا تو بنگلے کا ایک پورا حصہ مہمان خانے کے طور پر پچھلے حصے میں موجود تھا۔ جس کا اپنا پورچ اور باغیچہ بھی اسی حصے میں واقع تھے۔ انیکسی میں چار کمرے تھے، ڈرائنگ روم اور کھانے کا کمرا اس کے علاوہ تھا۔ میرے لیے جو کمرا کھولا گیا، اس کے ساتھ والے کمرے میں پہلے سے روشنی تھی اور تیز موسیقی کی آواز بند دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ گھر کافی کشادہ اور ہر طرح کے آسائشی لوازمات سے مزین تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہاں ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ستانے لگا۔ شاید اتنے بہت دنوں تک تنگ و تاریک اور ویران جگہوں پر رہتے رہتے، میں اب اسی ماحول کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم اپنی آسائش اور آرام کے پیمانے خود اپنے اندر ہی بناتے ہیں۔ کبھی یہ آرام دہ بستر میرے آرام کا پیمانہ تھا اور اب ایک رات پہلے تک صحرا کی جلتی ریت پر بھی میں سکون سے سو جاتا تھا۔ بات تو بس ذرا اس پگلے من کو بہلانے کی ہوتی ہے اور ہم میں سے جو کوئی بھی، یہ من بہلاوے کا گُر جان لے، دراصل وہی کامیاب کہلاتا ہے۔

کچھ دیر بعد شیخ صاحب بھی کپڑے تبدیل کر کے انیکسی پہنچ گئے۔ مجھے نوکر نے بتایا کہ وہ اور شہریار صاحب کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو ایک کلین شیو نوجوان نے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔ ''ہیلو! مجھے شہریار کہتے ہیں'' میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما ''میں عبداللہ ہوں'' شہریار مسکرایا۔ ''عبداللہ تو ہم سب ہی ہیں، یعنی اللہ کے بندے۔'' شیخ صاحب زور سے ہنسے ''ارے بھئی اس کی بات کا برا نہ ماننا، دراصل لفظوں سے کھیلنا ہی شہریار میاں کا پیشہ ہے۔ قلم کار جو ٹھہرے۔ آج کل یہاں بھی اپنے کسی منصوبے کے لیے کہانی کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں۔'' میں بھی دھیرے سے مسکرایا ''پھر تو ان سے ڈرنا چاہیے، کہیں ہماری ہی کہانی نہ بنا ڈالیں۔'' ان دونوں ہی کو شاید مجھ سے ایسے کسی جواب کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے دونوں چونکے اور پھر دونوں ہی زور سے ہنس پڑے۔ کھانے کے دوران پتا چلا کہ شہریار ایک لکھاری ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا، لیکن عملی زندگی میں باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی خواہش کو رد کر کے قلم سے رشتہ جوڑ لیا۔ موضوعات کی یکسانیت سے گھبرا کر وہ ایک جگہ بیٹھ کر لکھنے کے بجائے کہانی کی تلاش میں گھوم گھوم کر لکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ شہریار کو بھی مختصراً سلطان بابا کے بارے میں بتا دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر شیخ صاحب ہم دونوں سے رخصت ہو کر آرام کے لیے چلے گئے، میں اور شہریار بھی شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میں عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد بھی بہت دیر تک شیشے کی اس دیوار نما بڑی سی کھڑکی کے قریب ہی بیٹھا رہا، جہاں سے انیکسی کی پشت پر موجود باغیچے کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ باغ میں ہر تین چار گز کے فاصلے پر بجلی کے سفید دودھیا قمقمے لگائے گئے تھے، لہٰذا اس وقت بھی وہاں دن جیسا ہی سماں تھا، میری توجہ ابھی اسی لان کی انتہائی نفاست سے تراشی گئی باڑھ اور بیلوں کی جانب ہی تھی کہ اچانک سامنے پڑی چھوٹی سی شیشے کی تپائی پر پڑا فون بج اٹھا۔ میں زور سے چونکا، رات

کے ساڑھے بارہ بجنے کو تھے۔ اس وقت کس کا فون ہوسکتا ہے۔؟ اچانک میرا ذہن اسپتال کی طرف گیا اور کسی ان جانے وسوسے کی پھنکار سے ڈر کر میں نے جلدی سے ریسیور اٹھالیا۔ ''جی.....'' دوسری جانب خاموشی تھی۔ میں نے قدرے زور سے کہا ''جی فرمائیے'' دوسری جانب سے ایک نازک سی نسوانی آواز ابھری ''جی..... آپ کون؟'' ''میں عبداللہ ہوں۔'' دوسری جانب سے کھٹ سے فون بند ہوگیا۔ شاید کوئی رانگ نمبر تھا۔ میں گہری سانس لے کر اٹھنے ہی کو تھا کہ گھنٹی دوبارہ بجی، جی میں آیا کہ ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دوں، لیکن نہ جانے اس فون کی دوسری لائن کہاں تھی۔ اسی طرح مصروف کردینے سے کوئی ضروری فون بھی تو چوک سکتا تھا۔ میں نے دوبارہ ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب وہی آواز تھی ''جی..... شہریار.....؟'' اوہ تو یہ شہریار کے لیے فون تھا۔ میں نے جواب دیا ''نہیں..... شہریار صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔ میں یہاں مہمان ہوں۔'' دوسری جانب پھر وہی جلترنگ بجا۔ ''اوہ..... معاف کیجیے گا، آپ کو اتنی رات گئے زحمت دی۔ آپ فون رکھ دیں اور اس بار گھنٹی بجے تو آپ نہ اٹھائے گا، شہریار خود اٹھالیں گے۔ دراصل اس نمبر کی دو ایکسٹینشنز ہیں۔'' میں نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی تو تین گھنٹیوں کے بعد خاموشی چھا گئی۔ شاید دوسری جانب سے شہریار نے فون اٹھالیا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر گزارنے کے بعد ہی مجھے پھر سے وہی گھٹن ستانے لگی، حالاں کہ اے سی کی وجہ سے کمرے میں خوش گوار خنکی چھائی ہوئی تھی۔ میں ابھی باہر نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور شہریار نے اندر جھانکا ''ویسے تو آدھی رات کے وقت یہ سوال کرنا خود بدتہذیبی کے زمرے میں آتا ہے، لیکن اجازت ہو تو اندر آجاؤں، مجھے بھی نیند نہیں آرہی، تمہاری نیند شاید بار بار اس فون کی بجتی گھنٹی نے اڑادی ہے۔'' میں خوش دلی سے مسکرایا ''نہیں! میری نیند ازل سے اڑی ہوئی ہے، شاید میرے اندر ہی کوئی گھنٹی لگی ہوئی ہے، اندر آجاؤ۔'' شہریار نے میری کرسی کے سامنے والا صوفہ سنبھال لیا ''واہ، خوب کہی، ویسے تمہاری تعلیم کتنی ہے؟ سچ کہوں تو مجھے تو تم بھی کوئی رائٹر ہی دکھتے ہو'' میں ہنس کر ٹال گیا۔ الٹا شہریار سے سوال کردیا ''تم کہانی کی تلاش میں یہاں آئے ہو، تو پھر کچھ کامیابی ہوئی کہ نہیں'' شہریار نے ایک لمبی سی سانس لی ''اب کیا بتاؤں، پچھلے چند دنوں سے میں خود ایک کہانی بنا ہوا ہوں'' ''کیوں..... خیریت.....؟'' ''ہاں، فی الحال تو خیریت ہی ہے۔ دراصل ڈیڈی نے مجھے یہاں کسی اور مقصد کے لیے بھیجا ہے۔ کہانی تو بس ایک بہانہ ہی ہے۔ مجھے شیخ انکل کی دو بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بطور ہم سفر انتخاب کرنا ہے۔ یہ ڈیڈی کی خواہش ہے۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن انہوں نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ چوں کہ ابھی تک کوئی مہ جبیں میری نظروں میں سمائی نہیں، لہٰذا اس چناؤ کے لیے اپنی پہلی تلاش اسی گھر سے شروع کروں اور یہیں سے میری الجھن کا آغاز ہوتا ہے۔'' میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا ''اس میں الجھن کیسی۔ شیخ صاحب کی دونوں صاحب زادیوں سے مل کر دیکھ لو، اور پھر دونوں میں سے جو بھی دل کو بھائے، اس کے لیے ہاں کہہ دو اور پھر تمہیں تو ''نہ'' کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے۔ دل نہ مانے تو اپنے ڈیڈی کو اطلاع کردینا۔'' شہریار نے پھر ایک آہ بھری ''یہی تو مشکل ہے۔ مجھے ان میں سے بڑی والی بھا گئی ہے۔ کیا کہوں کہ وہ میر کی غزل ہے یا خیام کی رباعی، درد کا کوئی قطعہ ہے یا غالب کے خطوط کی نثر نگاری.....'' میں مسکرادیا۔ ''تو پھر الجھن کیا ہے، پہلی فرصت میں گھر والوں کو اطلاع کردو کہ وہ آکر تمہارے لیے اس کا ہاتھ مانگ لیں'' شہریار جلدی سے بولا ''وہ ہے ہی کچھ ایسی، ابھی کچھ دیر پہلے تم نے فون پر اس کی آواز سنی تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔ لٹریچر تو جیسے وہ تمام کا تمام گھول کر پی چکی ہے، دنیا کا کون سا موضوع ہے، جس پر وہ بات نہیں کرسکتی، لیکن صرف فون پر، جیسے ہی وہ سامنے آتی ہے، سمجھو زبان کھو جاتی ہے اس کی'' ''تو کیا اسے پہلے پتا تھا کہ تمہارے ان کے ہاں ٹھہرنے کی اصل وجہ کیا ہے.....؟'' شہریار مسکرایا ''ہاں میرا خیال ہے کہ ڈیڈی نے انکل کو کچھ اشارہ ضرور دیا ہوگا اور خود انکل بھی اپنی اولاد سے بالکل دوستوں جیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ضرور اپنی دونوں بیٹیوں کو میری آمد کا مقصد بتادیا ہوگا۔ ان کے آپس میں شرارت آمیز اشارے تو یہی بتاتے ہیں، لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں اس سے تنہائی میں ایک بار مل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدھ بار ایسا موقع ملا بھی، تو میرے کان وہ سب کچھ سننے کے لیے ترستے ہی رہے، جو میں فون پر اس کی میٹھی زبان سے سنتا رہا ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فون پر دونوں بہنیں بہ یک وقت موجود ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو دونوں ہی زور سے ہنس بھی دیتی ہیں۔ مطلب انہوں نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھ سے بات کرتے وقت وہ دونوں ہی دوسری جانب لائن پر موجود ہوتی ہیں۔'' مجھے شہریار کی حالت دیکھ کر ہنسی آگئی۔ اس نے شکوہ کیا ''ہاں! تم بھی ہنس لو، اپنی صورت حال ہی کچھ ایسی ہے کہ آتے جاتے سب ہی ہماری کھلی اڑاتے ہیں۔'' میں نے اسے چھیڑا ''تم خوامخواہ کہانی کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکتے پھرتے ہو، ایک سنسنی خیز تجسس سے بھرپور کہانی تو خود تمہارے آس پاس چل رہی ہے۔'' شہریار نے قریب پڑا کشن اپنے سر کے پیچھے رکھا ''ٹھیک کہتے ہو، یہ تو خواتین کے کسی رسالے کے لیے پورے ایک ناول کا پلاٹ ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آئے مہینے بھر سے کچھ زیادہ ہونے کو آگیا ہے۔ اب مجھے اس سے ایک تفصیلی ملاقات میں بہت سے سوالوں کا جواب لینا ہے اور میرے پاس اس کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں ہے'' میں نے غور سے شہریار کی جانب دیکھا ''ویسے کیا تم نہیں سمجھتے کہ تم نے مجھے اپنی اس محبت کی کہانی میں شامل کرنے میں کچھ جلدی کی ہے۔ میں ابھی تک تمہارے لیے ایک اجنبی ہی تو ہوں'' شہریار مسکرایا ''ہم بھی لکھاری ہیں میاں! چلتے پھرتے کرداروں کے اندر تک جھانک لیتے ہیں۔ مانا کہ ہمیں ملے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں، لیکن تم میرے لیے پہلے لمحے کے بعد ہی اجنبی نہیں رہے تھے۔ تم وہ نہیں ہو، جس کا بھیس تم نے بھر رکھا ہے'' میں نے چونک کر اسے دیکھا ''اچھا.....؟ اتنی جلدی یہ نتیجہ کیسے اخذ کرلیا تم نے'' شہریار میری جانب ہی دیکھ رہا تھا ''کھانے کی میز پر زیادہ تر اٹالین اور چائنیز ڈشز موجود تھیں، اگرچہ تم نے چھری کانٹے کا استعمال، حتی الامکان کم سے کم کیا، لیکن تمہیں ان لوازمات کا استعمال کرتے دیکھ کر کوئی بھی باآسانی بتا سکتا ہے کہ تم وہ نہیں، جو دکھائی دیتے ہو۔'' میں نے حیرت سے شہریار کی طرف دیکھا۔ واقعی کمال کا مشاہدہ تھا اس کا، اتنی چھوٹی سی بات کا بھی اس نے کس قدر غور سے جائزہ لیا۔ میں نے اسے داد دی ''واہ بھئی..... مجھے نہیں پتا تھا کہ آج کل کے نئے لکھاری بھی اس قدر گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ تم نے مجھے متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی'' شہریار زور سے ہنسا ''تو پھر ہو جاؤ نا متاثر۔ کوئی تو ہمارا بھی فین ہو'' میں بھی ہنس پڑا۔ ''چلو تو پھر آج سے میں تمہارا پہلا پرستار ہوں، لیکن یہ بتاؤ کہ اب اس معمے کا کیا کرو گے، جس نے تمہاری راتوں کی نیند اڑادی ہے۔'' شہریار نے سر کھجایا ''معما تو حل کرنا ہی پڑے گا۔ انکل کی عادت ہے کہ وہ شام کی چائے سب کے ساتھ ہی کبھی لان میں، تو کبھی سن روم میں پیتے ہیں، ہوسکتا ہے کل تمہارا سامنا بھی ان دونوں سے ہوجائے، پھر تم ہی بتانا کہ فون پر اتنا اچھا بولنے والی، سامنے آتے ہی اس قدر خاموش کیوں ہوجاتی ہے'' شہریار بہت دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا، لہٰذا اگلی صبح مجھ سے فجر قضا ہوگئی۔ آنکھ کھلی تو سر بھی بہت بھاری ہو رہا تھا۔ نوکر نے مجھے کمرے سے نکلتے دیکھ کر جلدی سے ناشتا میز پر لگادیا۔

کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے اسپتال چھوڑ آیا۔ شیخ صاحب دوسری گاڑی میں صبح سویرے ہی کسی ضروری کام سے نکل چکے تھے، البتہ ڈرائیور کو ہدایت کر گئے تھے کہ مجھے شام چار بجے کے قریب گھر واپس لیتا آئے۔ میرے ذہن میں شہریار کی رات والی بات گونجی۔ سلطان بابا کی حالت آج کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ دوپہر بارہ بجے تک ان کے تمام ضروری معائنے بھی ہوگئے، جن کی رپورٹ کل ملنا تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گھر واپس بھیجنے کی بات کی، تو انہوں نے منع کردیا کہ اگر شیخ صاحب نے کہا ہے تو پھر میں شام کو گھر سے ہو آؤں، پھر چاہے تو رات گئے تک اسپتال میں ان کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔ میں ساڑھے چار بجے ڈرائیور سمیت گھر واپس پہنچا، تو دربان نے بتایا کہ شیخ صاحب لان میں میرا انتظار کررہے ہیں۔ شام کی چائے پر شہریار اور ان کا چھوٹا بیٹا وقار بھی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں چائے لگادی گئی۔ اتنے میں اندر سے جدید وضع قطع کے لباس میں ایک شوخ سی لڑکی نکلی۔ شیخ صاحب نے تعارف کروایا ''عبداللہ میاں! یہ ہماری بڑی صاحب زادی ہیں، شاہانہ..... ہماری شانی'' میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ شانی کے پیچھے پیچھے ایک اور سیدھی سادھی، بیچ کی مانگ نکالے سانولی سلونی سی لڑکی بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہماری جانب آگئی۔ وہ شاہانہ کی بالکل الٹ دکھائی دیتی تھی۔ سادہ سا کرتا پاجامہ، لمبی سی چٹیا بنائے، وہ اس ماحول سے یک سر مختلف نظر آئی۔ شیخ صاحب نے پھر تعارف کروایا ''اور بھئی..... یہ ہیں ہماری چھوٹی صاحب زادی دھانی.....''

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

.....☆ہاشم ندیم☆.....

اگر ان دونوں کا تعارف خود شیخ صاحب نہ کرواتے، تو شاید میں کبھی انہیں سگی بہنیں نہ مانتا، ان دونوں کے برتاؤ، چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں مشرق و مغرب جتنا فاصلہ اور دن اور رات جیسا فرق تھا، البتہ خود اعتمادی دونوں میں یکساں اور بلا کی تھی۔ چائے کے دوران دونوں بہنوں نے مجھ سے سلطان بابا کی طبیعت کا پوچھا اور اپنی اور شیخ صاحب کی جانب سے خواہش ظاہر کی کہ جب وہ بہتر ہو جائیں، تو کچھ دن ان سب کے ساتھ یہیں ان کے گھر پر قیام کریں۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ میں ان کی فرمائش ضرور سلطان بابا تک پہنچا دوں گا۔ شہریار کی تمام توجہ شاہانہ پر تھی، مگر نہ جانے کیوں، وہ چائے پینے کے دوران بھی کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ میں چائے ختم کر کے شیخ صاحب کی اجازت سے دوبارہ اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ باقی سب بھی اٹھ چکے تھے۔ شہریار نے مجھ سے کہا کہ وہ رات کے کھانے پر میرا انتظار کرے گا۔ میں اسپتال پہنچا، تو سلطان بابا کے کمرے میں تین چار سینئر ڈاکٹروں کا جمگھٹا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ نرس نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک ڈاکٹر کمرے سے نکل نہ جائیں، میں بیرونی کمرے میں انتظار کروں۔ دس منٹ کا وہ مختصر عرصہ، مجھ پر دس صدیوں جیسا بھاری گزرا، پھر جیسے ہی پہلے ڈاکٹر نے باہر قدم رکھا، میں تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ ''سب ٹھیک تو ہے نا ڈاکٹر صاحب۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔ ''اوہ ہاں..... ڈونٹ وری، بس معمول کا چیک اپ تھا۔ اب آپ لوگوں سے اسپتال والوں نے اتنی فیس لی ہے، تو ہمیں بھی کچھ سرگرمی تو دکھانا پڑے گی نا۔'' اُن کی بات سن کر میں بھی مسکرا دیا۔ طبیب کے پاس مریض کے لیے دوا اور اس کے تیمارداروں کے لیے مسکراہٹ سے بڑھ کر اور بھلا کیا سوغات ہوگی۔ خوش دلی اور اخلاص سے بھری ایک مسکان کی خود اپنی ایک مسیحا گری ہوتی ہے اور بہت سے گھائل تو ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا فقط علاج ہی بس ایک مسکراہٹ ہوتی ہے اور اس لمحے مجھے بھی یہ احساس ہوا کہ طب کے شعبے میں شاید دوا سے بھی زیادہ اور پہلی ضرورت خوش اخلاقی ہے۔ سلطان بابا اپنے بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے بولے۔ ''میں نے کہا تھا ناں کہ اسپتال میں بندہ داخل تو اپنی مرضی سے ہوتا ہے، لیکن پھر اُس کی ''رہائی'' ان ڈاکٹروں کی مرضی ہی سے ہو پاتی ہے۔ اب یہ روز بہ روز نئی محبتیں تراشیں گے، مجھے یہاں روکنے کے لیے.....'' مجھے ان کی ''رہائی'' والی اصطلاح پر ہنسی آ گئی۔ ''ہاں..... ابھی باہر جو ڈاکٹر صاحب ملے تھے، وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ پیسے لیے ہیں تو انہیں حلال بھی تو کرنا ہے۔'' میری بات سن کر بابا بھی مسکرا دیے۔ ''ٹھیک ہے میاں! کر لو اپنی ضد پوری، لیکن یاد رہے..... جب جب جو جو ہونا ہے، تب تب سو سو ہوتا ہے۔'' میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا، ہر بار کی طرح ان کا یہ مخصوص جملہ ایک بار پھر میرے اندر سب کچھ تلپٹ کر گیا۔ اب تو مجھے اس جملے سے باقاعدہ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، کیوں کہ سلطان بابا نے جب بھی اسے ادا کیا، کوئی نہ کوئی ان ہونی ضرور پیش آئی۔ میرے لبوں سے آخر بہت دیر سے اٹکا سوال پھسل ہی پڑا۔ ''آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے، پھر آپ اپنے لیے شفایابی کی دعا کیوں نہیں کرتے۔ کال گڑھ میں آپ کو جو شدید چوٹ لگی، آپ نے اس سے بچاؤ کی دعا پہلے سے کیوں نہ کی؟'' وہ میرا سوال سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، جیسے میں نے قبل از وقت کوئی بات پوچھ لی ہو۔ کچھ دیر بعد خاموشی توڑی اور کہا۔ ''میں ہمیشہ اپنے لیے، تمہارے لیے، بلکہ سب کے لیے یکساں دعا مانگتا ہوں۔ سب کے لیے اللہ سے اُس کا فضل، کرم طلب کرتا ہوں اور ہر اس خواہش کا اظہار کرتا ہوں، جس کی تکمیل میں ہم سب کی بہتری ہو..... لیکن یاد رہے، بہتری کس بات میں پوشیدہ ہے، اس کی خبر تو بس اُسی کو ہے۔ جانے اس سر کی چوٹ اور پھر یہاں اسپتال تک پہنچنے میں اُس کی کون سی مصلحت پوشیدہ ہے۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر، بہت قریبی نتائج پر نظر رکھنے والے پیدا کیے گئے ہیں، لہٰذا نتائج کی پروا ہمیشہ اسی پر رکھ چھوڑنی چاہیے..... رہی بات خود اپنے جسم کو گھائل ہونے سے بچانے کے لیے دعا کرنے کی، تو یاد رکھو، اس جسم کی اپنی کچھ حدیں ہیں اور موت ان جسمانی حدوں کو پار کر جانے کا نام ہے۔ یہ جسم دنیا کی سب سے فانی شئے ہے۔ اس دور میں اس بدن کے عروج اور پھر زوال کا دورانیہ اوسطاً ساٹھ سے ستر سال کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کلیے سے میرا جسم اپنی عمومی مدت پوری کر چکا ہے۔ میں ستر کے عدد کو چھونے والا ہوں اور اس دوران میرے جسم میں موجود خون کے خلیے، میری رگیں، پٹھے اور جسم کے بنیادی اعضا اپنی عمومی مشقت پوری کر چکے ہیں، اب ان اعضا کے ساتھ میرے جسم کا جو بھی برتاؤ ہے، وہ خصوصی ہوگا۔ یہاں ایک بات اور دھیان میں رکھنے کی بہت ضرورت ہے کہ موت کا تعلق کبھی براہِ راست جسم کے زوال سے نہیں ہوتا۔ موت جسم میں موجود روح کے نکلنے کا نام ہے، جو نکلتے نکلتے سو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ لے سکتی ہے اور بہت سے ایسے انسان ہمارے آس پاس موجود ہیں، جو اپنے جسم کے اس خصوصی رویے کی وجہ سے بہ آسانی اتنی عمر کا سفر بھی طے کر لیتے ہیں، جبکہ بعض حادثاتی صورتوں میں بیس بائیس سال کے جوان جسم سے بھی روح پل بھر میں نکل جاتی ہے، تو ثابت یہ ہوا کہ جسم کی اپنی بھی ایک خاص میعاد اور مدت ہے، وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں..... ایکس پائیری ڈیٹ، جو کسی حادثے کی صورت میں فوراً اور طبعی مدت پوری کرنے کی صورت میں ساٹھ سے ستر سال کے اندر ہمارے جسم کو اس حال تک پہنچا دیتی ہے کہ جہاں ہماری روح کا اس بدن میں مزید قیام مشکل ہو جاتا ہے۔'' میں غور سے سلطان بابا کی بات سن رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک بہت بڑا اسرار میرے ذہن کے دریچوں سے اندر آتے آتے واپس پلٹ گیا، جیسے کچھ سمجھ میں آنے سے پہلے ہی سب کچھ آپس میں الجھ گیا ہو۔ سلطان بابا نے کچھ وقفے کے بعد بات جاری رکھی۔ ''اسی لیے ہمارے معاشرے میں عام طور پر لوگ اپنے جسم کے اس عمومی رویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے دینی اور دنیاوی معمولات کا خاکہ بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ایک عام رویے کا انسان چالیس پینتالیس سال کی عمر کے بعد مذہب کو زیادہ وقت دینے لگتا ہے، کیوں کہ اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات دبی ہوتی ہے کہ عمر کی آخری دھائیاں شروع ہو چکی ہیں، تو بہتر ہے کہ اب اوپر والے کو بھی راضی کر لیا جائے۔ واضح رہے کہ بچپن، لڑکپن، جوانی اور پھر بڑھاپا، یہ تمام کیفیات بھی صرف ہمارے جسم ہی پر وارد ہوتی ہیں۔ ان کا ہماری روح سے کوئی تعلق نہیں، البتہ روح کا برتاؤ ہماری ان جسمانی تبدیلیوں پر منحصر ہے۔ تقدیر وہ وقت طے کرتی ہے، جب ہماری روح کو ہمارا یہ جسم چھوڑنا ہوتا ہے اور پھر کوئی نہ کوئی بہانہ، بیماری، چوٹ، حادثہ یا سادہ طبعی موت اس روح اور جسم کی دائمی جدائی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی ہمارا ایمان ہے کہ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور پھر موت کے بعد اسے روزِ حشر پھر سے دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور تب ہماری زندگی کا دوسرا اور اصل دور شروع ہوگا، اس لیے ہمیں اس دنیا کے لیے اسی قدر محنت کی تاکید کی گئی ہے، جتنا ہمیں یہاں رہنا ہے۔'' سلطان بابا اپنی بات ختم کر چکے تھے، لیکن میرا ذہن حسبِ معمول کچھ نئے سوالوں میں الجھتا چلا گیا۔ تو کیا ہماری معصوم روح، صرف ہمارے جسم کے کیے گئے گناہوں کی سزا بھگتتی ہے؟ کیا گناہ اور ثواب کا اختیار صرف ہمارے ایک بنیادی عضو ''ذہن'' کی کارستانیوں کا شاخسانہ ہے.....؟

رات آٹھ بجے نرس نے دوبارہ آکر مجھے کل والی بات کی یاددہانی کروائی کہ تیمارداروں کو رات گزارنے کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب خود بھی آپہنچے اور پندرہ منٹ سلطان بابا کے ساتھ بیٹھنے کے بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم نے اسپتال کے اصولوں کے مطابق روانگی اختیار کرلی۔ شیخ صاحب نے راستے میں بتایا کہ آج نصیر صاحب نے انہیں فون کرکے سلطان بابا کی تفصیلی خیریت معلوم کی تھی اور مجھے نہ جانے کیوں، ان کی باتوں سے کچھ ایسا محسوس ہوا، جیسے آئی۔ جی صاحب نے انہیں کچھ میرے بارے میں بھی بتایا ہے اور شاید وہ یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ اسپتال کی ادائیگی بھی میرے گھر والوں کی طرف سے کی گئی ہے۔ بہرحال، انہوں نے مصلحتاً اس موضوع کو چھیڑنے سے گریز ہی کیا اور مجھے ایک بڑی مشکل سے بچالیا، کیوں کہ اب میں کسی بھی طور اپنے روایتی حسب نسب اور ماضی کے کسی بھی حوالے کو اپنی ذات کا تعارف نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے، تو ان کا چھوٹا بیٹا وقار کار پورچ سے ذرا پرے، اپنی ڈی ٹی ایس ہیوی بائیک کی ریس چیک کرنے کے لیے اس کے پچھلے پہیے کو اسٹینڈ کے ذریعے اونچا کرکے ہائیڈرولک جیک لگا رہا تھا۔ پورے گھر میں موٹر سائیکل کی تیز آواز نے ہنگامہ سا برپا کر رکھا تھا۔ میں ایک لمحے ہی میں ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو کر، خود اپنے گھر کے احاطے میں پہنچ گیا اور چند پل ہی میں وقار کی جگہ پرانے ساحر نے لے لی۔ ہر اتوار کو میں اور کاشف میرے ہی گھر میں، اپنی اپنی بائیکس کھول کر اسی طرح ان کی صفائی کیا کرتے تھے اور پورا گھر سر پر اٹھائے رکھتے۔ وہ دن گھر کے تمام نوکروں کی شامت کا دن ہوتا، کیوں کہ ہمیں ہر دوسرے پل کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی اور نہ ملنے پر یا دیر سے لانے پر کوئی نہ کوئی نوکر ہمارے عتاب کا شکار بن کر ہی رہتا۔ پھر شام کو جب پاپا گھر واپس آتے تو ان کی عدالت میں ہماری شکایتیں لگتیں اور کبھی مجھے اور کبھی کاشف کو جرمانہ بھرنا پڑتا۔ یہ وقت بھی کیسی کیسی کروٹیں بدل جاتا ہے۔ کاش ہمارا حافظہ بھی گزرتے وقت کی کروٹ کے ساتھ ساتھ کسی سلیٹ کی طرح صاف ہوتا رہتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجھے اپنی جگہ رکا دیکھ کر شیخ صاحب آگے جاتے جاتے واپس پلٹ آئے۔ ”کیوں عبداللہ سب ٹھیک تو ہے نا.....“ میں جلدی سے سر جھٹک کر اپنی دنیا میں واپس آیا اور آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب نے نوکروں سے کہا کہ وہ تازہ دم ہو کر انیکسی ہی میں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے، میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم وقار کی جانب بڑھنے سے نہیں روک پایا۔ اس نے ہائیڈرولک تیل کی لمبی گلاس نما کُپی اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور پچھلے پہیے کی ڈسکس میں بنے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں تیل ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر اس نے ایکسیلیٹر چھوڑ دیا، لیکن پہیہ اب بھی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں نے تیل کی کُپی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ”جب تک پہیہ مکمل طور پر رک نہ جائے اور بائیک کا انجن ٹھنڈا نہ ہوجائے، تیل نہ دینا، ورنہ یہ آئل صرف پہیے کی ڈسک تک محدود نہیں رہے گا، پورے انجن میں پھیل جائے گا، پھر کئی دن تک بائیک بار بار چوک ہوتی رہے گی.....“ وقار کھلے منہ کے ساتھ حیرت سے میری بات سنتا رہا، پھر اس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اوہ! تو یہ وجہ تھی کہ بائیک پوری ریس نہیں اٹھا رہی تھی اور میں پچھلے تین دنوں سے سر کھپا رہا ہوں اور ڈسک کو جام سمجھ کر تیل دیے جا رہا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر آئل کی بوتل اسے واپس کردی۔ وقار بھی جلدی سے ہاتھ پونچھ کر میرے ساتھ ہی انیکسی کی طرف چلنے لگا اور اپنی بائیک کے بارے میں بتانے لگا کہ ابھی دو ماہ پہلے ہی اس کے ڈیڈ نے اسے یہ بائیک لے کر دی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہر ہدایتی کتابچہ (Manual guide) نہیں ملا، کیوں کہ بائیک سمندر کے ذریعے کھلے بحری جہاز پر پہلے پورٹ اور پھر یہاں تک پہنچی تھی، لہٰذا بہت سے ضروری لوازمات بھی غائب تھے۔ انہی باتوں کے دوران شیخ صاحب بھی پہنچ گئے، لیکن آج شہریار نہ جانے کہاں غائب تھا۔ نوکر نے بتایا کہ وہ شام کو کسی دوست کے ہمراہ کہیں باہر نکل گیا تھا، لیکن کھانا لگنے تک شہریار بھی پہنچ گیا۔ وقار بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگیا۔ اب تک وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہوچکا تھا پھر کھانا کھاتے کھاتے اچانک ہی وہ پوچھ بیٹھا..... ”عبداللہ بھائی، کیا آپ مولوی ہیں.....؟“ شیخ صاحب نے اسے گھور کر دیکھا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ”ہاں، لیکن جیسے نیم حکیم ہوتے ہیں، ویسے ہی میں فی الحال آدھا مولوی ہوں۔“ وقار اور شہریار بھی مسکرا دیے۔ وقار کی کچھ ہمت بندھی۔ ”آپ کے گھر والے کہاں رہتے ہیں۔ آپ کو ان کی یاد نہیں آتی؟“ شیخ صاحب نے اسے ڈانٹا ”وقار! یہ کیا بدتہذیبی ہے؟“ میں نے شیخ صاحب کو روک دیا۔ ”کوئی بات نہیں، اسے پوچھنے دیں۔ ہاں تو بھئی میرے گھر والے تو یہاں سے بہت دور رہتے ہیں اور مجھے ان کی یاد بھی بہت آتی ہے۔“ ”تو پھر آپ کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے، جب ان کی بہت یاد آتی ہے۔ کیوں کہ میں تو اپنے گھر سے ایک رات بھی دور نہیں رہ سکتا۔“ ”رہ تو میں بھی نہیں سکتا تھا، پر کیا کروں، میرا کام ہی ایسا ہے ناں، البتہ جب گھر والے بہت یاد آتے ہیں، تو تھوڑا سا رو لیتا ہوں۔ اس طرح دل کچھ بہل جاتا ہے۔“ وقار زور سے ہنس پڑا۔ ”ارے، آپ روتے بھی ہیں، لیکن آپ تو مجھ سے بھی بڑے ہیں۔“ ”تو کیا ہوا، بڑے روتے نہیں کیا؟ میں تو سمجھتا ہوں، بڑوں کو چاہے چھپ کر ہی سہی، چھوٹوں سے زیادہ رونا چاہیے۔ اس طرح ان کا دل کبھی سخت نہیں ہوگا۔ میری مانو تو تم بھی ابھی سے پریکٹس شروع کردو۔ ہر غم کا ڈر دل سے نکل جائے گا۔“ اب شیخ صاحب اور شہریار بھی ہماری اس ”معصوم“ بحث سے لطف اندوز ہونے لگے۔ وقار نے جھجکتے ہوئے اپنے دل کا ایک اور شک زبان سے اگل دیا۔ ”آپ تو ہم جیسے ہی ہیں، لیکن شام کو شاہانہ باجی کہہ رہی تھیں کہ جو لوگ یوں اپنا گھر بار چھوڑ کر اس راستے پر نکل آتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔“ شیخ صاحب کے ہاتھ سے کانٹا چھوٹ گیا۔ شہریار نے بھی چونک کر اوپر دیکھا۔ شیخ صاحب غصے سے بولے۔ ”وقار، مائنڈ یور اون بزنس“ میں نے ہاتھ اٹھا کر شیخ صاحب کو روکا۔ ”تم انتہا پسندی کسے کہتے ہو.....؟“ وقار کچھ ہچکچایا۔ ”وہی جو لوگ زبردستی اپنی منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا۔ ”دیکھو! یہ پانی کا گلاس تقریباً بھرا ہوا ہے۔ اس کے سانچے میں جتنی گنجائش تھی، اتنا پانی اس میں موجود ہے۔ اگر میں اس گلاس میں مزید پانی ڈالوں گا تو وہ چھلک کر میز پر گر جائے گا اور اس سے تمہیں، تمہارے ابو اور شہریار کو پریشانی ہوگی۔ بالکل اسی طرح، جیسے تمہاری ڈی۔ ٹی۔ ایس بائیک کی رفتار کی حد ایک سو اسی کی ہے؟ لیکن اگر شہر کی عام سڑکوں پر تم اسے ساٹھ، ستر کی رفتار سے زیادہ چلاؤ گے، تو لوگ ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگیں گے۔ ہوسکتا ہے، تم کسی کو زخمی بھی کر بیٹھو۔ بس یہی انتہا پسندی ہے۔ ہر وہ حد، جس سے گزر کر تم دوسرے انسانوں کے لیے کسی بھی طرح کی پریشانی کا باعث بن جاؤ، وہ انتہا پسندی ہے۔ ہم نے آج کل اس صفت کو نہ جانے کیوں، صرف مذہب ہی سے وابستہ کردیا ہے۔ انتہا پسندی ایک رویے کا نام ہے، تم اپنی حد سے بڑھ کر بائیک دوڑا کر بھی انتہا پسند بن سکتے ہو۔ شہریار تیز ہارن بجا کر بھی اس فہرست میں شامل ہوسکتا ہے۔ شیخ صاحب دن میں آٹھ گھنٹے کے بجائے بیس گھنٹے اپنے کاروبار پر صرف کرکے بھی انتہا پسند کہلا سکتے ہیں، لیکن میرا راستہ تو میری اپنی کھوج کا ہے۔ میں کچھ سیکھنے کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔ میرا مقصد اپنے نظریات کسی پر مسلط کرکے اسے پریشان کرنا نہیں ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ابھی تک صرف مختلف نظریات کو جانچنے اور پرکھنے کی حد تک ہی محدود ہوں۔ جانے اس مختصر زندگی میں، مذہب کی بنیادی باتوں سے کچھ آگے بھی بڑھ پاؤں گا یا نہیں۔ کسی انتہا تک جانا تو بہت دور کی بات ہے۔ ویسے بھی مذہب ہمیں ہر چیز میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے، حتیٰ کہ خود عبادت میں بھی اسی اعتدال کو مدنظر رکھنے کا حکم ہے، تو پھر بھلا مذہب ہمیں کسی بھی انتہا پسندی کی طرف کیسے لے جاسکتا ہے.....؟“

میری بات ختم ہونے کے بعد بھی کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر میں نے خود ہی وقار سے پوچھا کہ کوئی اور سوال تو اس کے ذہن کو پریشان نہیں کر رہا؟ وہ خوش دلی سے مسکرا دیا ”نہیں عبداللہ بھائی..... میں آپ کی باتیں سننے سے پہلے واقعی ایسے لوگوں سے بہت کتراتا تھا، لیکن آج آپ نے مجھے احساس دلایا ہے کہ شاید ہم خود ہی مذہب کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ مذہب ہمیں کبھی اس طرف نہیں دھکیلتا۔ ہمیں خود اپنے رویوں پر قابو پانا ہوگا۔“ شیخ صاحب کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے خوش ہوکر بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔ شہریار بھی مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کھانے کے بعد بھی بہت دیر تک ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے شہریار سے عشاء کی نماز کے لیے مہلت طلب کی۔ ”ٹھیک ہے جناب، لیکن نماز پڑھتے ہی میرے کمرے میں چلے آنا۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ میں نے ہنس کر اسے دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں تمہاری ضروری باتوں کا دائرہ کہاں تک محدود ہوگا، تم چلو میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔“ نماز کے بعد میں شہریار کے کمرے میں داخل ہوا، تو کمرا نیلگوں دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے ادھ جلے سگریٹ راکھ دان میں اب بھی سلگ رہے تھے، کچھ لمحوں کے لیے تو میرا دم ہی گھٹ سا گیا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے لگاتار سگریٹ نوش ہوگے۔“ شہریار نے جلدی سے اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ ”نہیں..... ہر وقت اتنی سگریٹ نہیں پھونکتا۔ بس کبھی کبھی ذہن کسی پلاٹ یا نکتے پر الجھ جائے، تو پھر یہ نکوٹین ہی میری سوچوں کی رکی ہوئی گاڑی کو آگے دھکیلتی ہے۔“ ”مجھے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کڑوا دھواں تم جیسے

لکھاریوں کے اندر جا کر ایسا کیا جادو کرتا ہے کہ لفظ اور خیال آنسوؤں کی طرح باہر ٹپکنے لگتے ہیں؟'' شہریار زور سے ہنسا'' پتا نہیں، ہوسکتا ہے اندر جا کر یہ دھواں، اُن کا بھی دم گھوٹتا ہو، تو خیال باہر کو لپکتے ہوں، کیا تم بالکل بھی سگریٹ نہیں پیتے.....'' مجھے اپنے ماضی کی شامیں، کلب اور ان میں بھرا دھواں یاد آ گیا ''کبھی پیتا تھا، دن میں ایک آدھ پیکٹ بھی پھونک جاتا تھا۔ اب نہیں پیتا، تم یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا خیال اٹک گیا ہے تمہارے اندر، جسے اس دھوئیں سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہو؟'' شہریار نے گہری سی سانس لی، لیکن جواب دینے کے لیے اس کے لب کھلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شہریار نے جلدی سے فون اٹھالیا۔ دوسری جانب سے شاید کسی نے سلام کیا۔ شہریار نے جواب کے بعد کہا'' زہے نصیب..... کہیے، آج کون سا امتحان لیں گی ہمارا.....؟'' میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا، لیکن شہریار نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھالیا۔ مجھے ان کی گفتگو کے دوران وہاں بیٹھنا کچھ معیوب سا لگ رہا تھا، لیکن شہریار نے میرا دوسرا اشارہ بھی نظر انداز کر دیا اور دوسری جانب کی بات سن کر کہا۔'' اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم کچھ دیر بعد بات کریں۔ دراصل میرے کمرے میں ایک مہمان دوست ہے۔'' دوسری جانب کی بات سن کر شہریار نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔'' چلیں ٹھیک ہے، کل بات کریں گے اور ہاں آپ کے سوال کا جواب ادھار رہا۔'' فون رکھ کر وہ میری جانب پلٹا۔'' کافی چلے گی.....؟'' ''نہیں! میری کیفین سے کچھ زیادہ بنتی نہیں۔ تم نے خواہ مخواہ فون بند کر دیا۔ ہوسکتا ہے، وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو ویسے بھی جانے ہی والا تھا۔'' شہریار کسی گہری الجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔'' پتا نہیں کیوں، تم سے ہر الجھن بانٹنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر رائٹرز ویسے بھی بہت کھلے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ جو بھا جائے، وہی اپنا پن جاتا ہے۔'' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔'' تم کچھ الجھے ہوئے سے لگتے ہو؟'' ''ہاں..... ایک عجیب سی بات ہے، شاید میرا وہم ہی ہو، لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ شانی جس طرح کھل کر ہر موضوع پر مجھ سے فون پر بات کرتی ہے، سامنے آنے پر وہ اس کے بالکل برعکس چپ سی نظر آتی ہے۔ پہلے پہل تو میں اسے روایتی شرم و حیا کے زمرے میں تولتا رہا، لیکن ایک آدھ مرتبہ ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع بھی ملا، تو وہ بس ہوں، ہاں ہی کرتی رہی۔''

میں غور سے اس کی بات سنتا رہا۔'' تم ایک لکھاری ہو۔ لفظ تمہارے آس پاس عقیدت سے دوزانو ہوئے بیٹھے رہتے ہیں، لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی تمہاری طرح گفتگو کے فن میں طاق ہو۔ ہوسکتا ہے، اسے خاموشی کی زبان زیادہ بہتر لگتی ہو۔ ویسے بھی یہ لڑکیاں چپ رہ کر زیادہ بولتی ہیں۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے کہ'' تخلیے کی باتوں میں، گفتگو اضافی ہے۔'' تو ہوسکتا ہے، اسے بھی یہ لفظ غیر ضروری اور اضافی محسوس ہوتے ہوں۔'' شہریار اب بھی بے چین تھا۔'' ہاں! ایسا بھی ہوسکتا ہے، لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ لفظ ہی تھے، جو ہمیں اتنا قریب لانے کا باعث بنے۔ اسے یہ بھی پتا ہے کہ اچھے لفظ اور ان سے بنے اَن چھوئے خیالات ہی میری کمزوری ہیں۔ پھر بھی وہ بولنے میں اس قدر احتیاط، بلکہ کنجوسی کا مظاہرہ کیوں کرتی ہے.....؟'' ''یہ سوال تم نے شانی سے کیوں نہیں پوچھا۔'' ''پوچھا تھا، اُس نے بھی کم و بیش وہی تمہارا جواب دُہرا دیا کہ تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔'' اس رات شہریار نے مجھے تفصیل سے شیخ صاحب کے خاندان کے بارے میں بتایا کہ ان کا بڑا بیٹا امجد اور چھوٹی بیٹی دھانی نقش و نگار کے معاملے میں اپنے باپ پر گئے ہیں، جب کہ بڑی بیٹی شاہانہ اور چھوٹا بیٹا وقار اپنی مرحومہ ماں کے حُسن اور رنگ و روپ سے جڑے ہوئے تھے، اسی لیے شانی اور دھانی کے نقش اس قدر مختلف تھے، لیکن اس چہرے اور دھوپ چھاؤں جیسے رنگ کے فرق سے قطع نظر، شیخ صاحب کی تمام اولاد میں بے حد ایکا اور محبت تھی۔ خاص طور پر دونوں بہنیں، تو جیسے ایک جان دو قالب تھیں، البتہ شانی کے مقابلے میں دھانی اپنے باپ سے زیادہ جڑی ہوئی تھی۔ اس کا نام بھی شیخ صاحب نے دھان کی فصل کی کٹائی کے وقت اس کی پیدائش پر رکھا تھا۔ سنا ہے اس سال شیخ صاحب کی گاؤں والی زمینوں پر چاول کی فصل نے برسوں کے ریکارڈ توڑ دیے تھے، اور پھر دھانی جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، دھانی رنگ بھی اس کی شخصیت کا ایک حصہ بنتا گیا۔ اسکول میں دھانی رنگ کے واٹر کلر، پینسلیں، پھر کالج بیگ اور پھر یونیورسٹی میں لباس میں دوپٹے، ہاتھ کی چوڑیاں، ہیئر بینڈ یا پھر پرس..... کوئی ایک چیز دھانی ضرور ہوتی تھی۔ یہی حال گھر کی کٹلری، پردوں اور صوفوں کی کلر اسکیم، حتیٰ کہ اس کے اپنے کمرے کے رنگ اور اس کی اپنی شخصیت پر بھی حاوی تھا۔ وہ خود بھی اس رنگ جیسی پُرسکون، ٹھہری ہوئی اور ساکت تھی، البتہ شانی اس کے برعکس تیز گلابی رنگ جیسی تھی۔ شوخ، چلبلی اور تھرکتی ہوئی۔ پورا گھر اس کی وجہ سے حرکت میں رہتا تھا۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتی تھی، نہ ہی کسی کو زیادہ دیر تک بیٹھے رہنے دیتی تھی۔ دونوں بہنوں کے ان مزاجوں کے فرق ہی نے دراصل شیخ صاحب کے گھر کے توازن کو ایک خوب صورت انداز میں برقرار رکھا ہوا تھا۔ بیٹے بھی باپ کے فرماں بردار تھے، البتہ گھر کا تمام انتظام بہنوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شہریار آیا تو کسی کہانی کی تلاش میں تھا، لیکن شیخ صاحب کے ہاں مہمان ہوتے ہی وہ خود ایک کہانی کا حصہ بنتا گیا۔ اس کا استقبال کرنے والی دھانی تھی، جس نے اپنے گھر کے گیٹ پر اسے خوش آمدید کہا، لیکن..... جس نے شہریار کے دل کے گیٹ پر پہلی دستک دی، وہ شانی تھی، لیکن یہ سب کچھ ایک دم ہی نہیں ہوگیا۔ پہلے تعارف میں تو کوئی بھی شاہانہ کے ملکوتی حُسن سے متاثر ہوسکتا تھا، لیکن شہریار کو شانی کی دستک سننے میں دو ہفتے سے بھی زیادہ لگ گئے۔ انیکسی میں وہ اس کی دوسری رات تھی، جب فون کی گھنٹی پہلی بار بجی۔ دوسری طرف جو بھی تھی، اس نے اپنا نام نہیں بتایا، بلکہ یہ کسوٹی بھی اس نے شہریار ہی پر چھوڑ دی کہ یہی اسے پہچانے کہ وہ کون ہے، کیوں کہ یہ دعویٰ بھی تو شہریار ہی کا تھا کہ لکھاری لوگوں کی آنکھوں سے ان کے دل کا حال جاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور شہریار کو اگلے روز ہی شانی کی آنکھوں میں چھپا وہ گلابی پیغام دکھائی دے گیا، جو شاید پہلے ہی دن سے اس کی گھنیری پلکوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا، لیکن شہریار نے مزید کئی دن لیے، رات والی اس آواز کو اس کی پہچان بتانے میں۔ شاہانہ کو خوشی ہوئی کہ اس کی نظروں کا پیغام شہریار کے دل تک پہنچنے میں کام یاب ہوگیا۔ پھر راتوں کے فون کی یہ شہرزاد، کچھ ایسی شروع ہوئی کہ لفظوں کی دنیا میں رہنے والا شہریار جیسا لفظ گر بھی، ان ملائم لفظوں اور کومل جذبوں کا شکار ہوتا چلا گیا، جو دیر رات گئے تک وہ فون پر اس کی سماعتوں میں انڈیلتی تھی۔ وہ دونوں دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ شہریار اسے اپنے افسانوں کے موضوعات پر بحث کی دعوت دیتا اور اس سے ایک قاری کے طور پر پہلی رائے بھی لیتا، لیکن مسئلہ وہاں سے جڑ پکڑنے لگا، جب ایک آدھ مرتبہ شہریار کو شانی سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ فون پر شاہانہ کی منفرد سوچ اور گفتگو میں الفاظ کے نئے زاویوں کی عکاسی سن سن کر خود بھی ایسے کسی موقع کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا، پہلی مرتبہ اس وقت یہ ملاقات ہوئی، جب تمام گھر والے کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور شام کی چائے پر باغ میں وہ اور شاہانہ تنہا تھے اور دوسری مرتبہ تب، جب شیخ صاحب کو کسی ضروری کام کے سلسلے میں اچانک ڈرائیور سمیت شہر سے باہر جانا پڑا اور شہریار گھر کی دوسری گاڑی میں شاہانہ کو اس مقام سے گھر واپس لے کر آیا، جہاں سے مقررہ وقت پر ڈرائیور نے اسے لانا تھا، لیکن شہریار کے تشنہ کان شانی کے لبوں سے کچھ سننے کی آرزو ہی کرتے رہے اور وہ بس چھوٹے چھوٹے جملوں میں'' ہوں، ہاں'' کر کے شہریار کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ اسی بات نے شہریار کو الجھا رکھا تھا، حالاں کہ وہ در پردہ اپنے خاندان کو شاہانہ کے لیے اپنی رضامندی سے بھی آگاہ کر چکا تھا، لیکن وہ ایک مرتبہ شانی سے کھل کر بات کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھا، کیوں کہ اگلے ماہ اس کے گھر والے باقاعدہ اس پری رخ کو شہریار کے لیے مانگنے آ رہے تھے اور شاید شہریار کے والد اس سلسلے میں شیخ صاحب کو بھی شہریار کی مرضی سے آگاہ کر چکے تھے۔ شہریار نے غالباً اپنے پانچویں پیکٹ کے آخری سگریٹ کو راکھ میں تبدیل کیا ہی تھا کہ باہر سے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

میں شہریار کو تسلی دے کر جب اپنے کمرے میں آیا، تو میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال دھیرے دھیرے گھر کرنے لگا تھا۔ شہریار کی نظر شاہانہ ہی پر کیوں ٹکی؟ دھانی بھی تو اسی گھر ہی میں رہتی تھی۔ ہماری نظر ہمیشہ روشن اور اجلے چہروں ہی میں کیوں الجھتی ہے۔ یہ خوب صورتی کیا بلا ہے؟ اگر یہ دیکھنے والی نظر ہی پر منحصر ہوتی ہے، تو پھر ہماری نظر عام چہروں پر کیوں نہیں رکتی؟ ہمارا دل کسی سادہ چہرے کے لیے بھی پہلی ہی جھلک میں اس طرح کیوں نہیں دھڑکتا، جیسے وہ کسی ماہ وش کی پوری پلکیں گرنے سے پہلے ہی اس کے لیے دوزانو ہو چکا ہوتا ہے، تو پھر کہیں یہ قدرت کی بے انصافی تو نہیں کہ اس نے کچھ آئینے تو اتنے شفاف اور کچھ ہلکے دھندلے بنا ڈالے اور اگر چہروں اور رنگ و روپ میں یہ تفریق پیدا کرنی اتنی ہی ضروری تھی، تو پھر ہماری نظر اور ہمارے دلوں میں یہ فرق نہ ڈالا ہوتا، کیوں ہمارے سدا کے سودائی اور پاگل دل کو ان شفاف آئینوں میں جھانکنے کی لت ڈال دی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ باہر سورج نکل چکا تھا، میں نے یہ سوچ کر فون بجنے دیا کہ شہریار خود اٹھالے گا۔ گھنٹی لگاتار بجتی رہی، پھر بہت دیر بعد بند ہوگئی۔ شاید شہریار نے اٹھالیا تھا، پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور شہریار آنکھوں میں نیند کا خمار لیے بیچوں بیچ جمائیاں لیتا کھڑا نظر آیا'' عبداللہ فون اٹھاؤ..... تمہارے لیے کال ہے۔'' میں چونک گیا۔'' میرا فون..... اس وقت.....'' شہریار پلٹ گیا۔ میں نے دھڑکتے دل سے فون اٹھایا'' جی کون ہے.....؟'' دوسری جانب کچھ خاموشی کے بعد آواز ابھری۔'' جی..... میں دھانی بول رہی ہوں.....''

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

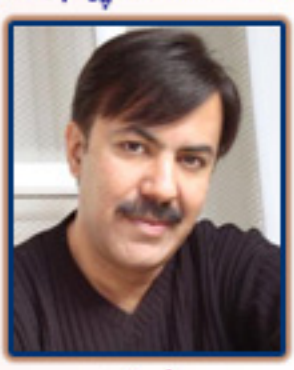

.....ہاشم ندیم.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ ''جی.....؟'' وہ کچھ دیر بعد ہلکے سے کھنکار کر دوبارہ بولی ''میں شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی دھانی بول رہی ہوں'' میں سنبھل چکا تھا ''جی فرمائیے.....'' وہ کچھ الجھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ ''وہ دراصل مجھے کچھ وضاحت کرنا تھی۔ بعض باتیں سفر کرتے ہوئے اپنا اصل زاویہ کھو بیٹھتی ہیں اور مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔'' مجھے حیرت ہوئی ''جی، میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن مجھے اس تمہید کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔'' وہ کچھ ہچکچائی ''تمہید تو میں نے باندھی ہے، اب باقی بات آپ کو شانی بتائے گی۔ یہ لیں، اُن سے بات کریں۔'' چند لمحوں بعد کم و بیش بالکل ویسی ہی آواز فون پر اُبھری ''آداب! دراصل کل وقار نے رات کے کھانے پر مجھ سے منسوب کر کے آپ سے کچھ ایسی بات کہی، جو میں نے اُس مفہوم میں ہرگز نہیں کہی تھی، نہ ہی میرا مقصد آپ کو ہدفِ تنقید بنانا تھا۔ میں نے لوگوں کے عمومی رویّوں کی بات کی تھی۔ ڈیڈی بھی ہم سے بہت خفا ہوئے۔ آپ کو جو ذہنی تکلیف ہوئی، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا، ''یقین کریں وہ بات تو بس یونہی ہنسی مذاق میں بحث کا حصہ بن گئی اور میں تو بھول بھی چکا تھا۔ آپ ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھیں۔'' ''شکریہ۔ آپ کے بزرگ اب کیسے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اور دھانی بھی ڈیڈی کے ساتھ جا کر انہیں دیکھ آئیں۔'' ''جی ضرور، کیوں نہیں۔ انہیں بہت خوشی ہوگی۔'' پیچھے سے کسی سرگوشی کی آواز آئی۔ شانی جھجکتے ہوئے بولی ''دھانی کہہ رہی ہے کہ آپ ڈیڈی کا دل ضرور صاف کر دیجیے گا، ہماری جانب سے۔ ہم ان کی ذرّہ برابر خفگی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔'' مجھے ہنسی آگئی ''تو گویا یہ تمام گفتگو شیخ صاحب کی ناراضی دُور کرنے کے لیے تھی۔'' میں نے انہیں مطمئن کیا۔ ''آپ بے فکر رہیں۔ انہیں آپ سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔'' میں نے بات ختم کر کے فون واپس رکھ دیا اور یہی سوچتا رہا کہ نہ جانے یہ لڑکیاں ایسے کانچ کے مَن کے ساتھ اس پتھریلی دنیا میں کیسے گزارہ کر پاتی ہیں۔

اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کچھ مضمحل سے لگ رہے تھے۔ لگتا تھا، رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائے۔ میں بے چین ہو کر جلدی سے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بابا کی اس حالت کی وجہ پوچھی، اس نے مُسکرا کر تسلّی دی۔ ''ایسا ہو جاتا ہے۔ انہیں ہائی ڈوز اینٹی بائیوٹکس دی جا رہی ہیں، ایسے میں طبیعت کا بوجھل ہو جانا قدرتی عمل ہے اور پھر اُن کی خوراک بھی بہت کم ہے۔'' میری پریشانی دُور ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ''لیکن انہیں ہوا کیا ہے۔ اب تو اُن کے تمام معائنے بھی ہو چکے ہیں۔'' ڈاکٹر نے ان کی فائل کھولی اور آسان لفظوں میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہمیں دو محاذوں پر بہ یک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ ان کے داہنی جانب آخری تین پسلیوں کو اندر کی جانب کسی زوردار دھکے کی وجہ سے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، جس کا اثر اندر جگر کی بیرونی سطح تک ہوا ہے۔ ہمیں ان خراشوں کو بھرنا ہے اور دوسری اہم بات ان کی سر کی چوٹ ہے۔ ہمارے دماغ کی شریانوں میں خُون کی روانی میں ایک لمحے کی رکاوٹ بھی شدید نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور خُون کا زیادہ دباؤ عارضی یا مستقل فالج کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ خون کے بہاؤ میں یہ رکاوٹ خون سے بنے ریت کے ایک ذرّے سے بھی باریک لوتھڑے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ لوتھڑا اگر شریانوں سے چپک جائے تو اُسے تھرومبس اور اگر خون کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہے، تو اسے طِب کی زبان میں ایمبولس کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم فی الحال تو کسی ایسے چپکے یا بہنے والے لوتھڑے سے بچے ہوئے ہیں، لیکن کبھی کبھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسی پیچیدگیاں ظاہر بھی ہونے لگتی ہیں، تو بس فی الحال ہماری اتنی سی جنگ ہے، ان کی بیماری کے ساتھ اور یہی کوشش ہے کہ مزید کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ آپ اطمینان رکھیں۔ وہ ماہر ہاتھوں میں ہیں۔'' ڈاکٹر نے کسی مُستند تجربے کار کی طرح مجھے تسلّی دی، لیکن اس کی باتیں سُننے کے بعد میرا رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہا۔ میں واپس کمرے میں پلٹا تو سلطان بابا نے میرے چہرے کی تختی پر بکھری سیاہی کو غور سے پڑھا ''تم بھی آگئے، ان ڈاکٹروں کی باتوں میں۔ مطمئن رہو، جب تک سانسیں باقی ہیں، یہ بیماری میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور جب سانس پوری ہوئی، تو ان ڈاکٹروں کی پوری دنیا کی مکمل سائنس مل کر بھی مجھے ایک زائد سانس نہیں دے پائے گی، پھر اس جھمیلے میں کیوں پڑتے ہو؟'' میں نے انہیں غور سے دیکھا ''میرا بھی ٹھیک یہی یقین ہے، لیکن اس کے باوجود ہم آخری لمحے تک ہر ممکن دوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دوا کرنا بھی تو ایک طرح کی دُعا ہے۔ یہ بھی تو امید اور آخری لمحے تک اس کا کرم یا فضل ہو جانے کا ایک استعارہ ہوتی ہے، لہٰذا آپ مجھے دوا کی دُعا کرنے سے نہ روکیں۔ میرے ہونٹوں سے ادا ہوتی دُعا آسمان کی وسعتوں تک جاتی ہے، تو میری دوا کی یہ دُعا آپ کی نسوں میں بہتے خون کے خُلیوں میں گھل کر اپنی فریاد اس زندگی کے مالک کو پیش کرتی ہے کہ تیرا ایک بندہ تیرے آسرے پر اس دوا کی کرامات پر یقین کیے بیٹھا ہے۔ اسے مایوس نہ کرنا۔'' میں نہ جانے کتنی دیر تک بولتا رہا۔ سلطان بابا خاموشی سے میری بات سُنتے رہے، پھر انہوں نے سر اٹھایا تو ان کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا کر جلدی سے ان کی جانب بڑھا ''ارے..... یہ کیا، میری کوئی بات ناگوارِ گزری کیا؟'' انہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ''نہیں، یہ آنسو بھی اُس کی شکرگزاری کے ہیں۔ آج پہلی بار عبداللہ نے سلطان کو سبق دیا ہے۔ آج شاگرد اس مقام پر ہے، جہاں استاد تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ جیتے رہو، خوش رہو۔'' میں نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ''یہ میں نہیں، میرے اندر خود آپ بول رہے تھے۔ میرے پاس تو خود اپنا کچھ بھی نہیں۔ یہ نام بھی آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔'' میں بہت دیر ان کے سرہانے بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ انہیں غنودگی سی ہونے لگی اور وہ گہری نیند سو گئے۔

ظہر کے وقت میں نے دھیرے سے ان کا کاندھا ہلا کر نماز کے لیے جگا دیا۔ شام چار بجے کمرے کے باہر کچھ آہٹیں اُبھریں اور پھر شیخ صاحب اپنی دونوں بیٹیوں اور شہریار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔ سلطان بابا ان سب سے مل کر کافی ہشاش بشاش ہو گئے۔ انسان سے انسان کا یہ رشتہ بھی کس قدر انوکھا ہے، کبھی زہر تو کبھی تریاق۔ جبروت کے زہر نے بابا کو اسپتال کے اس بستر تک پہنچا دیا تھا اور شیخ صاحب اور ان کے خاندان کے ذرا سے تریاق نے پل بھر میں ان کے زرد چہرے پر کتنے رنگ کھلا دیے تھے۔ جب شیخ صاحب نے شہریار کا ان سے یہ کہہ کر تعارف کروایا کہ وہ بہت جلد ان کی فرزندی میں آنے والا ہے، تو سلطان بابا نے مُسکرا کر اس کی جانب دیکھا ''کیوں میاں، نماز وغیرہ بھی پڑھتے ہو یا صرف صفحے ہی سیاہ کرتے رہتے ہو۔'' شہریار جو نہ جانے کس خیال میں کھویا کھڑا تھا اس اچانک حملے سے بالکل ہی گھبرا گیا ''جی..... وہ..... میرا مطلب ہے.....'' ہم سب شہریار کی یہ حالت دیکھ کر ہنس پڑے۔ سلطان بابا نے اُسے دعا دی ''جیتے رہو اور ہاں، نماز پڑھا کرو۔ لکھنے والا تو ویسے بھی خدا کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ تب ہی اس کا زیادہ واسطہ الہام سے ہوتا ہے۔ اپنی تحریر میں جذب کی کیفیت پیدا کرنا چاہو، تو پانچ وقت اس کے دربار میں حاضری دینے کا پابند کر لو خود کو۔'' شہریار نے جلدی سے یوں سعادت مندی سے سر ہلایا، جیسے آج ہی سے اُن کی نصیحت پر عمل شروع کر دے گا۔ سلطان بابا نے خاص طور پر دھانی اور شانی سے بھی ان کی مصروفیات کا پوچھا اور انہیں بھی دُعا دی۔ وہ سب بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ سلطان بابا کا کمرا ان کے لائے ہوئے سامان سے بھر چکا تھا، لیکن ڈاکٹر نے پرہیز کی پابندی بتا کر ان سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آٹھ بجے سے کچھ پہلے شیخ صاحب کے گھر کا دوسرا ڈرائیور جو روز مجھے لینے آتا تھا، وہ بھی آ پہنچا۔ میرا دل آج سلطان بابا کو چھوڑ کر جانے کو بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن رات کی ڈیوٹی والی نرس بھی پہنچ گئی تھی، لہٰذا مجبوراً مجھے سب کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ شہریار میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور شیخ صاحب ہماری گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کے پیچھے آنے کا کہہ کر دھانی اور شاہانہ کے ساتھ بڑی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اسپتال سے نکلیں تو خلافِ معمول شیخ صاحب والی گاڑی نے گھر کی مخالف سمت موڑ کاٹ لیا۔ شاید وہ گھر جانے سے پہلے کہیں اور جانا چاہتے تھے۔ میں نے اپنی سوچوں میں گُم شہریار کو چھیڑا۔ ''عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر چاہنے والوں کے چہرے کھلے رہتے ہیں، لیکن تمہاری حالت اُس کے برعکس کیوں ہے؟'' شہریار نے لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری ''جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا۔ کُریدتے ہو راکھ، آخر یہ جُستجو کیا ہے..... کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے، جیسے غالب میرے دل کا ہر معاملہ پہلے ہی ساری دنیا پر کھول گیا ہے، اب راکھ کُریدنے سے تمہیں بھی کچھ حاصل نہ ہوگا اے دوست۔'' میں مُسکرا دیا۔ شیخ صاحب کی گاڑی نے شہر کے ایک مشہور پانچ ستارہ ہوٹل کی ذیلی شاہ راہ کی جانب موڑ کاٹا اور کچھ دیر بعد ہم سب ریسٹورنٹ میں کھانے کی میز کے گرد جمع تھے۔ شیخ صاحب بولے ''بھئی لڑکیوں کی ضِد تھی کہ آج رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھائیں، لہٰذا اب آپ سب بلا تکلف اپنی پسند بتا دیں'' کچھ ہی دیر میں مُستعد بیروں نے میز پر کھانا سجا دیا۔ ہم سے ذرا فاصلے پر لابی میں ایک پکی عمر کا موسیقار پیانو پر مختلف فرمائشی دُھنیں چھیڑ رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے لوگ کاغذ کی چٹ پر اپنی پسند کی دُھن لکھ کر ارد گرد پھرتے کسی بیرے کی ٹرے میں ڈال دیتے، جو فوراً اُسے پیانسٹ کے سامنے لے جا کر رکھ دیتا۔ پیانسٹ مسکرا کر اپنا سر ہلاتا اور پھر باری آنے پر جب وہ دُھن بجاتے ہوئے اس کی انگلیاں پیانو کی لمبی سفید کیز پر تھرک رہی ہوتیں، تو اس کی نظریں بار بار فرمائش کرنے والے جوڑے کی جانب اٹھتی رہتیں۔ سچ کہ دنیا کا ہر ہنر مند داد کا خواست گار ہوتا ہے۔ مجھے بچپن میں پیانو سیکھنے کا جُنون تھا۔ ہمارے گھر کے بڑے ہال میں سیلون کی لکڑی سے بنا ایک بھورے رنگ کا بہت بڑا پیانو رکھا ہوا تھا، جسے پاپا کبھی کبھار کسی محفل کے دوران اور کبھی تنہائی میں بجاتے تھے اور میں گھنٹوں محویت سے بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ جانے کیوں تب ہی سے مجھے پیانسٹ بہت ہنر مند اور سلجھے ہوئے لوگ لگتے۔ ہمارے دائیں جانب شیشے کی دیوار پر پانی کا جھرنا کچھ اس طرح سے بہہ رہا تھا، جیسے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ کھانے کی میزوں کے ارد گرد روشنی کا انتظام کچھ اس انداز میں کیا گیا تھا کہ ہر شخص ایک مدھم روشنی کے دائرے میں خود کو اس طرح محسوس کرتا، جیسے وہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی تخلیے میں ہے اور شاید تخلیے و تنہائی کا احساس ہی اس ماحول کو آرام دہ اور پُرسکون بنائے ہوئے تھا۔ صاحبِ حیثیت لوگ ایسی جگہوں پر شاید اسی احساس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ کم و بیش یہی ذائقہ ہر دسترخوان پر ان کے گھروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ وہ یقیناً یہاں پیش کیے جانے والے کھانے کی نہیں، یہاں گزارے جانے والے وقت کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ دھانی اور شاہانہ نے بھی مختلف دُھنوں کی فرمائش شروع کر دی۔ پیانسٹ شاید شیخ صاحب کی ذاتی حیثیت سے واقف تھا، لہٰذا اب اس کی پوری توجہ ہماری میز کی جانب تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں پاپا اسٹیو ونڈر کے اِسی نغمے کی دُھن بہت شوق سے بجاتے تھے ''ہیلو..... کیا میں وہی ہوں، جس کا تمہیں انتظار ہے؟ کیوں کہ میں تمہاری مخمور آنکھوں اور تمہاری گھائل مسکراہٹ میں دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہیں کیسے جیتوں اے دل ربا..... کہ میں انجان ہوں..... یا پھر میں ابھی اُن ہی لفظوں کے طِلسم سے شروع کروں..... کہ مجھے تم سے محبت ہے۔'' پیانسٹ نے دُھن ختم کی تو سارے ہال نے اُسے داد دی۔ اب دھانی کی باری تھی، اس نے چٹ بھیجی، ''لاپرواسرگوشیاں (Careless whispers)..... میری بہترین دوست ہیں..... لیکن اب میں کبھی رقص نہیں کر پاؤں گا، کیوں کہ میرے بوجھل قدم بنا تال کے ہیں.....'' بہت دیر تک شانی اور دھانی میں جارج مائیکل، ویم اور ماڈرن ٹالکنگ کے پرانے نغموں اور پھر شیر (Cherr) بیک اسٹریٹ بوائز اور برٹنی اسپیئرز کے نئے نغموں کی دُھنوں پر پیانسٹ کو آزمانے کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ صاحب بھی کچھ اس طرح مطمئن بیٹھے مُسکراتے رہے، جیسے ان کا یہاں سے اٹھنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ دھیرے دھیرے ڈھلتی رات کا فُسوں اب پوری طرح چھا چکا تھا۔ کھانے والے ہال میں اب بھی بہت سی میزیں بھری ہوئی تھیں اور دیر رات کو نکلنے والے آوارہ گرد بھی جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ ہمارے دِن اور رات کے رویّوں میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ رات ہمیں بہت حد تک بدل دیتی ہے۔ ہمارے اندر چُھپے بہت سے خوابیدہ جذبوں کا براہِ راست تعلق رات سے ہوتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے ایسا خواب ناک ماحول میسّر ہو تو یہ جذبے اپنے پوری قوت سے ہماری شخصیت پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ہماری باتیں نشیلی ہو جاتی ہیں اور ہمارے لہجے ملائم..... بعض اوقات ہمیں خود ہی سے پیار ہونے لگتا ہے اور ہم اپنے اندر چُھپے کسی معصوم بچّے کی ہر ضِد مانتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی روایتی وضع داری کا چولا اُتار کر بے باک ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر کی رُومان پسند شخصیت چھم سے باہر نکل آتی ہے۔ کہتے ہیں، نشے میں بھی یہی تمام خصوصیات ہوتی ہیں۔ گویا ایسے ماحول میں یہ رات بھی ایک نشے کی طرح ہی ہمارے خُون میں تحلیل ہو کر ہمیں دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر سکتی ہے۔ شاید رات خود ایک بہت بڑا نشہ ہے۔ پیانسٹ نے تار چھیڑے ''صرف لفظ..... اور بس یہی لفظ ہی تو ہیں میرے پاس..... تمہیں دینے کے لیے.....'' اچانک ہی دھانی نے کھوئے کھوئے سے شہریار سے پوچھا۔ ''آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں، کچھ ہمیں بھی تو بتائیے اپنی آنے والی تحریر کے بارے میں۔'' شہریار کچھ چونک سا گیا ''آج کل میں ایک ایسے قلم کار کی کہانی لکھ رہا ہوں، جس کی تحریر اور لفظوں نے ساری دنیا میں دُھوم مچا رکھی ہے۔ اس کی ہر نئی آنے والی کتاب مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر رہی ہے، لوگ بے چینی سے اس کے قلم سے بکھرے لفظوں کی مالا چُننے کے لیے اس کی تحریر کا انتظار کرتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود اس لکھاری کے

پاس اپنے گھر میں بولنے کے لیے صرف خاموشی ہے۔ اس لکھاری کی شریکِ حیات کے حصے میں قلم کار کا کوئی لفظ نہیں آتا۔ وہ دونوں بس خاموشی میں باتیں کرتے ہیں۔'' شاہانہ کی ساری توجہ اب شہریار کی جانب تھی۔ دھانی نے دل چسپی سے پوچھا'' لیکن ایسا کیوں.....؟ کیا لکھاری کی شریکِ حیات کو لفظوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یا پھر قلم کار اپنی کسی گزشتہ محبت کے اثر میں کھویا رہتا ہے؟'' شہریار نے غور سے شانی کو دیکھا۔'' نہیں۔ لکھاری کی زندگی کی ساتھی تو اس کے لفظوں کے لیے بے تاب رہتی ہے اور خود لکھاری کی پہلی اور آخری محبت بھی اس کی شریکِ حیات ہی ہے، لیکن اسے کہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے، وہ سب اُس کی محبت کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔ تو پھر اپنی زبان سے بھی وہی لفظ ادا کرنا، جو اُس کے مختلف کردار ایک دوسرے کے لیے ہمہ وقت اُس کی کہانیوں میں بولتے نظر آتے ہیں، اُسے یہ ادائیگی کچھ معیوب سی نظر آتی ہے اور کہیں اُس کے دل میں یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ ان ہی لفظوں اور جذبوں کی بے ساختہ زبانی ادائیگی کو دکھاوا نہ سمجھ لیا جائے، لہٰذا اپنی شریکِ حیات اور محبت کے سامنے وہ عموماً خاموش ہی رہتا ہے اور یہیں سے لکھاری کی شریکِ حیات کی الجھن شروع ہوتی ہے، کیوں کہ بظاہر آس پاس لوگ اور اس لڑکی کی سہیلیاں اس پر رشک کرتی ہیں کہ لکھاری کی شریکِ حیات کس قدر خوش قسمت ہے کہ اسے ان خوب صورت لفظوں کا ہمہ وقت ساتھ میسّر ہے، جنہیں کتاب کی صورت میں پڑھنے کے لیے لکھاری کے پرستار مہینوں انتظار کرتے ہیں اور لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر اس کی کتابیں خریدتے ہیں۔ اسی کش مکش اور ذہنی اُلجھنوں کی یلغار میں ایک دن لکھاری کی محبت اس کا گھر چھوڑ جاتی ہے کہ اب وہ مزید اس خاموشی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔'' شانی اور دھانی بہت غور سے شہریار کی بات سُن رہی تھیں۔ شیخ صاحب بھی پوری طرح متوجہ تھے۔ ان سے شہریار کی خاموشی کا لمبا وقفہ برداشت نہیں ہو سکا اور وہ جلدی سے پوچھ بیٹھے'' تمہاری اس کہانی کا عنوان کیا ہے؟'' شہریار نے ہم سب کی جانب نگاہ دوڑائی.....'' میرا ہر لفظ تمہارا ہے'' لیکن میری کہانی کا انجام ابھی باقی ہے۔ آپ سب بھی اپنی رائے دیجیے کہ انجام کیسا ہونا چاہیے۔'' کچھ دیر کے لیے ماحول پر خاموشی طاری رہی، پھر دھانی ہی نے سکوت توڑا۔'' انجام تو بہت واضح ہے، لکھاری کو اپنی محبت کی جدائی کے بعد یہ احساس ہو جانا چاہیے کہ رشتے لفظ مانگتے ہیں۔ جذبے اظہار چاہتے ہیں اور'' محبت'' ادائیگی کے لیے تخلیق شُدہ ہے، لہٰذا اُسے بھی دل سے یہ دُہرائی ہوئی بات کا خوف نکال کر اپنے لفظ اپنی محبت کے نام کرنا ہوں گے، کیوں کہ محبت کبھی پرانی اور باسی نہیں ہوتی۔ لفظ کبھی میلے نہیں ہوتے اور اپنی محبت کے لیے ان کی ادائیگی سدا بہار رہتی ہے، لہٰذا لکھاری کو اپنی محبت کا اظہار کھل کر کر دینا چاہیے اور اپنی شریکِ حیات کو اپنی زندگی میں واپس لے آنا چاہیے۔'' شہریار نے مجھ پر نظر ڈالی'' اور تم کیا کہتے ہو عبداللہ۔'' میں شہریار سے ایسے کسی سوال کی توقع بالکل نہیں کر رہا تھا، لیکن اب سب کی توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی اور خلاصی ناممکن تھی۔'' مجھے لگتا ہے دھانی ٹھیک کہہ رہی ہیں، کیوں کہ ہماری زندگی میں بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اپنی طبعی میعاد کے ساتھ دنیا میں وارد ہوتے ہیں اور ہمیں اُسی مدّت کے اندر ہی ان رشتوں کو بَرتنا پڑتا ہے، ورنہ مدّت ختم ہو جانے کے بعد وہ جذبے بھی سرد پڑ جاتے ہیں، جو ان رشتوں کی بنیاد اور ان کی رُوح کا باعث ہوتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ خُون کے رشتوں کے علاوہ سب ہی رشتوں پر اس ایکسپائری ڈیٹ کی مُہر پہلے ہی سے لگی ہوتی ہے۔''

کہانی کا انجام طے ہو چکا تھا۔ ہم سب گھر واپس پہنچے تو شب نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ راستے میں بھی شہریار خاموش ہی رہا۔ ہم دونوں انیکسی میں اپنے گھروں کی جانب بڑھنے لگے، وہ اچانک ہی کسی خیال کے اثر سے باہر آیا۔'' آج تم نے ایک عجیب بات محسوس کی، یا پھر یہ میرا ہی واہمہ ہے.....؟'' میں سمجھ گیا کہ شہریار کا اشارہ کس جانب ہے۔'' نہیں..... میں پہلے ہی یہ بات محسوس کر چکا ہوں۔ جس وقت تم اپنی کہانی کا پلاٹ سُنا چکے تھے، تب ہی میں نے تمہاری آنکھوں میں سوال پڑھ لیا تھا۔ شانی سوچتی ہے اور دھانی اس کی سوچ کو لفظوں کا رُوپ دیتی ہے۔ شاہانہ کے پاس لفظ نہیں ہیں اور دھانی ہی اس کی لُغت ہے۔'' شہریار نے توصیفی نظروں سے میری جانب دیکھا'' اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم کچھ اور ہو۔ اتنی باریک بات جسے جاننے میں مجھے مہینہ بھر سے زیادہ لگ گیا، تم نے دو ملاقاتوں ہی میں کیسے پَرکھ لی؟'' '' نہیں..... اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں، تمہاری جگہ اگر میں محبت کے اس سنہری جال میں جکڑا ہوتا، تو شاید مجھے اس سے بھی زیادہ وقت لگتا، یہ بات محسوس کرنے میں۔ دراصل کچھ جذبے ہمارے حواس پر آہنی پردے ڈال دیتے ہیں اور پھر یہ کوئی انہونی بات بھی تو نہیں..... ہم میں سے بہت سے لوگ کسی ایک میدان ہی میں یکتا ہوتے ہیں۔ کچھ لفظوں کو کاغذ پر اُتارنے کا ہنر جانتے ہیں، تو کچھ اُن کی ادائیگی میں کمال رکھتے ہیں اور لکھاریوں کے ساتھ تو یہ مسئلہ بہت عام ہے کہ بعض بہت بڑے لفظ گر ہونے کے باوجود گفتگو کے معاملے میں ماہر نہیں ہوتے۔ اِسی طرح کچھ جو سوچتے ہیں، وہ بول نہیں سکتے۔ شاید شانی کا بھی یہی مسئلہ ہے۔'' شہریار کہیں اور کھویا ہوا تھا'' تو پھر وہ مجھ سے ٹیلی فون پر گھنٹوں کیسے بات کر لیتی ہے۔ کیا یہ مسئلہ صرف تخلیے اور جلوت کا ہے؟'' میں نے غور سے شہریار کو دیکھا، اُس کی زبان پر وہی بات آ کر رُک گئی تھی، جو خود کہیں دور میرے ذہن کے کسی گوشے میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا سوال دہرانے سے پہلے لفظ اپنے ذہن میں ترتیب دیے۔'' ٹھیک سے یاد کر کے بتاؤ، تم جس طویل گفتگو کی نشستوں کا ذکر کر رہے ہو، وہ تمہاری یہاں آمد کے بعد سے لے کر کب تک اُسی طرح جاری رہیں، جیسے تم اُنہیں محسوس کرنا چاہتے تھے اور کیا ان میں کبھی کوئی بدلاؤ بھی آیا تھا؟'' شہریار کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ غالباً وہ میرے سوال کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ اُس کی گفتگو اس وقت مکمل تھی، جب تک میں نے شانی کی آواز کی شناخت کا اعلان نہیں کیا اور اس بات میں قریباً دو ہفتے کا عرصہ حائل تھا۔ میں اور شہریار ایک ہی نکتے پر پہنچ رہے تھے۔ شہریار کی شیخ صاحب کی کوٹھی میں آمد کا مقصد سب کے لیے ایک کُھلا راز تھا اور دوسری رات ہی سے شہریار کو وہ ٹیلی فون آنا شروع ہوا تھا۔ پھر شہریار اس آواز کے زیر و بم میں کھوتا چلا گیا۔ اس ملائم آواز کے جادو، لفظوں کے خوب صورت چناؤ اور خیالات کے حسین زاویوں نے اُسے کچھ ایسا مدہوش کیا کہ وہ اپنا آپ ہی بھول گیا۔ روز شام کو جب چائے پر شیخ صاحب کے گھرانے سے اس کی ملاقات ہوتی تو وہ شانی اور دھانی دونوں کے چہروں پر رات والی آواز کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ شہریار کی اُلجھن بھی اپنی جگہ بجا تھی، کیوں کہ دونوں بہنوں کی آواز بالکل ایک جیسی تھی۔ خود میں نے بھی جب شاہانہ اور دھانی سے اس روز فون پر بات کی تھی، دونوں آوازوں میں فرق تلاش نہیں کر پایا تھا اور پھر شہریار کو شانی کی آنکھوں میں وہ گلابی معطر پیغام دکھائی دے ہی گیا، لہٰذا یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ شہریار کو فون کرنے والی شاہانہ ہی تھی۔ شہریار نے اُسی رات وہ کسوٹی حل کر دی، جو پچھلے دو ہفتوں سے اس کے دل میں اتھل پتھل مچا رہی تھی اور اس نے فون کرنے والی آواز کو شاہانہ کی آواز کے طور پر شناخت کر لیا۔ شانی نے بھی اپنی ہار تسلیم کر لی اور اس کے بعد شہریار کا شوقِ ملاقات بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک آدھ ملاقات کا موقع میسّر بھی آیا، لیکن سماعتیں تشنہ ہی رہیں۔ ایک لفظ گر، ایک دوسرے لفظ تراش سے کچھ لفظوں کی بھیک نہ پا سکا۔ پھر دھیرے دھیرے شہریار کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ اب رات کو زیادہ تر وہی بولتا ہے اور دوسری جانب سے شاہانہ صرف اس کے لفظ جوڑتی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح کُھل کر شہریار سے نہ تو بحث کرتی تھی اور نہ ہی شہریار کے نئے افسانوں کے پلاٹ پر کوئی تبصرہ، لیکن شہریار نے شروع میں اس تبدیلی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، تاوقتیکہ اس کی شاہانہ سے تنہائی میں دو ملاقاتیں نہیں ہو گئیں، پھر میں شیخ صاحب کے مہمان کے طور پر انیکسی میں شہریار کا ہم سایہ بن گیا اور اس کا زیادہ تر رات کا وقت میرے ساتھ اپنی کہانیاں سناتے گزرنے لگا اور آج وہ لمحہ بھی آ ہی گیا، جب شہریار نے وہ بات محسوس کر لی، جو شاید عام حالات میں اُسے بہت پہلے سمجھ میں آ جاتی۔ ہم دونوں کافی دیر خاموش کھڑے رہے۔ اچانک اندر فون کی گھنٹی نے ہم دونوں کے خیالات کی رَو توڑ دی۔ شہریار نے ہچکچا کر میری جانب دیکھا۔ میں نے اُسے تسلی دی'' سچ ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہم سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ یہ ہماری سوچ اور ہمارے اختیار کیے گئے راستے کا قصور ہوتا ہے کہ ہم اس سچ تک پہنچنے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں۔ شاید ہم جان بوجھ کر سچ سے کتراتے ہیں اور وہ راستہ اختیار کرتے ہیں، جو ہمیں سچ تک پہنچانے میں بہت دیر لگاتا ہے، لیکن میں تم سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم اس سچ کا سامنا بہادری سے کرو گے۔ جاؤ، جا کر فون اٹھاؤ۔ اب تم سے صبح ملاقات ہو گی۔'' میں شہریار کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ صبح ہونے میں کم ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔ نماز کے بعد میں کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

پھر میری آنکھ فون کی گھنٹی ہی سے کُھلی۔ دوسری جانب کوٹھی کا خانساماں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دو مرتبہ پہلے بھی میز پر ناشتا لگا چکا ہے، لیکن جب خلافِ معمول میں اپنے وقت پر باہر نہیں نکلا، تو اُسے تشویش ہوئی، لہٰذا اس نے میری طبیعت کا پوچھنے اور ناشتا لگانے کی اجازت طلب کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ میں باہر نکلا تو شہریار پہلے ہی سے باہر کُھلتی کھڑکیوں کے قریب کھڑا نہ جانے خلا میں کیا گھور رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سُن کر وہ میری جانب پلٹا۔'' تم نے ٹھیک کہا تھا عبداللہ۔ سچ ہمیشہ ہمارے آس پاس موجود ہوتا ہے..... ہم خود ہی نہ جانے کہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔ میرا سچ بھی میرے سامنے آ گیا ہے۔ مجھ سے شروع میں بات کرنے والی شانی نہیں تھی۔ میں جن سُنہرے خوابوں اور کومل جذبوں کے دھارے میں بہہ رہا تھا۔ انہیں الفاظ کی صورت دینے والی خواب گر کوئی اور نہیں، دھانی ہی تھی۔'' .....(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

.....☆ہاشم ندیم☆.....

ہماری زندگی میں پیش آنے والے بعض حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا مکمل ادراک ہونے کے باوجود ہم ان کے پیش آنے پر کچھ اس جھٹکے سے چونکتے ہیں، جیسے وہ حقیقت نہیں، کوئی ان ہونی ہو۔ ٹھیک اُس وقت میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا، حالاں کہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات گزشتہ شام ہی سے گردش کر رہی تھی کہ شانی کی اس پہلوتہی اور خاموشی کے پیچھے کوئی ایسی ہی کہانی ہوگی، لیکن شہریار کی زبانی یہ بات سن کر چند لمحے کے لیے میں گنگ سا رہ گیا۔ شہریار کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات سو نہیں پایا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا ”تو کیا تم نے براہِ راست شانی سے سوال کر ڈالا؟“ ”نہیں، اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کل رات میری کہانی کا پلاٹ سن کر شاید شانی کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ میں رویوں کے اس فرق کو پہچان گیا ہوں۔ وہ بہت شرمندہ تھی کہ یہ بات بتانے میں اسے اتنی دیر لگی، حالاں کہ اس کی اپنی نیت بھی یہی تھی کہ وہ کسی مناسب موقع پر یہ راز کھول دے گی کہ شہریار کو شروع میں فون کرنے والی شانی نہیں دھانی تھی، اور پھر جب شہریار کی پسند ان دونوں بہنوں پر کھلی تو شانی نے از خود فون پر دھانی کی جگہ لے لی، کیوں کہ دھانی کے بقول اس کے شہریار کے لیے صرف بطور ایک اچھے لکھاری، پسندیدگی کے جذبات تھے، جب کہ شانی پہلی نظر ہی میں شہریار کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی، لیکن وہ دونوں ہی شاید یہ جان نہیں پائیں کہ شہریار لفظوں کا اسیر ہے، اس کی رگوں میں لفظ زندگی بن کر دوڑتے ہیں اور اس کی نسوں میں خون نہیں، لفظ رواں ہیں، اس کے دل کو فتح کرنے والی وہ پہلی آواز، جیسی نے حسین لفظوں سے خیال کی سنہری وادیوں تک کا سفر شہریار کی انگلی پکڑ کر طے کیا تھا، وہ صرف چند میٹھے بول نہیں تھے، وہ ایک فریکوئنسی تھی، جس نے ان دونوں کو جوڑ کر ایک ایسے نکتے پر پہنچا دیا، جہاں سے ان کا وہ سفر شروع ہوتا تھا، جس کے راستے اور منزلیں سب ایک تھے، لیکن دھانی کے جانے کے بعد شانی وہ فریکوئنسی برقرار نہیں رکھ سکی۔ وہ دو انسان، جن کے درمیان محبت کے تار جڑتے ہیں، ان کے جذبوں کی لہریں ہوا کے دوش پر ضرور کسی ایک اور خاص مقام پر ملتی ہوں گی، جیسے ریڈیو کی شارٹ ویو، میڈیم لہر کی فریکوئنسی نہیں پکڑ سکتی اور اسی طرح لانگ ویو، شارٹ ویو کی لہروں پر جڑے اسٹیشن پکڑ نہیں پاتی، حالاں کہ یہ تینوں لہریں اسی فضا میں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں، لیکن ان کے دائرۂ کار مختلف ہیں، محبت کے جگنو بھی ہر لمحہ ہوا میں تیرتے اور جگمگاتے رہتے ہیں، لیکن کس جگنو کی چمک کس اندھیرے دل کا مقدر بن کر اس انسان کی زندگی میں اجالے بھر دے گی، اس کا فیصلہ وہ فریکوئنسی کرتی ہے، جس کے ملے بنا دنیا کا ہر ملن ادھورا رہ جاتا ہے، ہاں البتہ شاید محبت کے یہ جگنو فضا میں تیرتے ہوئے اپنی جگہیں بعض مرتبہ بدل بھی دیتے ہیں۔ ایک لہر کی تہہ سے نکل کر سفر کرتے ہوئے، دوسری لہر میں بھی جا ملتے ہیں۔ تب ہی ہمیں بعض اوقات ایسے انسانوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے، جو بظاہر پہلے ہمارے لیے بہت عام ہوتے ہیں اور ہمارے آس پاس ہی برسوں سے موجود ہوتے ہیں، جی رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک اور عجیب سی حقیقت کا ادراک بھی ہوا۔ ہمارا معاشرہ جہاں شادی کا بندھن ہی ملن کا باعث ہوتا ہے۔ جہاں اب بھی نوے فی صد رشتے بزرگوں کی مرضی اور دو خاندانوں کے جوڑ کا سبب ہوتے ہیں، ایسی طے شدہ شادیوں میں جہاں دو ہم سفر زندگی میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کسی بندھن میں بندھ جاتے ہیں، وہاں محبت کے جگنوؤں کا سفر تیز تر ہو جاتا ہے۔ شاید دعاؤں کا ایندھن اس رفتار کو مہمیز دیتا ہے، لیکن شہریار کا ستا ہوا چہرہ اور اس کی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے جذبوں کے جگنو اب بھی وہیں، اسی لہر میں منجمد تھے، جہاں کبھی پہلی رات دھانی سے ان کے تار جڑے تھے۔ میں نے غور سے شہریار کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے چراغوں کو دیکھا ”پھر تم نے شانی سے کیا کہا؟“ ”میں پھٹ پڑا کہ ان دو بہنوں نے میری زندگی کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیوں کیا۔ آخر میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ رو پڑی اور مجھ سے معافی ہی مانگتی رہی کہ اس کا مقصد مجھے دھوکا دینا کبھی نہیں تھا۔ اسے خود بھی گزشتہ رات ہوٹل میں کھانے کے دوران یہ احساس ہوا کہ میں دھانی کے خیالات اور باتوں سے پہلے متاثر ہوا تھا اور شانی کے حسن سے بعد میں، جب کہ وہ اب تک یہی سمجھتی آ رہی تھی کہ میں پہلے ہی دن سے اس سے متاثر ہوں۔“ مجھے شہریار کی بات سن کر نہ جانے کیوں بہت دکھ ہوا۔ ”تمہیں اسے ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔ اس کا اندر بہت نازک ہے۔ تمہارے دیے ہوئے لفظوں کے گھاؤ بھرتے بھرتے بھر بھی گئے تو ان کے داغ سدا جگمگاتے رہیں گے۔“ شہریار الجھا ہوا تھا۔ ”میں بہت دباؤ میں تھا، خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور بہت کچھ بول گیا۔“ ”دباؤ ہی میں تو خود پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جانتے ہو اصل فاتح کون ہوتا ہے، وہ جو شدید دباؤ میں بھی متانت کا دامن تھامے رکھے۔ انسان کی پہچان اس کے غصے کے دوران ہی ہوتی ہے۔ عام حالات میں تو سبھی میٹھے ہوتے ہیں، ہمارے اندر کے زہر کو پرکھنے کا پیمانہ یہ دباؤ اور طیش ہی تو ہے اور ان ہی چند لمحوں میں کچھ بت ایسے ٹوٹتے ہیں کہ پھر کبھی ”جڑ“ نہیں پاتے۔ اپنا بت سنبھالو شہریار۔“ وہ چڑ سا گیا ”تو تم کیا چاہتے ہو، میں ابھی جا کر اس سے معافی مانگ لوں۔“ ”نہیں، یہ دوسری غلطی ہوگی تمہاری، تم پہلے ہی وقتی اشتعال میں آ کر پہلی غلطی کر چکے ہو۔ زندگی میں بعض غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں، جو مناسب وقت کا تقاضا کرتی ہیں، حالاں کہ اس لمحے آپ کے دل و دماغ پر اپنی بھڑاس نکالنے کا جنون طاری ہوتا ہے اور بظاہر آپ کو ایسا لگ رہا ہوتا ہے کہ گنتی برابر کرنے کا یہ موقع اگر آپ کے ہاتھ سے نکل گیا تو شاید ہمیشہ کے لیے دیر ہو جائے گی اور ہمارا جوابی حملہ خطا ہو جانے کے بعد انہی اَن کہے لفظوں کی صورت میں کانٹا بن کر خود ہمارے دل ہی میں چبھتا رہے گا، لہٰذا ہم اپنے دل کے ہول اپنی زبان سے زہر میں بجھے تیر بنا کر دوسرے کے دل میں پیوست کر دیتے ہیں اور ایسا کرنے سے وقتی طور پر ہمیں کچھ سکون بھی ضرور مل جاتا ہے، لیکن کبھی تم نے سوچا ہے کہ ہم اس تمام عمل میں حاصل کیا کرتے ہیں؟ صرف ایک خلش، کبھی نہ مٹنے والی کسک اور بدقسمتی سے غلط ثابت ہو جانے کی صورت میں عمر بھر کے پچھتاوے، کیوں کہ دل کے شیشے میں آیا بال پھر کبھی نہیں نکلتا۔ اسے نکالنے کے لیے وہ شیشہ چکنا چور کرنا پڑتا ہے یا پھر عمر بھر اسی بال کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ لفظ کبھی واپس نہیں پلٹتے اور ہم کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کھو دیتے ہیں، جو پھر

کبھی نہیں ملتا۔ اس لیے رویوں میں حد درجے احتیاط ہی زندگی کے ہر بندھن کی کامیابی کی ضمانت ہے۔'' شہریار خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہوں، ہمارے پاس کسی اجنبی کے ساتھ بھی کوئی دوسرا رشتہ نہ ہونے کے باوجود بردباری، احترام اور اس کی اور اپنی عزت کا رشتہ تو ہر حال میں قائم رہتا ہے اور دوستی محبت یا خون کے کسی رشتے کی صورت میں تو یہ ذمے داری دگنی ہو جاتی ہے۔ میں رات کو اپنے ذمے داری نبھا نہیں پایا۔ میں اب تک اپنی ہر کہانی اور افسانے کو ایک خوب صورت موڑ پر ختم کرنے کا عادی رہا ہوں، لیکن خود میری اپنی کہانی کا اتنا بدصورت انجام ہوگا، یہ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔'' ''تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے، کہانی ختم کرنے کا ایک اصول یہ بھی ہوتا ہے کہ لکھاری کو ہر کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے بعد اسے انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔'' شہریار نے لمبی سی آہ بھری ''لیکن میری کہانی کا انجام کچھ مختلف ہے۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس افسانے کے ہر کردار کو اپنا انجام خود طے کرنا ہوگا۔'' ہماری باتوں کے دوران ناشتا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا، مستعد نوکر تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے گرم کر کے میز پر سجاتے رہے تھے، میں دو گھونٹ بھر کے اسپتال کے لیے نکل پڑا۔

سلطان بابا کی حالت آج خلافِ معمول کچھ بہتر نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولے ''آج اپنی کنڈی کہاں اٹکا آئے ہو میاں، کبھی اس ذہن کو دو گھڑی آرام بھی کر لینے دیا کرو۔'' میں مسکرا کر بات ٹال گیا۔ جانے وہ اتنی آسانی سے چہرے کی سلیٹ کیسے پڑھ لیتے تھے یا پھر میری جبیں کی شکنیں ہی کچھ ایسی تھیں کہ میرے اندر برستی ہر بارش، لفظوں کی صورت قطروں کی طرح ٹپکتی اور پھسلتی رہتی تھی، چہرہ آئینہ ہوتا ہے اور آئینے بوندوں کا بوجھ زیادہ دیر سہار نہیں پاتے، انہیں بہنے کے لیے راستہ دینا ہی پڑتا ہے کہ بہاؤ کا واسطہ ہمیشہ سے شفافیت سے ہے۔ سلطان بابا کو اب اسپتال سے خارج ہونے کی فکر ستا رہی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یہاں سے بہت دور ملک کے مغربی ساحل پر کوئی درگاہ ہے، جہاں ہمارا پہنچنا ضروری ہے۔ میں چونک سا گیا۔ ساحل اور درگاہ کا نام سن کر مجھے اچانک ہی اپنا شہر اور زہرہ سے ساحل پر ہوئی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ میرا شہر مشرقی ساحل پر تھا اور سلطان بابا مغربی ساحل کی جانب بسے ہوئے شہر کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہی لہروں کے دوسری پار وہ بھی تو رہتی تھی۔ اس سمندر کے دو کناروں کی لہریں بھی تو آخر کبھی نہ کبھی ایک دوسرے سے مل جاتی ہوں گی۔ جانے ہمارے مقدر کی لہریں کب آپس میں جڑ پائیں گی۔ میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے سلطان بابا کی آنکھ لگنے کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے لینے آیا، تو میں چاہتے ہوئے بھی اسے واپس نہیں بھیج پایا۔ یہ سلاخیں اور یہ قید خانے ہمیں کیا قید کر پاتے ہوں گے، اصل قید تو مروت اور وضع داری کی ہوتی ہے۔ میں گھر پہنچا تو ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور شاید موسم کے انہی تیوروں کے باعث آج بڑے والے شیشے کے کمرے میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شہریار سمیت شیخ صاحب کا سارا خاندان موجود تھا۔ برستے موسم کی مناسبت سے ہلکے پھلکے پکوان میز پر سجائے جا رہے تھے۔ ہمارے اندر موجود ذائقوں کا تعلق باہر کے موسموں سے کیسے جڑ جاتا ہے، یہ میں کبھی سمجھ نہیں پایا۔ دونوں بہنوں اور شہریار کے رویے میں تناؤ ان کے بے حد چھپانے کے باوجود محسوس کیا جا سکتا تھا۔ شیخ صاحب نے بھی غور سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ''کیوں بھئی، کوئی سرد جنگ چل رہی ہے۔ تم تینوں ہی آج بے حد خاموش ہو۔'' وہ تینوں ہی کچھ گڑبڑا سے گئے۔ شہریار جلدی سے بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں، بس کبھی کبھی موسم کچھ بولنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ لفظ خود بوندیں بن کر بہہ جاتے ہیں۔'' شیخ صاحب کی زبان سے بے ساختہ داد نکلی۔ ''بھئی واہ، کیا بات کہی ہے، خاموشی کا حق ادا کر دیا۔ کبھی ہم بھی ان برستی بوندوں کے لیے کچھ ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ عبداللہ میاں! تم ہی کچھ کہو، ان تینوں نے تو بارش سے شرط باندھ رکھی ہے۔'' دھانی نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ شیخ صاحب تناؤ محسوس کرنے کے باوجود بڑی خوب صورتی سے بات ٹال گئے تھے۔ میں نے بات جوڑی ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ موسم ایسے ہوتے ہیں، جو ہم سے تمام گلے شکوے بھلا کر بس اس موسم میں ڈوب جانے کا تقاضا کرتے ہیں کہ موسم بھی تو ایک نعمت کی طرح ہوتا ہے۔ کفرانِ نعمت ہو تو موسم ہم سے روٹھ جاتے ہیں اور پھر بہت دنوں تک وہ ہمارے کمرے کی کھڑکی پر دستک نہیں دیتے۔ بس دبے پاؤں خاموشی سے باہر ہی سے گزر جاتے ہیں۔'' اب چونکنے کی باری شاہانہ کی تھی، جب کہ میرا مخاطب شہریار تھا، جس نے ہلکے سے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ کے عقب میں گم ہو گیا۔ باہر گرتی بوندوں نے اب باقاعدہ جل تھل کی شکل اختیار کر لی تھی۔ باہر باغیچے میں ایک کھلی جگہ پر پانی کا جوہڑ سا بنتا دیکھ کر میرا بہت شدت سے جی چاہا کہ میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی کشتی بنا کر اس پانی میں چھوڑ آؤں اور پھر اپنے بچپن کی طرح ہاتھ کی چھتری بنا بنا کر، گھنٹوں خود بھیگ کر اس کشتی کو بھیگنے سے بچاتا رہوں، حتیٰ کہ شام ڈھل جائے اور سرمئی بادلوں کے چھپتی اندھیرے میں مما کہیں سے مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں نکل آئیں اور میں ان کی انگلی تھامے ہوئے گھر کی جانب جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر اپنا سفینہ ڈوبتے دیکھ کر، آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکاتا رہوں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ ''کاغذی سفینوں'' کو تو ڈوب ہی جانا ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ سفینہ کسی نازک رشتے ہی کا کیوں نہ ہو، جیسے اس وقت شانی اور شہریار کے رشتے کی کشتی ڈوب رہی تھی، ہم کسی کے کتنے بھی قریب کیوں نہ چلے جائیں، کسی کو کتنا ہی اپنا کیوں نہ مان لیں، اگر وہ رشتہ کاغذی ہو تو سفینے ڈوب ہی جاتے ہیں۔ لفظ روٹھ جاتے ہیں۔ ایک لمحہ پہلے وہی انسان، جس پر ہمارا کامل یقین، مان اور بھرم ہوتا ہے کہ بس وہی تو ہے، جو ہمیں اس بھری دنیا میں سب سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے، اگلے لمحے ہی ہمارے لیے دنیا کا سب سے انجان شخص بن جاتا ہے۔ میں آج تک یہ معما حل نہیں کر پایا تھا کہ بے انتہا اپنائیت کا وہ بھرم جھوٹا ہوتا ہے یا پھر اچانک ہی بیچ میں در انداز ہو جانے والی اس بیگانگی اور اجنبیت کا یہ احساس سچا۔ ہم پل بھر ہی میں اتنے اپنے اور پھر ایک دم اچانک اتنے بیگانے کیسے ہو جاتے ہیں۔؟

چائے ختم کر کے میں اسپتال واپس جانے کے لیے اٹھا تو شیخ صاحب بھی سلطان بابا کو دیکھنے میرے ساتھ ہی چل پڑے۔ سلطان بابا ہمیں ساتھ آتا دیکھ کر مسکرائے۔ ''لگتا ہے میرے جوگی کا دل آپ کے ہاں لگ گیا ہے؟'' شیخ صاحب بھی ہنس پڑے۔ ''پتا نہیں، لیکن عبداللہ میاں کو دیکھ کر تو خود ہمارا بھی جوگ لینے کو جی چاہتا ہے۔'' وہ دونوں زمانے بھر کی باتیں کرتے رہے اور میں کمرے کی کھڑکی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر باہر برستی بوندوں کا کھیل دیکھتا رہا۔ بارش میں سب ہی منظر یکساں ہو جاتے ہیں۔ رم جھم گرتی وہ پھوار باہر کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر سے بھی بہت کچھ دھو ڈالتی ہے۔ گھر واپس پہنچنے پر مجھے شہریار انیکسی میں دکھائی نہیں دیا۔ نوکر نے بتایا کہ ہمارے جانے کے کچھ دیر بعد وہ بھی دوسری گاڑی لے کر کہیں نکل گیا تھا۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی، نوکر نے کھانے کا پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ عشاء کے بعد بھی میں بہت دیر تک شہریار کا انتظار کرتا رہا، پر وہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟ انہی سوچوں میں گم، میں باہر لان میں جلتی سفید گول بتیوں پر جگنوؤں کی یلغار جیسی بارش کی بوندیں گرتی دیکھ رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ضرور یہ فون شہریار کے لیے ہوگا، لیکن وہ تو ابھی واپس ہی نہیں پلٹا، گھنٹی بہت دیر تک بج کر چند لمحے کے لیے چپ ہو گئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی پھر سے لگاتار بجنے لگی۔ میں نے شش و پنج کے عالم میں فون اٹھا ہی لیا۔ دوسری جانب ان دونوں سے کوئی ایک بولی ''ہیلو.....'' ''جی میں عبداللہ بول رہا ہو۔ شہریار ابھی گھر واپس نہیں لوٹا۔'' دوسری جانب کچھ لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر وہ بولی۔ ''میں دھانی بول رہی ہوں، مجھے دراصل آپ ہی سے بات کرنی ہے۔'' میں نے اپنی حیرت کو ظاہر ہونے سے روکا۔ ''جی فرمائیے.....'' وہ کچھ دیر تک اپنے لفظ جوڑتی رہی۔ ''غالباً شہریار نے آپ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ مجھے اسی سلسلے میں آپ کی کچھ مدد چاہیے۔'' ''میں حاضر ہوں۔ اگر کسی بھی مدد کے قابل ہوں'' ''شکریہ..... شانی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کچھ ہی دنوں میں شہریار کے بہت اچھے دوست بن گئے ہیں۔ آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ ہماری شروع میں کی گئی نادانی کو بس ایک شرارت سمجھ کر معاف

کردیں۔ ہم دونوں میں سے کسی کا بھی مقصد انہیں دھوکا دینا نہیں تھا۔ شانی کل رات سے بے حد پریشان ہے اور یقین جانیے، اس تمام معاملے میں اگر کوئی قصوروار ہے، تو وہ میں ہوں، لیکن سزا شاہانہ کو مل رہی ہے۔ مجھ سے مزید اس کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ آپ شہریار سے کہیں، اگر سزا دینا اتنا ہی ضروری ہے تو میں حاضر ہوں۔ وہ چاہیں تو تمام عمر مجھ سے کوئی رابطہ بھی نہیں رکھیں، لیکن شانی کو معاف کردیں۔ وہ بہت معصوم ہے۔'' مجھے لگا کہ دھانی بولتے بولتے کچھ بھرّا سی گئی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''آپ مطمئن رہیں۔ میں ضرور اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا، حالاں کہ بات کچھ نازک جذبوں کی ہے۔ آپ نے شہریار سے خود بات کی ہے؟'' ''جی کل رات جب وہ شانی کو ڈانٹ رہے تھے، میں نے بھی ان سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور آج شام بھی چائے کے بعد میں نے انہیں فون کیا، لیکن شاید وہ میری کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ وہ میری اس خطا کو شرارت ماننے پر تیار ہی نہیں۔'' میں بے ساختہ کہہ گیا۔ ''کیا وہ صرف ایک شرارت ہی تھی؟'' دوسری جانب گہری خاموشی چھا گئی، مجھے تاسف ہوا، لیکن تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا اور اندھے تیر کی سب سے بڑی خطا یہی ہوتی ہے کہ اس کا نشانہ نامعلوم رہتا ہے۔ پھر بھی میں نے تلافی کی کوشش کی۔ ''معاف کیجیے گا، بعض مفہوم بات سے پہلے اور بہت سے نامناسب انداز میں مخاطب تک پہنچ جاتے ہیں۔'' دوسری طرف سے اضطرابی کیفیت اور الجھی سانسوں پر قابو پانے کی آہٹ محسوس ہوئی، پھر دھانی نے خود کو سنبھالا ''خدا کرے آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، شہریار وہاں کبھی نہ پہنچیں۔ سچ یہی ہے کہ بات شرارت ہی سے شروع ہوئی تھی، میری بہن مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ شہریار کی پسند بھی ہے۔ اس حقیقت کے بعد باقی تمام باتیں بے معنی ہوجاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے پاس دلیل کی وہ طاقت ہے، جو شہریار کی تمام الجھنیں مٹا سکتی ہے۔ مجھے آپ کی جانب سے کسی پیش رفت کا انتظار رہے گا۔'' بات ختم کرکے دھانی نے فون رکھ دیا۔ گویا میرے ذہن کے کسی گوشے میں پلنے والا خیال صرف میرا واہمہ ہی نہیں تھا۔ شاہانہ سے بہت پہلے دھانی شہریار کو اپنے من مندر میں بٹھا چکی تھی، شاید اسی وقت جب شہریار کو اس نے گیٹ پر خوش آمدید کہا ہوگا، لیکن شہریار نے جب اس کی آواز کو شانی کی آواز کے طور پر شناخت کیا تو دھانی اپنے اندر چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہونے والے جذبے کی آخری چیخ کو بھی کچھ اس خوب صورتی سے چھپا گئی کہ اس کی ہم نفس، اس کی واحد رازدار بہن، جو خود دھانی کا آئینہ تھی، اسے بھی اس طوفان کے آنے اور پھر خاموشی سے گزر جانے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ ایک بار پھر روپ کا ڈاکا پڑ گیا۔ یہ من موہنی صورتوں والے ہی تو سب سے بڑے ڈاکو ہوتے ہیں، لیکن حیرت ہے، دنیا کی کسی بھی تعزیرات میں اس ڈاکے کی کوئی سزا مقرر نہیں۔ زیادہ نہ سہی، پرکم از کم ان روپ والوں اور بے روپوں کے لیے علیحدہ جزیرے ہی مقرر کردینے چاہیے تھے، تاکہ کبھی کسی بے روپ کا رستہ نہ کٹتا۔ ان ہی سوچوں میں پوری رات کٹ گئی۔ شہریار واپس نہیں لوٹا۔ صبح ناشتے کی میز پر میں نے نوکر سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ پہلے ہی کہہ گیا تھا کہ اگر رات کو اسے زیادہ دیر ہوگئی تو وہ اسی دوست کے یہاں ٹھہر جائے گا، جہاں وہ جارہا تھا۔ میں شہریار کی آمد سے مایوس ہوکر اسپتال کے لیے نکلنے کا سوچ کر ابھی انیکسی کا باغیچہ پار کر ہی رہا تھا کہ سامنے سے آتی دھانی کو دیکھ کر میرے قدم جم سے گئے، وہ اس وقت برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ قریب آنے پر میں نے اسے سلام کیا اور جواب دینے کے بعد وہ اچانک ہی اس الجھن کا شکار ہوگئی، جو کسی بھی فیصلے کے آخری لمحات میں کچھ پل کے لیے ہمارے قدم ڈگمگا سے دیتی ہے۔ آخر میں نے بات شروع کی۔ ''شہریار رات کو واپس نہیں لوٹا، لیکن آپ مطمئن رہیں۔ میں ملتے ہی ضرور اس سے بات کروں گا۔'' ''جی میں جانتی ہوں۔ دراصل میں کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی..... دراصل..... وہ.....'' اپنے لفظوں سے زیادہ وہ خود الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کی پلکیں جھک گئیں۔ ''کیا شہریار نے آپ سے کوئی بات کی تھی؟ میرا مطلب ہے، کیا وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں؟'' ''میں ناراضی سے زیادہ اسے ایک بے نام الجھن کہوں گا۔ شہریار ان لوگوں میں سے ہے، جن کے دل کی کنجی ''لفظ'' ہوتے ہیں۔ ان کے من کے دروازے الفاظ کی چاہتوں سے کھلتے ہیں۔ آپ نے وہ تمام دروازے کھول ڈالے، لیکن کسی اور کو اس کے من میں دھکیل کر خود دل کے دروازے ہی سے واپس پلٹ گئیں۔ شہریار اس وقت دستک دینے والے اور اندر آنے والے مہمان کے فرق کی الجھن کا شکار ہے۔ اسے کچھ وقت دیں۔ وہ اس کش مکش سے ضرور باہر نکل آئے گا۔'' دھانی کی جھکی پلکیں میری بات سن کر بہت دیر تک اٹھ نہیں پائیں، پھر جب وہ بولی تو مجھے یوں لگا کہ ساری کائنات اس کے اندر کے درد میں ڈوب ہی تو جائے گی۔ ''کوئی بھی مہمان دروازے پر دستک دے کر خود واپس پلٹنا نہیں چاہتا اور پھر یہ دستک تو زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ہی دی جاتی ہے، لیکن اگر اندر سے میزبان ''کون؟'' پوچھنے کے بجائے، کسی اور مہمان کا نام لے کر باآواز بلند صرف اسی کو خوش آمدید کہے، تو کسی بھی وضع دار مہمان کو پلٹ ہی جانا چاہیے۔'' میں نے چونک کر اپنے سامنے سر جھکائی اس دھان پان سی سانولی سلونی کو دیکھا۔ سچ ہے، ظرف کسی روپ کا محتاج نہیں ہوتا، میں نے اسے مزید کھوجا۔ ''اندر بلانے والے میزبان کو اپنی پہچان بھی تو کروائی جاسکتی تھی۔ کبھی کبھی اچانک نئے آجانے والے مہمان بھی تو اُسی تحیر اور خوشی کے ساتھ ''لبیک'' کہے جاتے ہیں۔'' اس نے اپنی بھیگی نظر اٹھائی۔ درد، شکوہ، قسمت سے گلہ اور اپنی بے بسی کا افسوس..... کیا کچھ نہیں تھا اس ایک نظر میں..... ''نہیں..... کم از کم میرے معاملے میں یہ ان ہونی ناممکن تھی۔ میں بچپن سے ان سب چیزوں کی عادی ہوچکی ہوں۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ شہریار کے من کی کنجی ''لفظ'' ہیں، لیکن ان کے دل کا راستہ بھی ان کی نظر سے ہوکر ہی گزرتا ہے۔ تب ہی میرے لفظوں کی دستک کے باوجود انہیں باہر وہی نظر آیا، جسے ان کی نظر نے سراہا تھا۔ رنگ، روپ اور حسن کی طاقت سے کسے انکار ہے اور یقین جانیں، شانی کے لیے ایسی ایک دستک تو کیا، میری ہزار زندگیاں بھی قربان ہوجائیں، تو یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں، کیوں کہ ایسی بہن نصیب والوں ہی کو ملتی ہے۔ وہ بہت نازک ہے، بہت معصوم ہے اور چاہے انجانے ہی میں سہی، پر اب وہی شہریار کے دل کی مکیں ہے اور یہی اس کی خوشی ہے اور میں اپنی بہن کی خوشی کے لیے اپنی آخری سانس بھی گروی رکھ سکتی ہوں۔'' میں نے غور سے اسے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ ''یقیناً شاہانہ بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں گی، کیوں کہ میں نے آپ دونوں کو یک جان دو قالب پایا ہے۔ پھر آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے اپنی پہلی دستک ان سے چھپا کر کوئی بے ایمانی کی ہے؟'' ''نہیں..... میں نے ہی اسے یہ سمجھایا تھا کہ اگر شہریار کا دل اس کی جانب مائل ہے تو شانی کو بھی اپنے دل سے رائے لینی چاہیے، اس کا دل اگر شہریار کو محرم مانتا ہے، تو پھر اسے بھی قدم بڑھانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے اور شاہانہ نے یہی کیا، کیوں کہ وہ خود کہیں اندر سے شہریار کو اپنا مان چکی تھی۔'' دھانی کے کانپتے وجود کی لرزش بڑھنے لگی۔ ''گویا معاملہ ''قربانی'' دینے کا ہے؟'' اس نے شکوہ بھری نگاہ ڈالی ''اگر یہ قربانی ہی ہے تو یہ قربانی میں اپنے جنم ہی سے دیتی چلی آرہی ہوں۔ معاملہ اگر خوب صورت لفظوں ہی تک محدود ہوتا تو شہریار کی پہلی نظر مجھ ہی پر پڑتی، لیکن مجھ جیسیوں کو شاید خود کو مکمل کرنے کے لیے خوب صورت خیالات اور دانش کی بے ساکھی کی ضرورت پڑتی ہے۔ خوب صورت لوگوں کی زبان سے نکلا ہر لفظ خود حسین اور ہر خیال حسین تر ہوجاتا ہے۔ میں کتابی دنیا میں رہنے والی لڑکی نہیں ہوں، نہ ہی میں نے کبھی کسی خصوصی سلوک کی توقع ہی کی ہے۔ ہاں، میرے اندر میرے اپنے تخیل کی دنیا ضرور آباد ہے، جانے اس بار میرا دل کیسے بھٹک گیا اور شہریار کے دل کا دروازہ کھٹکھٹا بیٹھا، لیکن کیا کریں، دل پر زور بھی تو نہیں اور اس دل کو بھٹکانے میں بھی شہریار جیسے ادیبوں اور شاعروں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی ہمارے دل کی بجھی راکھ کو اپنے جادو بھرے لفظوں سے کرید کر اس میں دبی چنگاریاں بھڑکاتے ہیں اور پھر ہمارا دل باغی ہوکر ہم سے بس ایک ہی سوال کرتا ہے کہ کیا بدصورت لوگوں کو محبت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کیا کم روپ والوں کا دل کچھ کم دھڑکتا ہے یا سادہ چہرے والوں کے اندر کے جذبے بھی بے رنگ اور سادہ ہوتے ہیں۔ قدرت نے یہ کیسا نظام بنا رکھا ہے کہ روپ بانٹتے وقت تو ترازو اوپر نیچے ہوجاتا ہے، لیکن جذبے، کسک اور خلش بانٹتے وقت پیمانہ یک ساں رکھا جاتا ہے، کیوں ہمارے اندر چاہنے اور چاہے جانے کی اس لازوال خواہش کا پیمانہ ہمارے رنگ و روپ کے مطابق کم یا زیادہ نہیں رکھا گیا۔ اگر چاند اور ستارے توڑ کر لانے کے دعوے صرف روپ والوں کے لیے مخصوص ہیں، تو پھر ہم جیسوں کے لیے ایک اور فلک کیوں نہیں تخلیق کیا گیا، جہاں جگمگاتے تارے اور چاند نہ سہی، چند ادھ جلے انگارے کچھ مدھم جگنو ہی ٹانک دیے ہوتے، کیوں ہمارے فلک کے مقدر میں بھی ہمارے نصیب کی طرح صرف سیاہی لکھ دی گئی.....؟''

دھانی بولتے بولتے ہانپنے لگ گئی۔ شاید عمر بھر کا لاوا تھا، جو آج میرے سامنے بہہ نکلا۔ ایک آنسو دھانی کی آنکھ سے ٹپکا اور اس کی قدم بوسی کرگیا۔ پیچھے سے آہٹ بلند ہوئی۔ شانی کسی ستون کی آڑ میں جانے کب سے کھڑی ہماری تمام باتیں سن رہی تھی۔ دھانی کا رنگ اسے دیکھ کر مزید پیلا پڑ گیا۔ شانی اپنی بہن کی جانب لپکی اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں بہنیں ایک دوسرے کو گلے لگا کر بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ میری پلکیں بھی نم ہوگئیں۔ مجھے یوں لگا، جیسے آج پوری خدائی رو رہی ہے۔

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

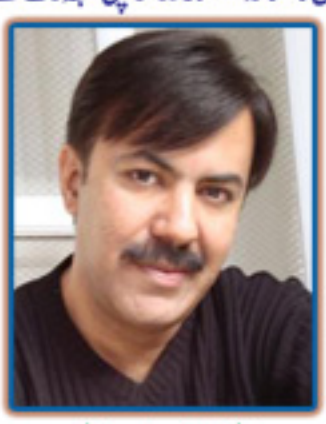

.....☆ہاشم ندیم☆.....

ان دو بہنوں کے لگاتار بہتے آنسو مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو سکے۔ میں تو انہیں کوئی تسلی دینے کی حالت میں بھی نہیں تھا۔ بعض دھاگے کچھ اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ انہیں سلجھانے کی ہر کوشش انہیں مزید الجھانے کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ جذبوں اور رشتوں کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں ہمیں ان جذبوں، رشتوں اور گتھیوں کو اسی طرح الجھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا پڑتا ہے۔ سو میں بھی ان دونوں کو یونہی الجھا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ زندگی میں سبھی کچھ سیدھا نہیں ہوتا، یہ ہم سب کے ساتھ مکمل بھید بھاؤ رکھتی ہے۔ شہریار، دھانی اور شاہانہ کی زندگی نے بھی اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ وہ دونوں بہنیں شہریار کا دل جیت کر بھی رو رہی تھیں۔ ایک اپنے لفظوں سے جیتی اور روپ سے ہاری تھی، تو دوسری روپ سے جیت کر بھی لفظوں سے شکست کھا گئی تھی۔ وہ دونوں ہی فاتح بھی تھیں اور شکست خوردہ بھی..... کچھ ایسا ہی حال محبت کی اس تکون کے تیسرے کردار شہریار کا بھی تھا۔ یہ محبت ہم لاچار انسانوں کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ آج دھانی کی فریاد نے مجھے اندر تک لرزا کے رکھ دیا تھا، دنیا کا ہر انسان مرد و عورت کی تخصیص کے بنا، خود کو اپنے من کے آئینے میں حسین تر ہی دیکھتا ہے۔ شاید ہمارے ہمیشہ سے دو چہرے ہوتے ہیں، ایک وہ جو ظاہری دنیا کو نظر آتا ہے اور دوسرا وہ، جو ہم ہر لمحہ خود اپنے من کے آئینے میں دیکھتے ہیں، ہم میں سے بعض اپنے اندر لگے شیشے سے جھلکتے دوسرے چہرے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں بیرونی دنیا کے آئینوں کی عادت ہی نہیں رہتی اور تب وہ خود کئی بار چونک جاتے ہیں، جب کبھی ان کا واسطہ باہر لگے کسی شیشے سے پڑتا ہے، کیوں کہ سامنے نظر آتے آئینے میں کھڑا شخص انہیں بالکل اجنبی نظر آتا ہے، تبھی ہم چونک کر کہتے ہیں ''ارے میری تصویر تو بالکل اچھی نہیں آتی۔'' یا ''بھئی میں تو بالکل ہی فوٹو جینک نہیں ہوں'' بعض زندہ تصویر کشی سے کترانے لگتے ہیں، تنہائی میں بار بار خود کو مختلف زاویوں سے شیشے میں دیکھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ چاہے ہماری تصویر اچھی نہیں آتی، چاہے ہم ویڈیو میں کتنے ہی بھدے کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں۔ اصل میں تو ہم بہت دل کش ہیں، ہمیں ہمیشہ صرف وہی جملے یاد رہ جاتے ہیں، جو کبھی کسی نے ہمارے سراپے کی تعریف میں کہے ہوتے ہیں، ہم وہی رنگ پہننا شروع کر دیتے ہیں، جو کسی کی رائے کے مطابق ہم پر جچتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی برتاؤ ہماری تمام شخصیت کے بناؤ سنگھار کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پہلا دھوکا دینے والا بھی کوئی اور نہیں خود ہمارے کمرے کا آئینہ ہوتا ہے، جو ہماری دائیں جانب نکلی مانگ کو سر کے بائیں جانب دکھاتا ہے اور پھر کبھی کبھی دائیں بائیں کا یہ معمولی سا فرق ہمارے سر کی مانگ کی طرح ہمارے اندر لگے اور باہر کمرے کے آئینے کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک دراڑ ڈال دیتی ہے۔ مجھے اس دن نہ جانے اپنے بچپن میں سُنی اس معمولی شکل و صورت والی شہزادی کی کہانی بہت یاد آ رہی تھی، جس نے اپنی سلطنت کے سبھی آئینے توڑ ڈالنے کا حکم دے دیا تھا۔ کاش ہماری دنیا کے سبھی بیرونی آئینے بھی ٹوٹ جاتے اور ہم میں سے ہر ایک کے من کا آئینہ باہر کمرے میں لگ جاتا، تو یہ دنیا کتنی خوب صورت ہو جاتی۔ کون جانے ہمارے بیچ کتنے ایسے دل جلے بھی ہوں، جو آئینے توڑنے کی بجائے آنکھیں پھوڑنے کی آس دل میں رکھتے ہوں گے۔ اگر انسانی خوب صورتی کو ماپنے کا پیمانہ صرف یہ بے وفا نگاہیں ہی ہیں، تو کاش ہم بے بصارت ہی ہوتے۔ میرا ذہن نہ جانے کن بھول بھلیوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اندر ڈاکٹر سلطان بابا کے چند اہم معائنے کر رہے تھے۔ اچانک میں شہریار کو سوجی ہوئی آنکھیں لیے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا، کیوں کہ میرے لیے اس کی یہاں اسپتال میں آمد بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں جلدی سے اس کی جانب بڑھا۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے، سب ٹھیک تو ہے نا.....؟'' ''ہاں، بس ایک دوست کی طرف رک گیا تھا رات کو، اب بھی وہیں سے آ رہا ہوں، پتا نہیں کیوں گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا، سوچا کچھ دیر تمہارے پاس ہی بیٹھ جاؤں، سلطان بابا اب کیسے ہیں؟'' ''وہ بہتر ہیں، لیکن تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ وہ دونوں تمہارے اس رویے کی وجہ سے بہت پریشان ہیں، کس کو سزا دے رہے ہو، خود کو یا ان دونوں کو.....؟'' شہریار نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا سر کرسی کے ٹیک سے ٹکا دیا۔ ''بہت الجھ گیا ہوں میں..... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....'' ''کیا سمجھ میں نہیں آ رہا، دل کے دروازے پر دستک دینے والی کو تم پہلے ہی واپس لوٹا چکے ہو، اب جو دل کے اندر براجمان ہے، اس کی تو قدر کرو۔'' شہریار نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرا جی چاہا کہ میں دھانی کے ساتھ ہوئی پوری بات اسے بتا دوں، لیکن کسی کا بھرم رکھنا مقصود تھا، لہٰذا اختصار کے ساتھ ان دونوں بہنوں کی پریشانی بیان کر دی، لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شہریار کی الجھن کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جائے گی اور پھر میں اس سے کس رویے کی امید کر رہا تھا۔ خود میں بھی تو کسی مہ رخ کی ایک اچٹتی نظر کا شکار ہو کر اپنا سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ کہیں میں بھی صرف زہرہ کے روپ ہی کا تو گھائل نہیں تھا؟ اگر زہرہ بھی عام شکل و صورت کی کوئی سیدھی سادی سی لڑکی ہوتی، تو کیا تب بھی میں اسی طرح اپنا چین و قرار لٹا بیٹھتا، میں بھی تو کسی کی گہری، کالی جھیل جیسی آنکھوں، گلابی عارض اور گالوں میں پڑنے والے گڑھوں کے قریب جا کر رکا تھا، خود میری منزل بھی تو کسی کے پنکھڑی لبوں کے قریب کا تل تھا اور خود میرا راستہ بھی تو کسی کی صراحی دار گردن کے خم سے ہو کر ہی گزرتا تھا، خود میرے خوابوں کی نیند بھی تو کسی کی آنکھوں پر گرتی زلف نے اڑا رکھی تھی، خود میں بھی تو کسی کی گھنیری پلکوں کے تپتے سائے تلے ہر دم جل رہا تھا، پھر مجھے شہریار سے کسی بھی گلے شکوے کا کیا حق تھا، شاید ہر گھائل، روپ کا گھائل ہوتا ہے، ہر جنوں، کسی حسن کا اسیر ہے، ہر چاند، کسی کی کلائی کا کنگن اور سب تارے کسی کی اوڑھنی کا آنچل تھے۔ اگر ملزمان کی فہرست بنائی جاتی، تو سب سے بڑا مجرم تو میں خود تھا۔

شہریار بہت دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر معائنے سے فارغ ہوئے تو سلطان بابا نے فوراً ان کے سامنے دوبارہ اپنی ''رہائی'' کی درخواست پیش کر دی۔ ڈاکٹروں میں سے ایک ہنس کر بولا۔ ''کیوں بابا! کیا آپ کا یہاں ہمارے ساتھ دل نہیں لگتا؟'' سلطان بابا مسکرائے۔ ''جس نے یہاں دل لگا لیا، سمجھو وہ یہیں کا ہو گیا میاں.....! آپ مجھے یہاں سے جانے دیں تو یہ وعدہ رہا کہ ہر ہفتے ہم خود یہاں حاضری دینے آ جایا کریں گے۔'' سبھی ڈاکٹر ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہریار، سلطان بابا کے پاس جا بیٹھا۔ میری نظر سامنے دیوار پر لگے کیلنڈر پر پڑی۔ ہمیں کال گڑھ سے نکلے آج ٹھیک پندرہواں دن تھا۔ اچانک نہ جانے کیوں پل بھر ہی میں مجھے ایسا کیوں لگا کہ کیلنڈر میں بھرے رنگ غائب ہو گئے ہوں، تصویر رنگین سے صرف کالی اور سفید ہو کر رہ گئی، پھر میں نے ذرا غور کیا، نہیں کالا نہیں، یہ تو نیلا اور شاید کچھ پیلا رنگ بھی تصویر میں باقی تھا۔ مطلب یہ کہ صرف سرخ اور سبز رنگ تصویر سے اڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر زور سے پلکیں جھپکیں، جیسے کوئی پرانے کلر ٹی وی کے چلتے چلتے رنگ اڑ جانے پر اسے زور سے آس پاس سے تھپک کر، ہلا کر جھٹکے سے اس کے رنگ واپس لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک لمحاتی اثر تھا اور دوسرے ہی لمحے میری بصارت کے رنگ واپس لوٹ چکے تھے، لیکن ٹھیک اسی لمحے مجھے اپنی نسوں میں تیز مرچوں جیسی جلن اور چبھن دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ بے چینی اور جلن کا احساس اس قدر شدید اور اچانک تھا کہ میری

آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ میں نے جلدی سے قریب پڑے پانی کے جگ سے تین چار گلاس پانی بنا کسی وقفے کے حلق سے نیچے انڈیلا۔ شہریار دوسرے کمرے میں سلطان بابا سے باتیں کر رہا تھا، دونوں میری اس بگڑتی حالت سے ناواقف تھے، شاید یہ میرا وہم ہی ہو، لیکن جانے کیوں مجھے ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرے لبوں کے کنارے پر ہلکا سا کف جمع ہو کر تحلیل ہو گیا ہو۔ پتا نہیں یہ سب کیا تھا، لیکن چند لمحوں ہی میں اس احساس نے میری روح نچوڑ کر رکھ دی تھی۔ شکر ہے کہ جس وقت سلطان بابا نے مجھے آواز دی، تب تک میرا ہانپنا ختم ہو چکا تھا، ورنہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے، پھر بھی جب میں درمیانی راستے کا پردہ اٹھا کر ان کے بستر والے حصے تک پہنچا، تب تک وہ میرے چہرے پر کچھ پڑھ چکے تھے۔ ''کیا ہوا میاں! یہ ہلدی کہاں سے مل لائے ہو چہرے پر، رنگ کیوں زرد پڑ رہا ہے؟'' میں نے بات ٹالی۔ ''کچھ نہیں، شاید نیند نہ آنے کی وجہ سے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی، اب ٹھیک ہوں میں۔'' وہ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتے رہے۔ ''کبھی دو گھڑی آرام بھی کر لیا کرو، جنوں حد سے گزر جائے تو وحشت بن جاتا ہے۔'' میں چپ رہا۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور آ گیا۔ میں نے شہریار سے کہا کہ وہ گھر چلا جائے، شیخ صاحب جانے کیا سوچتے ہوں گے، لیکن اس نے ضد پکڑ لی کہ میں بھی کچھ دیر کے لیے اس کے ساتھ ہی چلوں۔ میں نے پردہ اٹھا کر دیکھا، سلطان بابا کی آنکھ لگ چکی تھی۔ ہم خاموشی سے دبے پاؤں کمرے سے نکل آئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی حسبِ توقع شیخ صاحب نے شہریار پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ وہ ٹھیک تو ہے، کہیں ان کی خدمت میں کوئی کمی تو نہیں آ گئی، جو شہریار یوں اکتا کر دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ شہریار نے بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ اسے تو بس اپنی کہانی کے ایک اہم موڑ کے لیے ماحول کی کچھ تبدیلی چاہیے تھی اور بس.....! چائے کے دوران شانی اور دھانی نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ ماحول خوش گوار رہے۔ آج گزشتہ روز جیسی پھوار تو نہیں پڑ رہی تھی، لیکن آسمان پر آج بھی سفید بادلوں کے بہت سے آوارہ ٹکڑے ''کوکلا چھپائی'' کھیل رہے تھے۔ آج دن بھی جمعرات کا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب چھوٹی ماں (میری خالہ) مجھے بادلوں کی کہانی سنایا کرتی تھیں کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کی بھیڑیں اور دنبے ہوتے ہیں، جنہیں اللہ میاں دن کے وقت نیلے آسمان پر کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، تو میرے ذہن میں اللہ میاں کا بہت ہی خوب صورت سا تصور ابھرتا تھا۔ شہریار آج بھی چپ سا تھا۔ دھانی نے غالباً شیخ صاحب کا دھیان بٹانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ جوڑ رکھا تھا۔ شانی بھی بیچ میں ایک آدھ لقمہ دے رہی تھی۔ اچانک ہی دھانی مجھ سے پوچھ بیٹھی۔ ''عبداللہ! آپ بتائیں کہ آپ ایسے موسم کو کیسے انجوائے کرتے ہیں؟'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ان دو لڑکیوں کو شیخ صاحب کی کتنی فکر تھی، کیا سبھی بیٹیاں اپنے بابل کے لیے اسی طرح گھلتی ہوں گی؟ ''میرے ذہن میں تو ایسے موسم کے لیے بہت خصوصی اہتمام کے کئی طریقے آتے ہیں..... مثلاً ایسا شیشے کا بہت بڑا کمرا ہو، جس کی شفاف دیواروں سے پرے ہم بوندوں کا کھیل دیکھیں، برستے آسمان سے بھیگتی زمین تک کا ہر نظارہ ایک ہی فریم میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہو، شیشے کے ہال میں ایک بہت بڑا سا پیانو ہو اور.....!'' شانی اچانک بول اٹھی۔ ''اور اس پیانو پر زیبا بیگم بیٹھیں گنگنا رہی ہوں، کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجا دی.....!'' شانی کی مثال اس قدر بے ساختہ اور عمدہ تھی کہ ہم سبھی زور سے ہنس پڑے۔ شیخ صاحب تو بہت دیر تک اس بات کا لطف لیتے رہے۔ ماحول پل بھر میں ہی خوش گوار ہو گیا اور شانی اور دھانی کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ وہ رشتے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں، جن کی پروا کرنے کے لیے لوگ موجود ہوتے ہیں، شاید رشتوں کا واسطہ ہی دل جوئی اور دل داری سے ہوتا ہے، ورنہ سارا جہاں اجنبی ٹھہرا۔ چائے کے بعد میں شیخ صاحب سے اجازت لے کر واپس اسپتال جانے کے لیے پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ شانی تیز تیز قدم اٹھاتی میرے پیچھے چلی آئی۔ ''عبداللہ.....! میں اور دھانی دونوں ہی اپنے صبح کے برتاؤ پر بے حد شرمندہ ہیں، دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملے میں بہت جذباتی ہیں اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو تو کیا، ذرا سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتی، حالاں کہ آپ کو یہ سن کر ہنسی آئے گی کہ جب تک امی ہمارے درمیان موجود تھیں، ہم ایک دوسرے سے دن میں تین چار بار ضرور لڑا کرتی تھیں، لیکن ہمیشہ ان جھگڑوں کا خاتمہ بھی کسی ایک کے آنسوؤں پر ہی ہوتا تھا۔'' ''جی میں سمجھ سکتا ہوں، آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں، جانے ان آنسوؤں کی صفت کو عورتوں کے ساتھ ہی کیوں مخصوص کر دیا گیا ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو ضرورت پڑنے پر یہ خزانہ بہا دینا چاہیے، کیوں کہ روتا ہوا انسان اس لمحے بہت معصوم ہو جاتا ہے۔'' شانی کے چہرے پر چھایا تکدر صاف ہو گیا۔ ''آپ ہر بات کا ایک نیا زاویہ اپنے اندر رکھتے ہیں، ویسے آپ کے کلیے کے مطابق تو میں اور دھانی اس دنیا کے سب سے زیادہ معصوم فرد ہوں گے، کیوں کہ ہم دونوں تو بہت روتے ہیں، کبھی امی کو یاد کر کے، کبھی پرانی باتوں پر، کبھی ڈیڈی کی کسی پریشانی پر اور کچھ نہ ملے تو اپنی چوڑیوں کے ٹوٹ جانے یا چھلوں کے کھو جانے پر بھی..... کبھی اپنی پسند کے ایک جیسے دو جوڑوں میں سے کسی ایک کے کپڑے کا رنگ اتر جانے پر تو کبھی دل پسند سینڈل کی ہیل ٹوٹ جانے پر.....! دھانی اور میرے پاس رونے کے بہانے کبھی بھی کم نہیں رہے۔'' میں نے ہنس کر غور سے اس زندہ دل لڑکی کو دیکھا۔ کہاں الجھا بیٹھی تھی محبت کی رنگین لیکن تیز دھار ڈور میں خود کو..... کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کی یہ ڈور ہمارے جذبوں کی پتنگ کو اونچا اور زیادہ اونچا لے جانے کی خواہش جگا کر ہمیں اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ پھر ہمیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ کب اور کس طرح یہ قاتل ڈور ہماری شہ رگ پر پھر جاتی ہے۔ ہم جب تک سنبھلتے ہیں، خون کا تیز فوارہ ہمیں پورے وجود تک بھگو چکا ہوتا ہے۔ شانی دراصل مجھ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا میں نے شہریار تک ان کی معذرت پہنچا دی تھی اور یہ کہ ان دونوں نے شیخ صاحب کو پوری بات بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن وہ دونوں چاہتی تھیں کہ میں شیخ صاحب سے بات کروں۔ میں کچھ الجھ گیا۔ ''میں.....؟ میرا مطلب ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن کیا آپ نہیں سمجھتیں کہ یہ بہت ذاتی بات ہے، کہیں شیخ صاحب میری زبانی یہ سن کر.....!'' ''میں آپ کی بات سمجھ سکتی ہوں، لیکن یقین کریں کہ ڈیڈی آپ کے خیالات کی بے حد قدر کرتے ہیں، مجھے اور دھانی کو یقین ہے کہ وہ آپ کی بات کو غلط نہیں لیں گے، ہم اپنی غلطی پر نادم ہیں، لیکن ڈیڈی سے چھپا کر ہم مزید ایک اور غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں، آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ آپ کو یہ کس امتحان میں ڈال دیا ہم نے!'' شاہانہ کی سنہری جبیں پر اپنا مدعا بیان کرتے کرتے پسینے کے چند ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔ کیا سبھی لڑکیاں ایک سی ہی ہوتی ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''آپ اطمینان رکھیے، میں اسے امتحان سے زیادہ سعادت سمجھتا ہوں، لیکن کیا آپ دونوں کو نہیں لگتا کہ شیخ صاحب سے بات کرنے سے پہلے آپ دونوں کو شہریار سے ایک بار کھل کر بات کر لینی چاہیے.....؟ دل کی گرہیں بہت مضبوطی سے بھی لگی ہوں، تو ان کا ملائم دھاگا آسانی سے کھل جاتا ہے، بعض جذبے وقت کے متقاضی ہوتے ہیں، پوری آنچ مانگتے ہیں، کبھی کبھی ذرا سی جلدی اور ہلکی آنچ ہی سے اتار دینے پر کچے رہ جاتے ہیں اور یاد رہے کہ رشتوں کی یہ آنچ بس ایک بار ہی سلگائی جا سکتی ہے، دوسری مرتبہ یہ سب جلا کر رکھ دیتی ہے۔'' شاہانہ چپ چاپ سر جھکائے میری بات سنتی رہی۔ جذبوں اور رشتوں کی آنچ کی دھک ٹھیک اس لمحے، میں اس کے چمپئی سے کندن ہوتے گلابی چہرے پر بھی محسوس کر سکتا تھا۔

میں اسپتال پہنچا، تو سلطان بابا کا چہرہ کسی تازہ پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ پتا چلا کہ ڈاکٹروں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ اگر اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کوئی پیچیدگی نظر نہ آئی، تو انہیں جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ مجھے اس لمحے وہ بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیے۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی بہت رغبت سے کھایا۔ انسان کا من اندر سے شانت ہو، تو پھر سبھی ہارمون شاید مکمل کام کرنے لگتے ہیں۔ انسان کے اپنے اندر بھی بہ یک وقت نہ جانے کتنے جادو منتر چلتے رہتے ہیں۔ رات گئے میں گھر واپس پہنچا، تو ایک عجیب سی خاموشی نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے انیکسی میں جا کر شہریار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شہریار اندر ہی سے بولا۔ ''کم ان!'' دروازہ کھولتے ہی میری پہلی نظر شہریار کے سوٹ کیس پر پڑی، جس میں وہ اپنا سامان بھر رہا تھا۔ ''تو تم نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے.....؟'' ''ہاں.....! اور کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہو پا رہا تھا۔'' ''تمہارے اس فیصلے کا شیخ صاحب کو پتا ہے؟'' ''انہیں فی الحال صرف اتنا ہی پتا ہے کہ میں اپنی کہانی پوری ہو جانے پر واپس گھر جا رہا ہوں، لیکن کون جانے کہ یہ کہانی اب کبھی پوری ہو گی بھی یا نہیں.....؟'' میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ''کیا تمہاری ان دونوں سے کوئی بات ہوئی؟'' ''ہاں.....! دونوں ہی سے فرداً فرداً بات ہوئی، آج شام کو!'' اتنے میں نوکر نے دستک دے کر بتایا کہ شیخ صاحب لاؤنج میں کافی پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شہریار کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ

شانی نے اسے بھی یہ بتا دیا ہے کہ وہ مجھے شیخ صاحب سے بات کرنے پر آمادہ کر چکی ہیں۔ میں نے جانے سے پہلے آخری مرتبہ شہریار سے پوچھا۔ ''تم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو، تو مجھے بھی بتا دو کہ شاید میں تمہارا مقدمہ ٹھیک طرح سے شیخ صاحب کے سامنے پیش کر پاؤں۔'' شہریار کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ ابھری۔ ''نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو، مجھے یقین ہے کہ تم ایک بہترین وکیل کی طرح میرا مقدمہ لڑو گے، فی الحال میں دل اور دماغ کی اس جنگ میں پس رہا ہوں، تم جاؤ، انکل تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' میں نوکر کے ساتھ لاؤنج پہنچا، تو کافی کے مگ سجائے جا چکے تھے، ماحول پر سنجیدگی طاری تھی، دھانی نے کافی کپس میں انڈیل کر ہمارے حوالے کی اور خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ شیخ صاحب بھی شاید خود کو ذہنی طور پر کسی اہم بات کے لیے تیار کر چکے تھے۔ میں نے آسان لفظوں میں انہیں شہریار کے یہاں آنے سے لے کر دھانی کے فون اور پھر شانی کی پسند تک کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ چپ چاپ میری بات سنتے رہے اور جب میں بات ختم کر چکا، تب بھی بہت دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آس پاس کی سرسراہٹیں بتا رہی تھیں کہ دونوں بہنیں پاس ہی کسی ملحقہ کمرے میں موجود ہیں۔ شیخ صاحب اپنا پائپ سلگا چکے تھے اور ان کے ماتھے پر بنتی شکنیں بھی دھویں کے اُن مرغولوں جیسی تھیں، جو اس وقت ان کے پائپ سے نکل رہے تھے۔ بہت دیر بعد ان کے لب کھلے۔ ''تو کیا شہریار اسی لیے یہاں سے جا رہا ہے؟'' ''یہ بھی ایک وجہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ چند دن کا یہ وقفہ ان تینوں کو کسی ٹھیک فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے گا۔'' شیخ صاحب نے ایک لمبا سا ہنکارا ابھرا۔ میں جانتا تھا، وہ اس وقت کسی شدید کشمکش کا شکار تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی، جس میں جیت ان کی دو بیٹیوں میں سے کسی کی ہوتی، خود ان کی اپنی ہار یقینی تھی، کیوں کہ یہ راز اب ان پر بھی عیاں ہو چکا تھا کہ شانی سے پہلے دھانی، شہریار کی کنڈی ہلا چکی تھی اور اَن جانے ہی میں سہی، پر وہ بھی اس در کے کھلنے کے انتظار میں شہریار کے دل کے باہر کھڑی رہی ہے۔ شیخ صاحب اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ ''شہریار کی الجھن اپنی جگہ بجا سہی، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری دونوں بیٹیاں ایک دوسرے کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گی، شہریار اچھا لڑکا ہے اور میں اس کی صاف گوئی سے بھی مزید متاثر ہوا ہوں، اس سے بس اتنا کہنا ہے کہ اس گھر کے دروازے اس کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔'' گویا شیخ صاحب نے فیصلے کا اختیار شہریار کو سونپ دیا تھا۔ میں ان سے اجازت لے کر واپس انیکسی پہنچا تو شہریار برآمدے ہی میں شیشے کی دیوار کے قریب پڑی آرام دہ کرسی پر بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر سنبھل گیا۔ ''آ گئے وکیل صاحب! کہو کیا فیصلہ لے کر آئے ہو؟'' ''تمہاری عدالت نے فیصلے کا اختیار بھی تم ہی پر چھوڑ دیا ہے..... شانی یا دھانی نام کی جو بھی بیڑی تمہیں پسند ہے، تمہیں اسی کے ساتھ عمر قید سنا دی جائے گی۔'' شہریار کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''منصف کسی کو عمر قید کی سزا سنانے سے پہلے کبھی ان ہتھکڑیوں یا بیڑیوں سے کیوں نہیں پوچھتا کہ کیا انہیں اس ملزم کا زیور بننا قبول بھی ہے یا نہیں؟'' میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''شام کو پہلے دھانی آئی تھی خود انیکسی میں، مجھے صرف یہ بتانے کہ شانی کی خوشی اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اور یہ درخواست کرنے کے لیے کہ میں اس ابتدائی ایک ہفتے کی ہر بات بھلا کر اگر شانی کو خود اس کی شخصیت کے تناظر میں دیکھوں، تو شانی سے بہتر جیون ساتھی مجھے پوری دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا، وہ اپنی بہن کی خوشی مانگنے آئی تھی۔'' ''تو تم نے کیا جواب دیا؟'' ''مجھے جواب دینے کی مہلت ہی کہاں ملی، ابھی دھانی کو انیکسی سے نکلے دو لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ شانی کا فون آ گیا اور کیسا ستم ہے کہ دوسری بہن نے بھی مجھ سے وہی مانگا، جو اس کے لیے پہلی بہن مانگ کر گئی تھی۔'' ''مطلب.....! کیا شانی نے بھی.....؟'' ''ہاں اس نے بھی صرف یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ اس کے لیے اپنی بہن کے آنسوؤں سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں اور اب چوں کہ وہ اپنی بہن کے دل میں چھپے مہمان کو جان چکی ہے، لہٰذا اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی بہن کے سپنوں کی راکھ پر اپنا محل قائم کر لے، لہٰذا اس نے اپنے آپ کو میرے لیے سدا نامحرم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے، وہ بھی مجھ سے اپنی آخری خواہش کے طور پر دھانی کو اپنانے کا کہہ گئی ہے۔''

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہریار اسی طرح شیشے کے پار دیکھتا رہا۔ ''یہ تمہارے لیے ہوگا، دھانی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تم سے رات کو بات کرے گی۔'' میں نے اپنے کمرے میں جا کر فون اٹھایا، دوسری جانب دھانی ہی تھی۔ ''یہ آپ نے کیا کیا..... کیا آپ یہ نہیں جانتی تھیں کہ آپ کی بہن کا خمیر بھی اسی مٹی سے اٹھا ہے، جہاں سے آپ کا جنم ہوا تھا، پھر بھی یہ جانتے ہوئے کہ شانی کبھی شہریار کو آپ کی شرط کے مطابق قبول نہیں کرے گی، آپ نے کیوں یہ جوگ لے لیا؟'' دھانی کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔ ''بعض جوگ ازل سے ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں، میں شہریار کو پا بھی لیتی، تو یہ ان کے لیے ادھوری خوشی ہوتی، کیوں کہ ان کی آدھی خوشی شانی کی شخصیت میں پوشیدہ ہے اور کبھی کبھی ادھوری خوشی مکمل غم سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے، محبت اگر دو لفظوں کی صورت میں ہو تو کبھی نہ کبھی دائرہ بن کر مکمل ہو جاتی ہے، لیکن اگر یہی محبت تکون کی صورت اختیار کر لے تو اس کے تین زاویے کبھی جڑ نہیں پاتے۔ شاید میں کبھی شانی کو منا ہی لوں، آپ نے ہمارے لیے جتنا کچھ کیا، میں شکریہ ادا کر کے اس کی اہمیت کم نہیں کروں گی، آپ کو اگر وقت ملے تو شانی سے بات کیجیے گا، اسے آپ کی باتیں جلد سمجھ میں آتی ہیں۔'' فون رکھ دینے کے بعد بھی میں بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ جانے اس محبت کے اور کتنے روپ دیکھنا باقی تھے۔

اگلی صبح میں کمرے سے باہر نکلا تو شہریار کے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ شہریار بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ دو انمول انسان اسے ٹوٹ کر چاہتے تھے، لیکن پھر بھی وہ خالی ہاتھ اس گھر سے واپس جا رہا تھا۔ شیخ صاحب جیسا بڑے دل کا اور وضع دار انسان بھی میں نے کم ہی دیکھا تھا، ان کے ماتھے پر ایک شکن بھی نہیں تھی کہ جس سے کوئی ان کی آزردہ دلی کا اندازہ لگا سکے۔ انہوں نے حسب معمول ہنستے بولتے شہریار کا سامان اپنی گاڑی میں رکھوایا۔ شانی اور دھانی بھی بظاہر بڑھ چڑھ کر ہر کام میں حصہ لے رہی تھیں، لیکن ان دونوں کی آنکھوں میں لکھی تحریر صاف بتا رہی تھی کہ ایک اور محبت کی کہانی بنا کسی انجام کے ختم ہو رہی ہے اور اس کہانی کے آخر میں بنا سوالیہ نشان ہمیشہ کے لیے اس کہانی کے ساتھ جڑا رہے گا۔ شہریار گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے آخری مرتبہ ہماری جانب مڑا۔ وقار نے اس سے پوچھا۔ ''شہریار بھائی.....! آپ پھر کب آئیں گے، ہم سب آپ کو بہت مس کریں گے۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں جلد آؤں گا۔'' شانی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ میں نے دھانی کو خود کو سمیٹتے ہوئے دیکھ کر لقمہ دیا۔ ''اسے جلد آنا ہی پڑے گا، ورنہ پیانو پر بیٹھی گنگناتی زیبا بیگم کس سے کہیں گی کہ کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجا دی۔'' سب ہنس پڑے۔ شہریار نے شانی اور دھانی پر آخری نظر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ جانے اس لمحے مجھے سانول کی زبانی سنا ایک صحرائی گیت اس شدت سے کیوں یاد آیا، جس میں محبوبہ اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کو دُہائی دیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ اس کا محبوب اسے بھول جائے گا، چاہے وہ لاکھ قرآن پر ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلائے، پر وہ جانتی ہے کہ یہ صرف وقتی جوش ہے اور محبوبہ کی قسمت میں تو ازل سے جدائی کی موت ہے، کیوں کہ اس کا محبوب اسے بھول جائے گا۔

تے کوں یاد ہوسی میں آکھیا سی
دلدار مِٹھا توں بُھل ویسیں
دل دل قرآن تے ہتھ نہ رکھ
نہ قسماں چا، توں بُھل ویسیں
کجھ سوچ سمجھ تے فیصلہ کر
نہ جوش دکھا، توں بُھل ویسیں
تیرے باہوں میں نئی جی سکدی
نہ ظلم کما توں بُھل ویسیں
دلدار مِٹھا..... توں بُھل ویسیں

(باقی آئندہ).....

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

.....☆ہاشم ندیم☆.....

کبھی کبھی پیار کھو دینے کے بعد ہمارے لیے کسی انمول ہیرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کھوئی ہوئی محبت ''کوہِ نور'' بن جاتی ہے، کھویا ہوا پیار ''شالیمار'' بن جاتا ہے۔ دھانی اور شاہانہ کی چاہت بھی شالیمار بن چکی تھی۔ شہریار کے جانے کے بعد اگلے روز سلطان بابا بھی اسپتال سے فارغ ہو کر شیخ صاحب کے ہاں چلے آئے، ان کا ارادہ جلد کوچ کرنے کا تھا، لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت اور شیخ صاحب کے اصرار پر نہ، نہ کرتے ہوئے بھی ایک ہفتہ مزید بیت ہی گیا۔ اب بظاہر ان کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی، لیکن میرے اندر کی بے چینی اب رفتہ رفتہ کسی لاوے کی شکل اختیار کرنے لگی تھی اور اب تو رنگوں کا میری بصارت سے کچھ لمحوں کے لیے روٹھنا، ہر چوبیس گھنٹے میں ایک معمول کی شکل اختیار کرنے لگا تھا، لیکن سبھی رنگ نہیں روٹھتے تھے، بس چند تھے، جو کسی پرانی تصویر کی طرح درمیان سے غائب ہو جاتے تھے اور یہ چند لمحے مجھ پر کس عذاب کی صورت بیتتے تھے، یہ بس میرا دل ہی جانتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے لگتا تھا، جیسے میری نسوں میں خون نہیں، گرم کھولتا سیال مادہ دوڑ رہا ہو، میری سانسیں کسی گرم بھٹی کی دھونکنی بن جاتی تھیں اور میں یوں ہانپنے لگتا تھا، جیسے میلوں دور سے دوڑتے ہوئے آیا ہوں، لیکن میں نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ میری یہ حالت کسی پر ظاہر نہ ہو، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے سلطان بابا کو مزید دیر ہو۔ وہ پہلے ہی مشرقی ساحل پر بنی کسی مسجد کی منزل تک پہنچنے کے لیے کئی مرتبہ بے چینی کا اظہار کر چکے تھے، اب اگر ایسے میں، میں اپنی بگڑتی طبیعت کا رونا لے کر بیٹھ جاتا، تو وہ ضرور علاج کے مخمصے میں پڑ جاتے اور ہمیں نہ جانے مزید کتنے دن یہاں رکنا پڑتا اور پھر میرا کیا تھا، میرے اندر تو جانے ایسے کتنے لاوے میری روح کو جھلسانے کے لیے ہر دم بہتے رہتے تھے اور پھر خود ہی تھک کر سرد بھی ہو جاتے تھے۔ سوچا یہ تپش بھی دل کے سرد خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر خود ہی برف ہو جائے گی۔

جس دن ہمیں شیخ صاحب کی کوٹھی سے رخصت ہونا تھا، اس روز بہت سے کالے بادل ہمیں الوداع کہنے کے لیے آسمان پر جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سلطان بابا سے سن رکھا تھا کہ ہم جس مشرقی ساحل کی جانب جا رہے تھے، وہاں بارشیں بہت برستی ہیں۔ شاید یہ گھنیرے بادل بھی اسی دیس سے آئے ہوں۔ مہمان جب راستوں سے نا آشنا ہوں تو میزبانوں کو انہیں لینے، ان کی بستی جانا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے دھانی، شانی، وقار اور شیخ صاحب گیٹ تک آئے، پھر وہی الوداع، پھر وہی رگوں کے سرے تک پھیل جانے والی اداسی..... جب ہمیں اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دن ہر رشتے، ہر جگہ، اس جہان ہی سے رخصت ہو جانا ہے، تو ہم اپنے دل کے دھاگوں کی گرہیں یہاں وہاں کیوں باندھتے پھرتے ہیں۔ سلطان بابا نے تینوں بچوں کو فرداً فرداً سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی، سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ دھانی ان سے نظر نہیں ملا پائی، وہ کچھ دیر اس کے پاس ٹھہر کر بولے ''جن کے من کے آئینے اتنے اجلے ہوں، ان کے مقدر کبھی دھندلے نہیں ہوتے، ہم جو کھو دیتے ہیں، قدرت اس سے بہتر ہمارے لیے پہلے سے چُن رکھتی ہے، بس اتنا یقین رکھنا۔'' دھانی رو پڑی۔ پھر شانی اور پھر شیخ صاحب بھی اپنی پلکیں پونچھتے نظر آئے۔ مجھے اسی لیے یہ الوداع سدا سے کاٹ جاتے تھے۔ شیخ صاحب بضد تھے کہ ہم ان کی گاڑی مع ڈرائیور اپنے سفر کے پہلے حصے کے لیے استعمال کریں، لیکن سلطان بابا نے بس کے سفر کو ترجیح دی۔

بس نے ہمیں قریباً چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد ایک دریا سے منسلک قصبے تک پہنچا دیا، جہاں سے اگلے روز صبح ہوتے ہی ایک چھوٹے سے اسٹیمر نے ہمیں پہلے سمندر کی ایک بڑی شاخ اور پھر کھلے سمندر میں پہنچا دیا۔ میرا شہر اسی سمندر کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ میں اسٹیمر کے عرشے سے ٹکرانے والی لہروں کو دیکھ کر سوچتا رہا کہ جانے ان میں سے وہ کون سی لہر ہوگی، جو اس ساحل کو چھو کر آئی ہوگی، جس سے ذرا پرے میرے دل کے ساحلوں کی حق دار رہتی ہے، پھر اچانک میرے من میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے، ان میں کوئی ایسی لہر بھی ہو، جو اس ماہ وش کے نازک پاؤں چھو کر آئی ہو۔ زہرہ کو بھی تو ساحل کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا بہت پسند تھا، ضرور یہ جھاگ اڑاتی، مسکراتی اور شریر سی ہنستی ہوئی بے باک لہریں اس لالہ رخ کی قدم بوسی کر کے ہی مجھ تک پہنچی ہوں گی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دل کے دریا، سمندر سے بھی گہرے ہوتے ہیں ''دل دریا، سمندروں ڈونگے'' لیکن زہرہ کی یاد نے پل بھر میں میری آنکھوں میں نمکین پانی بھر دیا تھا۔ وہ مجھے اس بات کا احساس دلا رہا تھا کہ میرے دل کا دریا کب سے سمندر میں تبدیل ہو چکا ہے، ورنہ اتنا نمکین پانی میری آنکھوں کو ہر لمحہ جلانے کے لیے کہاں سے آتا۔ میری پتلیوں کا یہ وضو تو شاید ازل سے جاری و ساری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد اسٹیمر نے ہمیں ایک کٹے پھٹے ساحل پر اتار دیا، جہاں کھڑی مخصوص اونٹ گاڑیوں پر ہمارے سفر کا آخری حصہ طے ہونا تھا۔ شام ڈھلے جب ڈوبتے سورج کی کرنوں کا سونا پورے سمندر کو ایک سنہری قالین میں تبدیل کر رہا تھا۔ میں اور سلطان بابا اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔ ایک چھوٹی سی مسجد، جو سمندر کی لہروں سے ٹکراتی پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی تھی۔ پیش امام کا نام مرتضیٰ تھا، جو ہمارے استقبال کے لیے مسجد کے دروازے کے باہر ہی کھڑے تھے۔ ان کا گھر پہاڑی کے عقب میں واقع چھوٹی سی بستی میں تھا اور ان کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر قریباً نو، دس برس ہوگی، ہمیں پہاڑی ٹیلے کی جانب بڑھتا دیکھ کر پہلے ہی دوڑتا ہوا اپنے بابا کے پاس جا کر ہمارے آنے کی منادی کر چکا تھا۔ جب مرتضیٰ صاحب ہم سے مل رہے تھے، تو وہ ان کے عقب میں کھڑا اپنی حیران آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا نے اسے پکارا تو وہ جلدی سے اپنے بابا کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اس کا نام اشرف المرتضیٰ تھا۔ جانے دنیا کے سبھی بچوں کی روحیں ایک سی

کیوں ہوتی ہیں۔ صاف، شفاف، نرم، ملائم، شرمیلی اور بھولی سی..... ہم تمام عمر اپنے بچپن والی روح کی شفافیت کو اپنے اندر قائم کیوں نہیں رکھ پاتے؟

مرتضیٰ صاحب نے سلطان بابا کو حجرے میں چلنے کی دعوت دی اور میں نے بھی کچی اینٹوں والے صحن میں ان کے پیچھے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر وہی بصارت سے رنگ نچوڑ لینے والا دورہ میری نسوں میں آگ بھر گیا۔ ایک چنگاری سی میرے لہو میں دوڑی اور میں ایک لمحے کے لیے ڈگمگا سا گیا۔ مرتضیٰ صاحب جلدی سے میری جانب بڑھے۔ ''کیوں نوجوان! سب ٹھیک تو ہے نا.....؟'' میں نے بڑی مشکل سے اپنی سلگتی سانسوں پر قابو پایا۔ ''جی.....! میں ٹھیک ہوں، بس شاید لمبے سفر کی تھکن ہے، کچھ دیر آرام کروں گا تو سنبھل جاؤں گا۔'' سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا، لیکن چپ رہے۔ کچھ ہی دیر میں مرتضیٰ صاحب نے خود ہی عشاء کی اذان بھی دے دی اور ساحلی بستی سے دس بارہ مکین نماز کے لیے جمع ہوتے گئے۔ سبھی اپنے حلیے سے مچھیرے لگ رہے تھے۔ مرتضیٰ صاحب کے بے حد اصرار کے باوجود سلطان بابا نے جماعت پڑھوانے کی ذمے داری مرتضیٰ صاحب ہی کو سونپ دی اور ہم نے اس ساحلی مسجد میں عشاء کی باجماعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد سبھی نمازیوں نے فرداً فرداً سلطان بابا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ رات کا کھانا مرتضیٰ صاحب کے گھر ہی سے آچکا تھا اور اشرف المرتضیٰ، جو اب دھیرے دھیرے ہم سے مانوس ہوتا جا رہا تھا، ایک جانب شرمایا سا بیٹھا، اپنے بابا کو دسترخوان پر چاول اور خشک مچھلی کے نمکین قتلے لکڑی کی پلیٹوں میں سجاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مرتضیٰ صاحب نے ہمیں کھانے کے دوران بتایا کہ یہاں کی آب و ہوا میں شدید سیلن اور نمک کے مخصوص ذرات کی موجودگی کی وجہ سے لوہے، تانبے یا سلور کا کوئی بھی برتن استعمال نہیں کیا جاتا، کیوں کہ وہ ہفتوں ہی میں زنگ آلود ہو کر گل جاتا ہے، لہٰذا یہاں کی تعمیر میں بھی زیادہ تر اسی مخصوص لکڑی کا استعمال کیا جاتا ہے، جس سے بنے برتنوں میں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ سمندر کی تیز ہوا حجرے کی بناء شیشے کی کھڑکیوں اور روشن دانوں سے پار ہوتے ہوئے ایک عجیب سا ساز بجا رہی تھی، جیسے کوئی ماؤتھ آرگن اپنے ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہو۔ کچھ دیر بعد مرتضیٰ صاحب اپنے بیٹے سمیت رخصت ہو گئے۔ سلطان بابا کچھ دیر ستانے کی غرض سے لیٹ گئے اور میں خاموشی سے حجرے سے باہر نکل آیا۔ باہر میرے سبھی دوست تارے، گہرے نیلے آسمان پر اپنی محفل سجا چکے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکائے۔ میں نے ان میں سے سب سے زیادہ روشن اور چمکتے تارے سے زہرہ کا پوچھا۔ ''کیسی ہے وہ.....؟'' تارے نے سمندر کی مغربی سمت جھانکا اور ہنس کر بولا۔ ''وہ بھی تمہاری طرح اداس ہے..... اور اپنے گھر کی وسیع چھت پر ایک آرام دہ کرسی ڈالے ہم سے تمہاری باتیں کر رہی ہے، تمہارا پتا پوچھ رہی ہے.....'' جانے کیوں اس لمحے مجھے ان ستاروں کی قسمت پر بہت رشک آیا۔ وہ آسمان کی چھت پر لٹکے پوری دنیا میں جب چاہیں، جسے چاہیں دیکھ سکتے تھے۔ کاش میں بھی آسمان کا ایک تارہ ہوتا، بہت چمک دار نہ سہی، مٹیالا اور مدھم ہی سہی، اک آوارہ تارہ.....! نصف رات بیت چکی تھی۔ میں نے پہاڑی ٹیلے سے اٹھنے کا ارادہ کیا اور ٹھیک اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کسی بڑی گاڑی کے انجن کی آواز سنی ہے۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ہاں واقعی جس ٹیلے کی چوٹی پر میں بیٹھا ہوا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر درمیان کی ایک تنگ گھاٹی سے متصل، ایک اور ٹیلے کی چوٹی بھی تھی اور کسی گاڑی کی بیک لائٹس روشن ہو کر دھیرے دھیرے اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ مطلب یہ کہ گاڑی پہلے ہی سے وہاں پارک تھی اور اب واپس جا رہی تھی۔ اس ویرانے میں اتنی رات گئے یہ کون تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ ہوگا کوئی میری طرح رات، تنہائی، سمندر اور تاروں سے بات کرنے والا.....!

فجر کے بعد اگلی صبح میری آنکھ لگی، تو پھر اٹھتے اٹھتے بہت دیر ہو گئی۔ سلطان بابا نے بھی جانے کیوں سورج نکلنے سے پہلے حسبِ معمول مجھے نہیں جگایا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو اپنے اردگرد سلطان بابا، مرتضیٰ صاحب، اشرف اور ایک انجان شخص کو پریشان سا بیٹھا دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میرے سر میں درد کی ایک شدید ٹیس اٹھی۔ سلطان بابا نے جلدی سے مجھ سے پوچھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے میاں.....؟'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''مجھے کیا ہوا، میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں، بس ذرا سر میں درد ہے، شاید رات کو نیند نہ آنے کی وجہ سے!'' ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ انجان شخص نے میری نبض تھامی۔ ''ایسے دورے کب سے پڑ رہے ہیں آپ کو.....؟'' میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گہری سی سانس لی۔ ''فجر کی نماز پڑھ کر جب تم کمرے میں لوٹ رہے تھے، تو اچانک چکرا کر کمرے کی چوکھٹ ہی پر گر گئے تھے، تمہاری سانس بے قابو ہونے لگی تھی اور شاید ہونٹوں کے کناروں سے کف بھی بہنے لگا تھا، مرتضیٰ صاحب نے فوراً اپنی بستی کے حکیم ریاض السلام صاحب کو بلوا لیا اور تب سے ہم سب تمہارے سرہانے ہی بیٹھے ہیں، حکیم صاحب کی تمہارے حلق میں انڈیلی گئی دوا کا اثر ہوا تو سہی، پر بہت دیر سے!'' میں حیرت سے منہ کھولے سلطان بابا کی زبانی یہ تمام روداد سن رہا تھا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں تھا کہ میں صبح دروازے کی چوکھٹ ہی پر گر گیا تھا۔ ہاں، کمرے میں آنے تک کی تمام جزئیات میرے ذہن کی سلیٹ پر بالکل واضح تھیں، لیکن اس کے بعد سب کورا تھا۔ میں نے بادل نخواستہ حکیم صاحب کو گزشتہ چند روز سے اپنے اندر ہونے والی آتشی جنگ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ دن میں دو چار مرتبہ چند لمحوں کے لیے میری بصارت بے رنگ بھی ہونے لگی تھی۔ حکیم صاحب پریشانی سے میری بات سنتے رہے اور پھر انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''ایک بات بتائیے، ماضیِ قریب میں آپ کے ساتھ کسی جانور کے کاٹنے یا پنجے گوشت تک پیوست ہو جانے کا واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ خاص طور پر کسی کتے سے کوئی مڈبھیڑ تو نہیں ہوئی آپ کی؟'' میں حکیم صاحب کی بات سن کر اچھل ہی تو پڑا۔ میں نے انہیں مناسب الفاظ میں بتایا کہ کچھ عرصہ قبل ایسا واقعہ ضرور پیش آیا تھا کہ میں کتوں کے جبڑے کی کاٹ سے تو کسی طور بچتا ہی رہا، لیکن ان کے پنجے میری جلد میں کئی بار پیوست ہوئے تھے، شاید دانت بھی اس دھینگا مشتی میں میرا ماس چھو گئے ہوں، پر میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اسی روز چند گھنٹوں کے اندر اندر مجھے مطلوبہ دوا و ویکسین کی صورت میں انجیکٹ بھی کر دی گئی تھی، کیوں کہ میں فوجی چوکی کے مستند ڈاکٹر تک خوش قسمتی سے پہنچ گیا تھا۔ حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ پر جن کتوں نے حملہ کیا تھا، انہیں اگلے 72 گھنٹے یا پھر چند دن زیرِ معائنہ رکھا گیا تھا، ان میں سے کسی کی موت تو واقع نہیں ہوئی تھی؟'' میں ایک بار پھر الجھ گیا۔ اب میں انہیں اپنی اس عجیب و غریب جنگ کے بارے میں کیا بتاتا، جس میں میری اور مجھ پر حملہ آور فوج کے سبھی رکن کتے ہی تھے اور بدقسمتی سے سبھی لڑاکوں نے اسی میدان میں جان دے دی تھی۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا اور دھیرے سے بولا۔ ''دراصل وہ تین چار کتے تھے اور مجھ پر حملے کے دوران ہی انہیں مار دیا گیا تھا، لہٰذا معائنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔'' حکیم صاحب نے تشویش بھرا لمبا سا ہنکارا بھرا۔ ''اوہ.....! میں سمجھا.....'' سلطان بابا نے حکیم صاحب سے پوچھا۔ ''کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے نا جناب.....؟'' حکیم صاحب کچھ ہچکچائے۔ ''مکمل بات تو تفصیلی معائنے ہی سے پتا چل سکے گی..... مختصراً اتنا بتا سکتا ہوں کہ بروقت دوا مل جانے کے باوجود، شاید بلکہ خدانخواستہ کچھ

زہریلے مادے ان کے خون میں پرورش پا چکے ہیں، میں اپنی سی کوشش تو ضرور کر رہا ہوں، لیکن بہتر ہوگا کہ انہیں پہلی فرصت میں یہاں سے تیس میل دور پہلے بڑے ساحلی شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو بھی دکھا دیا جائے، میری حکمت میں جو اثر ہے، وہ سب فی سبیل اللہ آپ لوگوں کے لیے حاضر ہے، لیکن زیادہ دیر نہ کیجیے گا۔'' حکیم صاحب اپنی دوائی کی ایک اور خوراک پلانے کے بعد اور ہمارے ذہنوں میں اتھل پتھل مچانے کے بعد اپنی دواؤں کی صندوقچی اٹھا کر چلتے بنے۔ سلطان بابا اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر بس میری فکر میں پڑ چکے تھے۔ دوپہر تک تو وہ مجھ سے باقاعدہ کچھ خفا سے بھی تھے کہ میں نے انہیں پہلے یہ سب کیوں نہیں بتایا۔ مجبوراً ظہر کے بعد مجھے زبردستی ان کے سامنے مسجد ہی میں صف پر چوکڑی مار کر بیٹھنا پڑ گیا۔ ''میں آپ کا سفر کھوٹا نہیں کرنا چاہتا تھا، بس اس لیے خاموش رہا، آپ بے فکر رہیں، میں جلد تندرست ہو جاؤں گا۔ ہاں، لیکن اگر آپ اسی طرح روٹھے رہے، تو میں واقعی پورا مریض بن کر بستر پر پڑ جاؤں گا۔'' میرا حربہ کارگر رہا اور وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔ ''بہت ضدی ہو، لیکن اب ہم یہاں سے تب ہی آگے سفر کریں گے، جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' اور پھر میرے ذہن میں بہت عرصے کا اٹکا سوال زبان سے پھسل ہی پڑا۔ ''ہم جن منزلوں کی طرف سفر کرتے ہیں، ان کا تعین آپ کیسے کرتے ہیں.....؟ مثلاً جبل پور، پھر کال گڑھ اور اب مشرقی ساحل کی یہ مسجد..... سفر کا یہ نقشہ کون ترتیب دیتا ہے؟'' وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔ ''کچھ اشارے مل جاتے ہیں، کبھی کسی حاجت مند دوست کا بلاوا آ جاتا ہے، کبھی وقت ملے اور میسر ہو تو نقشہ دیکھنا، امید ہے تمہیں سمجھ آ جائے گی۔'' حسب معمول میرے ذہن کی کچھ گرہیں کھلیں، پر کچھ نئی گرہیں مزید پڑ گئیں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ کہیں سے بھی نقشہ میسر ہوا، تو اپنے آج تک کے سفر کا راستہ جوڑ کر ضرور دیکھوں گا۔ میری حالت شام تک وقفے وقفے سے کئی مرتبہ بگڑتی گئی اور عصر کے بعد تو گرمی اور حبس سے میرا دم اس قدر گھٹنے لگا کہ میں گھبرا کر ٹیلے سے نیچے ساحل کی طرف چلا آیا۔ سامنے ہی اشرف نیلی اور زرد دھاریوں والی بڑی سی پتنگ ہوا میں بلند کیے دوڑ رہا تھا۔ پتنگ کو ڈور کی ڈھیل ملی، تو وہ ہواؤں میں بلند ہوتی گئی۔ میں بہت دیر تک ڈور، پتنگ اور آسمان کا یہ کھیل دیکھتا رہا، دفعتاً اشرف کے ہاتھ میں تھمی کچی ڈور کو ایک جھٹکا لگا اور پتنگ آسمان میں ڈولنے لگی، ڈور ٹوٹ چکی تھی، اشرف بہت دیر تک ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی پتنگ کو دوبارہ پکڑنے کے لیے دوڑتا رہا، لیکن کٹی پتنگیں اپنے مالک کے ہاتھ بھلا کب آتی ہیں، انہیں تو آسمان چھونے کی خواہش مزید اور مزید اونچا اڑا لے جاتی ہے۔ اشرف کی پتنگ بھی ساحل کی ہوا کے سنگ بادلوں سے پرے جا چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اشرف منہ بسورتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کیا ہوا؟ کٹ گئی پتنگ.....؟'' ''ہاں آج پہلی بار میں نے اتنی اونچی اڑائی تھی پر.....!'' اشرف ابھی تک افسردہ تھا۔ ''کوئی بات نہیں، دراصل تمہاری پتنگ بادلوں کو پسند آ گئی تھی، سو ان کا دل بھی چاہا کہ وہ اس سے کھیلیں، لہٰذا تمہاری پتنگ وہاں چلی گئی۔'' اشرف کچھ حیران ہوا۔ ''اچھا.....! کیا بادل بھی پتنگ اڑاتے ہیں؟'' میں مسکرایا ''ہاں بادل ہی تو پتنگوں کے سب سے اچھے دوست ہوتے ہیں، تب ہی تو پتنگیں ان سے باتیں کرنے کے لیے اتنا اونچا اڑتی ہیں۔'' اشرف کے چہرے پر چھایا تکدر دور ہونے لگا۔ ''اچھا پھر تو کوئی بات نہیں، بادل تو مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں، میرے بھی دوست ہیں۔'' میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ اپنے اندر یہ بادلوں اور پتنگوں کی دوستی سدا زندہ رکھنا۔ اشرف اپنی دھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔ ''میں بڑی گاڑی والے صاحب سے کہوں گا، وہ مجھے ایک نئی پتنگ لا دیں گے، فکر کی کوئی بات نہیں۔'' ''یہ بڑی گاڑی والے صاحب کون ہیں؟'' اشرف نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ایک بہت بڑی سی گاڑی والے صاحب تقریباً ہر تیسرے چوتھے دن ساحل پر شام کو کچھ دیر کے لیے آتے ہیں، کبھی کبھی ان کے ساتھ شہر کی کوئی میم صاحب بھی ہوتی ہیں، دونوں کچھ دیر کے لیے دوسری جانب والے ٹیلے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ چائے، کافی پیتے ہیں اور کبھی کبھار اپنے ساتھ پتنگ اور ڈور بھی لاتے ہیں، یہ پتنگ بھی اسی صاحب نے اشرف کو دی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں گزشتہ رات والی گاڑی کی بیک لائٹس چمکیں۔ ہو سکتا ہے یہ وہی صاحب ہوں، جن کی تعریف میں اشرف اس وقت زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کچھ دیر میں سورج ڈھلنے لگا، تو مرتضیٰ صاحب مسجد والے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اشرف کو آوازیں دینے لگے۔ اشرف ابھی مجھے اپنے جگری دوست جانو کی کہانی مزید سنانا چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ دونوں ہیڈ ماسٹر صاحب سے نظر بچا کر کبھی کبھی آدھی چھٹی کے وقت بھی ساحل پر سیپیاں اور گھونگے جمع کرنے آ جاتے تھے، لیکن اپنے بابا کی مستقل پکار سن کر اسے بادل نخواستہ اٹھ کر جانا ہی پڑا۔ میں بھی مغرب کی اذان سن کر اوپر مسجد میں چلا آیا۔

عشاء کے بعد گزشتہ روز کی طرح مرتضیٰ صاحب کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی چکر لگا گئے تھے۔ نہ جانے ہر بار وہ میری نبض دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر کون سی ان دیکھی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے ہر بار وہ کچھ کہتے کہتے رک سے جاتے تھے۔ رات بہت دیر تک سلطان بابا میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ میرا جسم اندر سے بری طرح جل رہا تھا، بے چینی اتنی بڑھی کہ میں بہت دیر تک اِدھر اُدھر سر پٹختا رہا، پھر نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ بس مجھے اتنا ہی یاد رہا کہ سلطان بابا دھیرے سے میرے سرہانے سے اٹھ کر حجرے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے، پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی بالٹی بھر بھر کر کھارا نمک ملا پانی میرے چہرے پر پھینک رہا ہو۔ تیسرے چھینٹے پر میں نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں، تو سر پر حجرے کی چھت کی جگہ کھلا آسمان دیکھ کر چند لمحے تو میں سٹپٹا ہی گیا اور پھر پانی کی ایک تیز لہر نے میرے پہلے سے بھیگے ہوئے تن کو مزید بھگو دیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور میں اس وقت حجرے کے بجائے ساحل پر گیلی ریت میں سنا ہوا تر بتر سا بیٹھا ہوا تھا۔ یا خدا.....! میں یہاں کیسے پہنچا.....؟ ابھی رات کو تو میں اپنے کمرے میں ہذیانی حالت میں اپنے بستر میں کسمسا رہا تھا، پھر یہ ساحل، یہ کھلی فضا.....؟ میں ابھی حیرت کے پہلے شدید جھٹکے ہی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ اچانک دور سے کچھ لوگ ہجوم کی صورت میں مجھے اپنی جانب بڑھتے نظر آئے۔ ان کے ہیولے دھیرے دھیرے دھندلی شبیہوں سے واضح خاکوں میں تبدیل ہوئے، تو سب سے آگے باوردی پولیس والوں کی ایک ٹولی نظر آئی، پھر ایک سپاہی کی مجھ پر نظر پڑی اور وہ مجھے دیکھتے ہی دور سے چلایا۔ ''وہ رہا قاتل جناب.....!'' پھر کوئی زور سے گرجا ''لپکو..... پکڑو..... قاتل جانے نہ پائے۔'' سب پولیس والے میری جانب دوڑے۔

(باقی آئندہ)

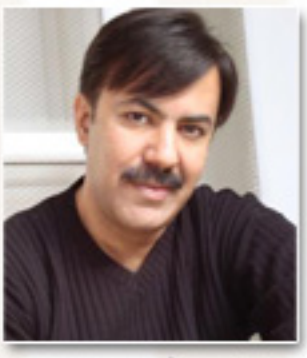

.....☆ہاشم ندیم☆.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

میں ہکا بکا سایوں ہی اپنی جگہ جما بیٹھا رہا اور کچھ ہی دیر میں پولیس والے میرے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے لپک کر میری کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ عقب سے چند اور حوالدار بھی نمودار ہو گئے اور پھر ایک افسر گرجا ''کون ہو تم..... اور اس وقت یہاں ساحل پر کیا کر رہے ہو؟'' ''میں عبداللہ ہوں۔ سامنے والی چھوٹی پہاڑی پر واقع مسجد میں رہتا ہوں۔'' ایک سپاہی میرے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر بولا ''یہ جھوٹ بول رہا ہے جناب، لاش کے قریب جو قدموں کے نشان ہیں، وہ سیدھے یہاں آ کر ختم ہوتے ہیں۔ یہی اُس لڑکی کا قاتل ہے۔'' میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے، یہ لوگ کس لڑکی کی لاش کا ذکر کر رہے تھے اور میرے قدموں کے نشان وہاں تک کیسے پہنچے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں پوری بستی ساحل کے گرد جمع ہو چکی تھی۔ افسر کے حکم پر مجھے ہتھکڑی پہنا دی گئی اور پھر تقریباً گھسیٹتے ہوئے جائے وقوعہ تک لے جایا گیا۔ کچھ پولیس والے زمین پر چونے سے ایک دائرہ لگائے کھڑے تھے۔ درمیان میں سفید چادر کے نیچے ایک آڑھا ترچھا جسم پڑا ہوا تھا۔ چادر کے نیچے بھی جسم کے زاویوں کے متوازی سفید چونے کی لکیریں جھانک رہی تھیں۔ دفعتاً زوردار ہوا کے جھونکے سے جسم کے چہرے سے چادر ہٹ گئی۔ 23 چوبیس سال کی ایک معصوم سی لڑکی آنکھیں موندے پڑی تھی۔ چہرے پر چند گہری خراشوں کے علاوہ اور کوئی ایسی نشانی نہیں تھی کہ جسے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ کر سکے کہ وہ اپنی سانسیں ہار چکی ہے، اس وقت بھی وہ اتنے قریب سے بھی گہری نیند میں سوئی ہوئی ہی لگ رہی تھی، جیسے ابھی پٹ سے آنکھیں کھول دے گی۔ میں ابھی تک پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد ہی سامنے سے مرتضیٰ صاحب اور سلطان بابا پریشانی کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے آتے دکھائی دیے۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ کر سلطان بابا کو جیسے کچھ ہونے لگا، وہ لپک کر میرے قریب آئے اور میرے ہاتھ ٹٹول کر کہنے لگے ''یہ ہتھکڑیاں کیسے عبداللہ میاں، یہ سب کیا ماجرا ہے؟'' اتنے میں ایک سرکاری جیپ ساحل پر نمودار ہوئی اور تمام پولیس والے ہوشیار اور مؤدب ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹایا۔ ''اے ہٹو، ایک طرف ہو جاؤ، ایس پی صاحب آ رہے ہیں'' ایس پی کے قریب آتے ہی سب پولیس والوں نے کھٹا کھٹ سلیوٹ کیے۔ افسر نے جواباً سر ہلایا اور میری طرف چلا آیا۔ اور غور سے میری طرف دیکھ کر بولا ''ہونہہ..... تو یہ ہے وہ لڑکا؟'' سلطان بابا نے کھنکار کر ایس پی کو اپنی جانب متوجہ کیا ''کیا جرم کیا ہے عبداللہ میاں نے..... آپ نے اسے ہتھکڑیاں کیوں لگا رکھی ہیں؟'' افسر نے غور سے سلطان بابا کو دیکھا ''یہ آپ کا بیٹا ہے؟'' ''بیٹے سے کچھ بڑھ کر ہی ہے میاں..... رشتے صرف خون کے ہی تو نہیں ہوتے۔'' ایس پی نے غور سے بابا کو دیکھا ''خوب..... اور آپ کون ہیں؟'' ''ہم دونوں ہی مسافر ہیں۔ ایک ہی راستے کے۔ فی الحال چند دن کے لیے پہاڑی ٹیلے کی اوپر والی مسجد میں بسیرا ہے، پھر آگے بڑھ جائیں گے میاں۔'' افسر نے گہری سانس لی ''لیکن فی الحال شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ اس لڑکے پر خون کا شک ہے ہمیں۔ بظاہر دکھائی دینے والے تمام شواہد بھی اس کے خلاف جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔ ہاں، البتہ آپ میری تسلی کے لیے صرف اتنا بتا دیں کہ آپ کے بیان کے مطابق اگر آپ لوگ اوپر والی مسجد کے حجرے میں مقیم ہیں تو پھر یہ لڑکا اتنی صبح سویرے یہاں ساحل پر کیا کر رہا تھا؟'' سلطان بابا نے لمبا سانس لیا ''میں نہیں جانتا، کیوں کہ میں رات کو عبداللہ کو حجرے ہی میں سوتا چھوڑ گیا تھا۔'' ایس پی نے چونک کر سلطان بابا کو دیکھا ''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس مشکل مرحلے پر بھی سچ کا دامن نہیں چھوڑا، لیکن آپ کا یہ سچ عبداللہ کو ہماری نظر میں مزید مشکوک بناتا ہے۔ بہتر ہوگا آپ کسی اچھے وکیل سے رابطہ کر لیں۔'' پولیس افسر نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا اور وہ لوگوں کے درمیان سے مجھے دھکیلتے ہوئے پولیس کی جیپ کی طرف چل پڑے۔ مرتضیٰ صاحب تو اتنے پریشان تھے کہ ان سے ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ میں نے چلتے ہوئے پلٹ کر سلطان بابا کو کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن میرے سارے لفظ نہ جانے کہاں کھو چکے تھے۔ بھیڑ میں کھڑے حکیم صاحب کی نظریں مجھ سے ملیں اور مجھے لگا کہ ان کے اندر جانے کتنے طوفان امڈ رہے ہیں، لیکن وہ پولیس کے ڈر سے کچھ بول نہیں پا رہے۔ جیپ میں بیٹھتے ہوئے میری نظر آخری بار اس معصوم چہرے پر پڑی، جس کے قتل کا داغ اپنے ماتھے پر سجائے میں پولیس کے گھیرے میں ایک ان جانے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ کیا میرا جنوں اب اپنی آخری حدیں بھی پار کرنے کو تھا۔ بستی والے آپس میں چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ ریت اڑاتی جیپ مجھے لیے تیزی سے ساحل سے دور ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر میں سارا منظر دھندلا گیا۔

تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے بعد ایک خستہ حال سی پرانی عمارت نظر آئی، جس پر برسوں پہلے کیا گیا پیلا رنگ جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا، عمارت کے گیٹ پر پرانے سے ٹین کا ایک زنگ آلود بورڈ جھول رہا تھا، جس پر لکھے لفظ بغور دیکھنے پر بھی بمشکل نظر آتے تھے، میں صرف اتنا ہی پڑھ پایا ''پولیس تھانہ، تحصیل

ماہی'' اور تب تک جیپ تھانے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوگئی۔ ایس پی کے وقوعہ پر پہنچنے سے پہلے، جس تھانے دار نے مجھ سے بات کی تھی، وہ یہاں کا ایس ایچ او تھا، مجھے تھانے دار کے کمرے میں لے جا کر دیوار کے قریب کھڑا رہنے کو کہا گیا۔ پتا چلا کہ ایس پی صاحب ہیڈ کوارٹر یعنی شہر والے دفتر میں بیٹھتے ہیں اور یہاں صرف اس قتل کی اطلاع پر پہنچے ہیں، کیوں کہ مرنے والی شاید خود بہت اہم تھی یا پھر اس کا تعلق شہر کے بہت اہم لوگوں سے تھا۔ ورنہ عام حالات میں ایسے مقدمات خود تھانے دار ہی نپٹا دیا کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں اس تمام واقعے کے دوران ذہنی طور پر بالکل سُن اور یوں بے فکر اور لاتعلق سا تھا، جیسے پولیس قتل کے الزام میں مجھے نہیں، کسی بے گانے کو پکڑ کر تھانے لائی ہے اور میں کسی فلم کے پردے پر یہ سب مناظر دیکھ رہا ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ایس پی صاحب بھی کمرے میں آگئے اور تھانے دار اور چند مؤدب حوالداران کے آس پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ میں نے پہلی بار ایس پی کے سینے پر لگی چھوٹی سی نام کی تختی پڑھی۔ ان کا نام رحمٰن تھا۔ ایس پی نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں داب کر ماچس کے لیے نظر دوڑائی۔ تھانے دار نے جلدی سے بڑھ کر سگریٹ سلگا دیا۔ انہوں نے ایک زوردار کش لے کر دھویں کا مرغولہ فضا میں بکھیرا اور دھویں کی اس نیلگوں چادر سے پرے اپنی گھورتی نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔ ''ہونہہ..... تو عبداللہ نام ہے تمہارا، اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟'' میں نے مختصراً انہیں تفصیل بتائی۔ ''کتنا پڑھے لکھے ہو؟ میرا مطلب ہے مدرسے کی کون سی سند تک پڑھا ہے تم نے اب تک؟'' ''جی مدرسے کی تو کوئی سند نہیں ہے میرے پاس۔ ابھی کچا طالب علم ہوں.....'' میرا جواب سن کر انہیں ذرا حیرت ہوئی، کیوں کہ شاید میری صاف گفتگو سے وہ مجھے دین کا بہت پرانا طالب سمجھ بیٹھے تھے۔ ''اچھا یہ بتاؤ تم رات کو ساحل پر کیا کرنے گئے تھے، جس لڑکی کی لاش کے پاس تمہارے قدموں کے نشان ملے ہیں، تم نے اسے پہلی بار کب دیکھا تھا؟'' ''میں نے پہلی بار اسے آج صبح ہی دیکھا ہے، جب چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے سے کپڑا ہٹ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں رات اپنے حجرے سے ساحل تک کیسے پہنچا اور میرے قدموں کے نشان ریت پر کیسے رہ گئے؟'' تھانے دار سے صبر نہیں ہوسکا اور وہ کڑک کر بولا ''کیوں، کیا تم کو نیند میں چلنے کی عادت ہے۔ سیدھی طرح سے بتاتے ہو یا پھر؟'' ایس پی نے ہاتھ اٹھا کر تھانے دار کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے بولا ''دیکھو، میں نے ابھی تک روایتی پولیس والے حربوں سے خود کو روک رکھا ہے۔ دراصل مجھے لڑکی کے پوسٹ مارٹم کا انتظار ہے۔ شام تک شہر سے رپورٹ آجائے تو میں کسی نتیجے پر پہنچ کر ہی کوئی فیصلہ کروں گا، لیکن تب تک تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو۔ بعد میں اگر مجھے یہ پتا چلا کہ تم نے کوئی غلط بیانی کی ہے، تو تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔'' ''میں نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا..... نہ ہی مستقبل میں میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ آپ اپنی تفتیش مکمل کریں۔ اگر میں گناہ گار ہوں، تو بھی آپ کے اختیار میں ہوں۔ جو سزا مقرر ہوگی، مجھے قبول ہے۔'' رحمٰن صاحب کچھ دیر تک میری آنکھوں میں نہ جانے کیا تلاش کرتے رہے۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ اصل پولیس والے کی نظر کس قدر گہری اور کتنی چبھتی ہوئی ہوتی ہے۔ تب ہی تو انہیں آنکھوں کے راستے روح میں جھانک لینے کا فن آتا ہے۔ اتنے میں ایک سپاہی نے آکر بتایا کہ بستی کے چند بزرگ اور حکیم صاحب ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایس پی نے انہیں دوسرے کمرے میں بٹھانے کا کہا اور مجھے وہیں کھڑا رہنے کا حکم دے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ صرف ایک سپاہی کو میری نگرانی پر مامور رہنے دیا گیا، البتہ میرے ہاتھ اب بھی ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ کھڑے کھڑے میرے پاؤں شل ہونے لگے۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی، پھر اچانک وہی لاوا میرے خون میں پھوٹا اور میری نسوں میں چنگاریاں بھر گیا، سپاہی نے پہلے حیرت سے میری پھولتی سانسوں اور بگڑتی حالت کو دیکھا اور پھر مجھے ڈولتا دیکھ کر وہ باہر کی جانب بھاگا۔ مجھے یوں لگا کہ سامنے والی پہلی دیوار پر کچھ عجیب سے عفریت نما سائے ابھر کر میری جانب بڑھ رہے ہوں اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جانے کتنی صدیوں بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو حکیم صاحب دھیرے دھیرے میرے گال تھپتھپا رہے تھے۔ میں اس وقت حوالات کے سنگی سِل نما چبوترے پر لیٹا ہوا تھا اور میرے آس پاس سلطان بابا کے علاوہ، ایک ڈاکٹر اور ایس پی صاحب بھی موجود تھے۔ حوالات کے چھوٹے سے روشن دان سے اندر آتی دھوپ کے زاویے اور کندن رنگت سے پتا چل رہا تھا کہ سورج ڈھلنے کو ہے۔ گویا میری زندگی سے پھر چند گھنٹے کچھ اس طرح سے دبے پاؤں نکل گئے تھے کہ مجھے خبر بھی نہ ہوسکی۔ سلطان بابا نے مجھے بتایا تھا کہ روزِ قیامت جب ہم دوبارہ جگائے جائیں گے، تو ہمیں یوں لگے گا، جیسے ہم صرف دو گھڑی کی زندگی بتا کر آخرت تک پہنچے ہیں۔ پچھلے چند دنوں سے میری زندگی کے کئی طویل گھنٹے بھی یونہی دو پل کی طرح میری بے ہوشی کے دوران بیت جاتے تھے اور جب میں دوبارہ حواس میں آتا تھا، تو مجھے بالکل اسی طرح محسوس ہوتا تھا، جیسے میں نے ابھی دو پل کے لیے ہی آنکھیں موندی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔'' میں اٹھ بیٹھا ''بہتر ہوں۔ بس سر میں شدید درد ہے۔'' ''ہوں..... تمہارا بلڈ پریشر انتہائی خطرناک حد تک بلند ہوگیا تھا۔ بلڈ پریشر سمجھتے ہو۔ فشارِ خون، خون کا دباؤ'' ''جی سمجھ گیا.....'' رحمٰن صاحب غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سگریٹ حسبِ معمول ان کی انگلیوں کے درمیان سلگ سلگ کر راکھ ہو رہا تھا۔ ''تمہیں یہ بیماری کب سے ہے.....؟'' میں نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا، کیوں کہ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بیماری کا ذکر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے میری نبض تھامی ''ٹیٹنس (Tetnes) کا علاج تو بروقت ہوا لگتا ہے۔ ٹیکوں کے نشان تو ابھی تک واضح ہیں۔ خدا کرے کہ یہ میرے خدشات کے مطابق Rebbies ریبیز کا کیس نہ ہو، لیکن علامات تو سبھی موجود ہیں۔'' حکیم صاحب نے کچھ کہنے کی کوشش کی ''جناب یہ جنوں کا قصہ ہے۔ میرا مطلب ہے، ہماری طب کی زبان میں اسے ''سگ گزیدگی'' بھی کہتے ہیں۔ جب یہ دورہ پڑتا ہے، تو انسان اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ کسی نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور اسے ہیولے دکھائی دینے لگتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اس کی یادداشت کی سلیٹ مٹ جاتی ہے۔ یعنی کہ.....'' ڈاکٹر کو حکیم کی یہ فاضلانہ تقریر شاید کچھ پسند نہیں آئی، وہ ہاتھ جھٹک کر بولا ''ہاں ہاں..... یہی ساری علامات ہوتی ہیں ریبیز کی بھی، لیکن میں نے آج تک ریبیز کے مریض کو زندہ بچتے ہوئے نہیں دیکھا، جب کہ یہ نوجوان تو بائیس روز گزر جانے کے باوجود چل پھر رہا ہے۔'' بحث طول پکڑنے لگی تو ایس پی کو مداخلت کرنی پڑی۔ انہوں نے ذرا سخت لہجے میں دونوں کو تنبیہ کی کہ میرے خون کے نمونے شہر کی لیبارٹری کو بھجوا دیے گئے ہیں، لہٰذا اب رپورٹ آنے ہی پر کوئی رائے دی جاسکتی ہے۔ اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ شاید طب اور جدید میڈیسن (Elopathy) ٹرین کی دو ایسی پٹریاں ہیں، جو ساری عمر ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور جن کی منزل بھی ایک ہوتی ہے، لیکن وہ کبھی مل نہیں پاتیں۔ سلطان بابا اس سارے عرصے میں چپ چاپ بیٹھے مجھے دیکھتے رہے۔ حوالات میں اندھیرا ہونے لگا تو ایک سنتری نے بیرونی

طاق میں رکھا دیا جلا دیا، جو سلاخوں سے پرے اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کی روشنی تو حوالات تک پہنچ رہی تھی، لیکن وہ قیدی کی دست برد سے پرے رہتا تھا۔ کچھ دیر میں باقی لوگ باہر نکل گئے اور صرف میں اور سلاخوں کے پار بیٹھے سلطان بابا حوالات میں باقی رہ گئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ان کی آواز کچھ بھرّائی ہوئی سی تھی۔ ''یہ کیسا مقدر لکھوا کر لائے ہو میاں..... کبھی کبھی تو میں خود بھی خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ کہیں کوئی مستقل جنوں ہی تمہاری تقدیر نہ ہو۔'' میں نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا ''آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ دیوانے سے کوئی پُرسش نہیں، تو پھر دیوانگی تو نعمت ہوئی نا۔ اس فرزانگی کے عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔ بس، یہ دعا کریں کہ میری یہ دیوانگی، یہ جنوں کسی کے لیے باعث نقصان نہ ہو۔'' اتنے میں سپاہی نے آ کر اطلاع دی کہ قیدی کو باقاعدہ ''لاک اپ'' میں بند کرنے کا وقت ہو گیا ہے، لہٰذا ملاقات ختم کی جائے۔

کچھ ہی دیر میں اس خستہ حوالات کی سلاخوں پر بڑا سا لوہے کا تالا ڈال کر اور دروازے کو مقفل کر کے اسے ''لاک اپ'' بنا دیا گیا۔ سلطان بابا کو میں نے بمشکل بستی واپس جانے پر مجبور کیا۔ ورنہ وہ وہیں تھانے کے آس پاس رات گزارنے کی دھن میں تھے۔ ایس پی صاحب کی مہربانی سے مجھے وہ کھانا کھانے کی اجازت دے دی گئی، جو مرتضیٰ صاحب اپنے گھر سے بنا کر لائے تھے، تھانے دار نے مجھے بتایا کہ رحمٰن صاحب واپس شہر جا چکے ہیں اور اب وہ کل صبح آئیں گے اور کل صبح ہی مجھے ریمانڈ کے لیے باقاعدہ کسی عدالت کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ تھانے میں اب باقاعدہ مجھے مریض سمجھ لیا گیا تھا، لہٰذا عملے کا رویہ صبح سے کافی بہتر تھا۔ کچھ ہی دیر میں صرف رات کی ڈیوٹی والے تین چار سپاہی تھانے میں باقی رہ گئے اور عمارت سنسان ہو گئی۔ بس میں، میرا جنوں اور یہ تاریک قفس باقی رہ گئے۔ کس سے گلہ کرتا کہ جنوں کا تو واسطہ ہی سدا سے قفس سے تھا۔ میں تو وہ بدنصیب دیوانہ تھا، جو ناصح کو اپنے ناخن بڑھ جانے کی دُہائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کھسک کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی اور صبح سے ہوتے اب تک کے واقعات کا از سر نو جائزہ لینے لگا۔ اب تک کی کڑیاں کچھ یوں جڑتی تھیں کہ کال گڑھ کے بے زبان دشمنوں کا زہر میرے خون میں شامل ہو کر اسے بھی زہر کر چکا تھا اور اب میرے اندر انہی بھیڑیوں کی درندگی اور وحشت خون بن کر دوڑ رہی تھی، جو مجھے دن کے کسی بھی لمحے میں خود سے بیگانہ کر سکتی تھی۔ پہلی رات فجر کے بعد مجھ پر جنوں کا پہلا طویل دورہ پڑا، لیکن اس وقت خوش قسمتی سے میں حجرے میں سلطان بابا کے سامنے ہی موجود تھا، لہٰذا فوراً حکیم صاحب کو بلوا لیا گیا اور ان کی میرے حلق میں ٹپکائی گئی دوا نے شاید میرا کچھ بھرم رکھ لیا، لیکن دوسری رات میرا جنوں مجھے گھسیٹ کر مسجد سے باہر لے آیا۔ نہ جانے وہ معصوم کون تھی، جو ساحل پر لاش کی صورت موجود تھی اور کون جانے کہ واقعی وہ میرے ہی ہاتھوں اس حال کو پہنچی ہو، کیوں کہ مجھے نہ تو کچھ یاد رہتا تھا اور نہ ہی ایسی حالت میں، میں خود اپنے قابو میں ہوتا تھا، لیکن وہ کون تھی، چہرے اور لباس سے تو پڑھی لکھی اور کسی بڑے گھر کی دکھائی دے رہی تھی، پھر اتنی رات کو اس ویرانے میں کیا کرنے آئی تھی؟ اور اگر میں نے ہی اس کی جان لی تھی تو کیا وہ وہاں تنہا آئی تھی۔ نہ جانے ایسے کتنے سوالوں کے سنپولیے تھے، جو مجھے رات بھر ڈستے رہے۔

رات پل پل کر کے سرکتی رہی اور کھلے روشن دان سے ریت کے ذرے اڑ اڑ کے میرے چہرے، ماتھے اور سر پر گل پاشی کرتے رہے۔ ہاں سچ ہے، دیوانوں کے لیے تو یہ خاک بھی گل جیسی ہوتی ہے اور جو مجنوں جس قدر خاک آلود ہو، اتنا ہی گل زار ہوتا ہے۔ فجر کے بعد ایک سنتری چھوٹی سی چینک میں چائے اور سلور کی ایک چھوٹی سی گلاس لیے نمودار ہوا۔ ''لے بھئی مولوی، چائے پی لے..... بھئی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ خون تیرے ہاتھوں ہوا ہے، لیکن باقی سب کہتے ہیں کہ تجھے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور اسی دورے کے دوران تُو نے اس لڑکی کی جان لے لی..... اب اللہ جانے سچ کیا ہے.....؟'' میں نے سنتری سے پوچھا ''وہ لڑکی کون تھی، جس کے قتل کا الزام میرے سر ہے؟'' سنتری جو خود بھی میرے سامنے سلاخوں کے پار اسٹول پر چائے کا دوسرا گلاس لے کر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے اپنا ماتھا مسلا۔ ''کیا بھلا سا نام تھا اس بے چاری کا..... ہاں..... لیلیٰ..... یہی نام تھا، سنا ہے کسی بہت بڑی کمپنی میں کام کرتی تھی اور اسی کے مالک ریحان کی منگیتر بھی تھی، ویسے ریحان کا نام یہاں سبھی جانتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا سب سے بڑا رئیس ہے۔ وہاں شہر میں اس کی بیسیوں فیکٹریاں ہیں اور وہ خود بھی شہر میں اپنے محل نما بنگلے میں رہتا ہے۔ گورنر اور وزیر اس کے ہاں شام کی چائے پر دعوت ملنا اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ تبھی تو ہمارے ایس پی صاحب بھی اطلاع ملتے ہی دوڑے چلے آئے تھے۔ اس لڑکی کے قتل نے جانے کتنوں کی نیندیں اڑا دی ہیں۔'' میں نے سنتری کو ٹٹولا ''لیکن وہ شہر سے اتنی دور ویرانے میں کیا کرنے آئی تھی، وہ بھی تنہا۔'' ''پتا نہیں، سنا ہے اس کی اور ریحان صاحب کی شادی میں بس تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں نے پہلے بھی ان دونوں کو ساحل پر گھومتے دیکھا تھا۔ شاید شور شرابے اور رش سے گھبرا کر چلے آتے ہوں۔'' سنتری کی بات سنتے ہی میرے ذہن میں اشرف کی بات گونجی۔ اس نے بھی تو کسی میم صاحبہ اور صاحب کا ذکر کیا تھا، جو وہاں اکثر آتے جاتے تھے اور جس نے ننھے اشرف کو پتنگ بھی اڑانے کے لیے دی تھی۔ کہیں یہ وہی صاحب اور میم صاحبہ تو نہیں۔ سنتری نے بات جاری رکھی۔ ''ویسے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کل شام ہی یہ پتا چل گیا تھا کہ لڑکی کی موت بلندی سے نیچے گرنے سے ہوئی ہے، لیکن اس کے گلے پر بھی خراشیں ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ اوپر پہاڑی پر کسی نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی اور شاید اسی دھینگا مشتی میں وہ نیچے گر گئی یا پھر اسے دھکا دے دیا گیا۔ بہر حال، جو بھی ہوا، بہت برا ہوا۔ اس بے چاری نے تو شاید اپنی سہاگ کی مہندی بھی اپنے ہاتھوں میں رچانے کے لیے گیلی کر رکھی ہو۔ تین دن بعد ہی تو اس کی رخصتی تھی۔'' سنتری کی بات سن کر میرا دل ڈوب سا گیا۔ کاش یہ جرم مجھ سے سرزد نہ ہوا ہو۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ سنتری برتن اٹھا کر واپس جا چکا تھا۔ میرے چہرے پر بھی سلاخوں سے چھن کر آتی دھوپ نے سلاخیں سی بنا دیں تھیں۔ چہرے کی ہی کیا بات تھی، اس وقت تو خود میرے سارے وجود میں جانے ایسی کتنی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر میں باہر کچھ ہلچل ہوئی۔ شاید کچھ گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں بھی ابھریں اور کچھ لوگوں کی باتوں کی آواز آنے لگی۔ صبح سویرے جس سنتری نے مجھے چائے لا کر دی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا میری طرف آیا۔ ''چلو حافظ جی..... تمہاری ملاقات آئی ہے۔'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اگر بستی سے سلطان بابا یا کوئی اور ملنے آیا ہوتا تو اسے سیدھا حوالات کی طرف لایا جاتا۔ میں نے سنتری سے پوچھا ''مجھ سے ملنے کون آیا ہے؟'' سنتری نے حوالات کا تالا کھولا ''ریحان صاحب آئے ہیں۔'' میرے ذہن میں ایک چھناکا ہوا ''ریحان..... اس لڑکی کا منگیتر.....؟'' میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا تھانے دار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کوئی شخص نفیس سا سوٹ پہنے منہ موڑے کمرے میں کھڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ کے باوجود اس نے پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا، میں ہلکے سے کھنکارا۔ ریحان نامی شخص دھیرے دھیرے پلٹا۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں اور میں اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گیا۔..... (باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

.....ہاشم ندیم.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

کچھ دیر تک ہم دونوں یوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ میرے سامنے اس وقت وہ شخص کھڑا تھا، جس کی محبت کے قتل کا الزام میرے سر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے نفیس اور سجے ہوئے لوگ کم ہی دیکھے تھے۔ بہترین تراش خراش کا سوٹ، ٹائی، لف لنکس، کوٹ اور پتلون کی گھنٹوں لگا کر نہایت سلیقے سے بنائی گئی کریز اور امپورٹڈ چمکتے ہوئے جوتے۔ کبھی میں بھی لندن کے ہیرالڈز اسٹور سے اپنا ہر دوسرا پیراہن خریدا کرتا تھا۔ اس وقت ریحان کے سرمئی سوٹ کی جیب پر بھی وہی مخصوص چھوٹا مونوگرام جگمگا رہا تھا، لیکن اس کا چہرہ اُسی قدر تاریک تھا۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ جس شخص کی محبت لٹے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں، اُسے اتنا نفیس لباس پہننے اور شیو بنانے کا دھیان بھی کیسے رہ سکتا ہے۔ ریحان کے ہاتھ میں ہوانا کا ایک قیمتی سگار تھا، جس کی میٹھی سی خوش بو کمرے میں چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اس تمام تر اہتمام کے باوجود اس کی حالت ابتر لگ رہی تھی۔ کلین شیو چہرہ، جس پر نسوانیت کی نازک سی جھلک دکھتی تھی، کسی قدر ڈھلکا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے بتا رہے تھے کہ وہ گزشتہ کئی راتوں سے سو نہیں پایا۔ وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ ''تو تم ہو عبداللہ.....؟'' میں چُپ رہا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کسی اعصابی بیماری کا شکار ہو؟''، ''مجھے بھی یہی بتایا گیا ہے، لیکن اگر آپ یقین کر سکتے ہیں تو کم از کم اس بات پر یقین کر لیں کہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے اور مجھے آپ کی منگیتر کی موت پر از حد دُکھ ہوا ہے۔'' ریحان کچھ کھویا کھویا سا تھا، لگتا تھا، جیسے صدمے سے اس کے حواس ابھی تک شل تھے۔ وہ اس طرح بولا، جیسے کوئی اپنے آپ سے بڑبڑاہٹ کرتا ہے۔ ''جسے جانا تھا، وہ تو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ اب یہ کس کے جنوں کا شاخسانہ ہے، اس بحث سے بھلا کیا حاصل۔ میری دنیا تو اُجڑ گئی۔''

اتنے میں باہر کسی سرکاری جیپ کے ہوٹر کی آواز گونجی اور چند لمحوں کے بعد ایس۔ پی رحمٰن صاحب اپنے سر سے پولیس والی ٹوپی اتارتے ہوئے جلدی میں اندر داخل ہوئے ''معافی چاہتا ہوں ریحان صاحب..... راستے میں گاڑی کا انجن گرم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر رُکنا پڑا'' ریحان کا لہجہ بدستور دھیما تھا ''اٹس اوکے۔ آپ نے پیغام بھیجا تھا میرے لیے.....''، ''اوہ ہاں..... آپ کو زحمت دینے کے لیے معذرت۔ میں جانتا ہوں آپ اس وقت کس کرب سے گزر رہے ہیں، لیکن سرکاری فرائض کی ادائیگی کبھی کبھی ہمیں پتھر بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ دراصل آپ کو جائے وقوعہ پر ملی کچھ چیزیں دکھانی تھیں۔ ان کی شناخت اور پولیس کو مطلوب کچھ معلومات کے لیے آپ کو میرے ساتھ جائے واردات تک چلنا ہوگا۔'' ریحان اب تھانے دار کے کمرے میں پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ جس کی ادھوری جھلک میں یہاں حوالات کی سلاخوں سے دیکھ سکتا تھا۔ تھانے دار کے کمرے کا دروازہ لکڑی کی چوکھٹ سے اُدھڑا ہوا تھا اور چوکھٹ پر پڑی چق بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی۔ انہی ادھڑے خانوں میں سے ایک مستطیل خانہ مجھے اس وقت سامنے بیٹھے سگار پیتے ریحان کے چہرے کی نامکمل جھلک دکھا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ یونہی کھویا کھویا رہتا تھا یا پھر اس حادثے نے اس کی یہ حالت کر دی تھی۔ ایس پی کی آواز گونجی ''آپ

کے خیال میں لیلیٰ اتنی رات گئے اس ویرانے میں اکیلے کیوں گئی ہوگی؟'' ''وہ ہمارا پسندیدہ تفریحی مقام تھا۔ میں اور لیلیٰ اکثر وہاں آتے تھے۔ لیلیٰ کو پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا اور شہر کی گہما گہمی اور ہجوم میں یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا، لہٰذا ہم اکثر چھٹی منانے وہاں چلے جاتے تھے۔ کمپنی نے لیلیٰ کو اپنی گاڑی بھی دے رکھی تھی۔ ہوسکتا ہے دل گھبرایا ہو، تو وہ اکیلی ہی اس جانب نکل گئی ہو۔ پہلے بھی جب کبھی ہمیں مخالف سمتوں سے یہاں پہنچنا ہوتا تھا، تو میں لیلیٰ کو کہہ دیتا تھا اور وہ بہ آسانی وہاں تک آجاتی تھی، البتہ رات کو تنہا آنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔'' رحمٰن صاحب نے ہنکارا بھرا ''لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ واردات کے مقام سے ہمیں بہ یک وقت دو گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات ملے ہیں۔ پہلی گاڑی تو وہی لیکسز (Lexus) ہے، جو لیلیٰ کے استعمال میں تھی اور جائے واردات ہی پر کھڑی تھی، لیکن وہاں ایک دوسری گاڑی بھی آئی ضرور تھی، جس کے واپس جانے کے نشانات بھی پکی سڑک تک ملے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی کار یا جیپ بھی ہوسکتی ہے۔'' ریحان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے ''لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، لیلیٰ کی کسی دوست یا جاننے والے کے پاس کوئی چھوٹی گاڑی نہیں ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ چھوٹی گاڑی بھی اُسی شام وہاں آئی ہو، لیکن لیلیٰ کی گاڑی آنے سے پہلے ہی چلی گئی ہو۔ وہ ایک تفریحی مقام بھی ہے اور شہر سے لوگ ہوا خوری کے لیے وہاں آتے رہتے ہیں۔ کئی بار جب میں اور لیلیٰ وہاں آتے تھے، تو ہم سے پہلے ہی کوئی خاندان، کوئی جوڑا یا منچلے نوجوان وہاں پکنک مناتے ہوئے ملتے تھے۔ ایسی صورت میں ہم آگے بڑھ جاتے تھے۔'' رحمٰن صاحب نے بھی اپنا سگریٹ سلگایا۔ ''ہاں..... ہم اس زاویے سے بھی دیکھ رہے ہیں کہ شاید وہ چھوٹی گاڑی لیلیٰ کی گاڑی سے پہلے وہاں سے چلی گئی ہو۔ میرا عملہ بستی والوں کے بیانات لے رہا ہے، لیکن بدقسمتی سے ایک تو وہ پوائنٹ بستی سے کچھ فاصلے پر ہے اور پھر ایسی جگہ ہے کہ وہاں عموماً لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔ پھر اس بستی کے لوگ سرِ شام ہی خود کو گھروں میں بند کر لینے اور عشاء کے فوراً بعد سو جانے کے بھی عادی ہیں، جب کہ لیلیٰ کی موت کا وقت رات بارہ بجے کے بعد کا ہے۔ بہرحال، فی الحال تو تمام اشارے اسی نوجوان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو پہلے ہی ہماری حراست میں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔ دھوپ تیز ہو رہی ہے۔''

رحمان صاحب اور ریحان کمرے سے باہر نکلے۔ ریحان کی نظر مجھ سے ملی، مجھے اس جوانِ رعنا کے حوصلے اور ضبط پر اس لمحے بے حد رشک آیا۔ جانے اس کے اندر اس وقت کتنے طوفان مچل رہے ہوں گے، لیکن چہرے پر سمندر جیسا سکوت طاری تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں پلٹا ہی تھا کہ باہر ایک دم شور سا اُٹھا اور سپاہی ایک ملنگ نما مجذوب شخص کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لائے اور اُسے بھی حوالات میں دھکیل کر بند کر دیا۔ ملنگ غصے میں اول فول بکتا رہا اور سپاہی اپنی بولی بولتے رہے۔ پتا چلا کہ ملنگ اس سے پہلے بھی لوگوں کو اینٹ یا پتھر مار کر زخمی کر چکا تھا، لیکن اُسے جھاڑ جھپٹ کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا، پر آج تو اُس نے حد ہی کر دی اور پتھر مار مار کر سارے علاقے کے گھروں کے شیشے توڑ ڈالے۔ تھانے دار، ایس پی صاحب کے ساتھ جائے واردات کی طرف نکل چکا تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ اُس کی واپسی تک ملنگ کو حوالات ہی میں قید رکھا جائے۔ مجذوب بکتا جھکتا وہیں سلاخوں کے پاس چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ملنگ کو ایک جھٹکا سا لگا ''تُو..... تُو یہاں کیا کر رہا ہے.....؟'' میں گڑبڑا سا گیا ''میں..... میں بھی قیدی ہوں'' ملنگ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''قیدی..... ہونہہ..... تُو صرف اپنی خواہشوں کا قیدی ہے۔ یہ سلاخیں تو تُو نے خود اپنی قسمت میں لکھوائی ہیں۔'' میں حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے قبل پولیس والوں کو بُری بُری گالیاں دینے والا مجذوب اس وقت بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ اتنے میں چائے والا سنتری سلاخوں کے پاس سے گزرا اور ہنس کر بولا ''اس کی باتوں میں نہ آنا عبداللہ۔ یہ تو ہے ہی سدا کا مجنوں۔ گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ۔'' کتنی عجیب بات تھی، اس وقت حوالات میں دو ہی قیدی بند تھے، ان میں سے ایک مجنوں تھا اور دوسرا دیوانہ۔ دفعتاً ملنگ اپنی جگہ سے اچھل کر بالکل میرے سامنے آکر بیٹھ گیا اور براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ''یہ تو مجھے کسی خونی کی آنکھیں لگتی ہیں۔ سچ بتا، کس کا خون کر کے آیا ہے یہاں.....'' میں زور سے چونکا۔ گویا اس ملنگ کو بھی میرے فسانے کی خبر ہو چکی تھی۔ اچانک ملنگ نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''سچ بتا..... کیوں مارا اُسے..... تُو اور اتنے خون کرے گا.....؟'' میں چپ رہا۔ ملنگ بالکل ہی جنونی ہو گیا۔ ''تُو کیا سمجھتا ہے..... یوں در بدر بھٹکنے سے تُو اُسے پالے گا۔ نہیں، کبھی نہیں..... تیرا مقدر ہی یہ سدا کی دربدری ہے۔ تُو یونہی سر پٹک پٹک کر مر جائے گا، لیکن جب تک اپنے من میں نہیں جھانکے گا، تب تک تیرا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔ کبھی یہ سلاخیں تیرا مقدر بنیں گی اور کبھی جنوں۔ کبھی کتے تجھ پر لپکیں گے اور کبھی انسان تجھے بھنبھوڑیں گے۔ ترس آتا ہے مجھے تجھ پر۔ عورت کا عشق تو نبھا نہیں پایا۔ اُس کے عشق کی گرد بھی کیا پائے گا۔ صرف نام ہی عبداللہ رکھ لیا ہے۔ عمل کوڑی بھر کا بھی نہیں۔'' مجذوب نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا اور میرے اندر بہ یک وقت نہ جانے کتنی آندھیاں، کتنے جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ملنگ ضرور میرے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ مجھے گُم صُم بیٹھا دیکھ کر وہ زور سے چلّایا ''تُو ایسے نہیں مانے گا..... نہ مان..... کھاتا رہے در بدر کی ٹھوکریں۔ ایک روز یونہی سولی چڑھ جائے گا۔ نہ ہی عورت تیرے ہاتھ آئے گی اور نہ خُدا'' ملنگ مجھ سے روٹھ کر دوبارہ دور سلاخوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے ہونٹ جیسے سی لیے۔ میری حالت پھر سے بگڑنے لگی۔ وہی چنگاریاں میرے دماغ سے نکلیں اور میرے سارے جسم کو جھلسا گئیں۔ سامنے بیٹھا مجذوب ایک بھیڑیے کی شکل اختیار کر کے مجھ پر لپکا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں نے اس حملے کو روکنے کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔

مجھے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ میں کسی اسپتال کی چار دیواری میں تھا اور آس پاس بہت سے ڈاکٹر مختلف آلات لیے میرا معائنہ کر رہے تھے۔ مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر سب ہی نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ''تم ٹھیک تو ہو.....؟ تمہیں بخار تو نہیں رہتا ہر وقت۔ تھکن تو محسوس نہیں ہوتی۔ سر میں دھماکے سے ہوتے ہیں؟ سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ کھانا ٹھیک سے نگلا جاتا ہے کہ نہیں.....؟ ہاتھ پاؤں شل تو نہیں پڑ جاتے اچانک؟'' میں نے بہ مشکل اپنی کیفیت بیان کی کہ میں اس دورے کے دوران اپنے حواس ہی میں کب ہوتا ہوں، جو اتنا کچھ یاد رکھ سکوں، پھر ایک سینئر ڈاکٹر نے نوجوان ڈاکٹروں کو ڈانٹنا اور کمرے کی روشنیاں مدھم کرنے کو کہا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے مجھ سے بات کرنے لگا، لیکن اس کی باتوں کا دائرہ بھی اچانک دکھائی دینے والے ہیولوں، بے یقینی، پُرتشدد رویے اور فالج کی کیفیات کے گرد ہی گھومتا رہا۔ اتنے میں باہر سے کسی چپڑاسی نے آکر بتایا کہ ایس پی رحمٰن پوچھ رہے ہیں کہ کیا قیدی کو آج جیل وارڈ ہی میں رات گزارنی ہوگی یا وہ اسے واپس جیل لے جاسکتے ہیں۔ سینئر ڈاکٹر نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک لمبی راہداری سے ہو کر ان کے کمرے تک پہنچ گئے۔ جہاں پہلے سے رحمٰن صاحب تھانے دار سمیت ہمارے منتظر تھے، ڈاکٹر نے مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن میں کھڑا ہی رہا۔ قید کے اپنے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور شاید بات صرف قید یا قیدی ہونے کی تھی ہی نہیں۔ یہ قواعد و ضوابط ہی تو ہیں، جو ہمیں ہر جگہ قیدی بنائے رکھتے ہیں۔ رُوسو نے سچ ہی کہا تھا کہ ''ہم بظاہر آزاد پیدا ہوتے ہیں، لیکن تمام عمر ان دیکھی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔'' رحمٰن صاحب نے ڈاکٹر سے میری بیماری کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب انگریزی میں بولے ''بظاہر عجیب سی بات لگتی ہے، لیکن سائنس اور ایلوپیتھی کی دنیا میں ہر دن ایک نئی کھوج کا دن ہوتا ہے۔ ہم روزانہ سیکڑوں پرانی بیماریوں کا علاج دریافت کرتے ہیں، تو ہر پل کوئی نئی بیماری ایک نیا چیلنج

بن کر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور بیماری بھی کیا، یہ تو دراصل ہمارے خون میں موجود مختلف مرکبات اور مادوں کی ترتیب بگڑنے کا ایک نام ہے۔ ساری زندگی، یہ دنیا اور یہ ساری کائنات ایک ترتیب ہی کا تو مظہر ہے۔ انسانی جسم کے اندر ہمہ وقت ایک بے حد پیچیدہ نظام ایک خاص ترتیب میں چل رہا ہے، جس میں اس نظام کے تحت بہنے والے مادوں کی مدت، اوقات اور بناوٹ خود بھی ایک خاص ترتیب اور نظام کے تحت ہوتی ہے۔ ان مادوں میں کسی بھی چیز کی کمی بیشی یا ملاوٹ ایسی ہی کسی حالت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، جسے ہم اپنی زبان میں بیماری کہتے ہیں۔ اس نوجوان کے خون میں بہنے والے مادوں میں بھی حیران کن طور پر چند ایسے زہریلے مرکب شامل ملے ہیں، جو عام طور پر کسی درندے کے خون میں ملتے ہیں۔ اسے کتے کے کاٹے کی مکمل ویکسین بھی ماضی قریب میں دی جا چکی ہے۔ اینٹی ٹیٹنس ٹیکے بھی لگ چکے ہیں، لیکن پھر بھی نہ جانے یہ کیسا اثر ہے، جواب تک باقی ہے۔ میرے لیے یہ میڈیکل ہسٹری میں ایک نئی دریافت ہے..... اسے ریبیز بھی نہیں ہے، لیکن پھر بھی یہ بار بار کے دورے خطرناک علامت ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر جلد ہی ہم اس بیماری کی تہہ تک نہیں پہنچے، تو اس نوجوان کا اعصابی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو جائے گا، جس کا نتیجہ فالج یا پھر مکمل دیوانگی کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔'' میرے ذہن میں فوراً ملنگ کی دھمکی گونجی کہ نہ مجھے خدا ملے گا نہ وصالِ صنم..... میں بے اختیار ڈاکٹر سے پوچھ بیٹھا ''میرے پاس کتنا وقت باقی ہے ڈاکٹر صاحب.....'' ڈاکٹر سمیت رحمٰن صاحب اور تھانے دار بھی اُچھل پڑے۔ سینئر ڈاکٹر نے یہ ساری گفتگو انگریزی میں شاید اس لیے کی تھی کہ وہ مریض کے سامنے مرض کی نوعیت بتا کر اُسے مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن میرا سوال سُن کر ان تینوں کو ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ میں یہ ساری گفتگو سمجھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے پھر انگریزی میں پوچھا ''تم انگریزی جانتے ہو'' میں نے اردو میں جواب دیا ''جی کچھ شدھ بدھ ہے، اس زبان سے میری۔ آپ براہِ مہربانی میرے سوال کا جواب دیں۔ مکمل پاگل پن میں اور کتنا عرصہ باقی ہے میرے پاس.....؟'' رحمٰن صاحب غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا ''دیکھو نوجوان..... ڈاکٹر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ تم جوان ہو، صحت مند ہو اور مجھے تمہارے معائنے کے دوران آج یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ تم بے پناہ قوتِ ارادی کے مالک ہو۔ مجھے یقین ہے میں اور تم مل کر اس بیماری کو بھی ہرا دیں گے۔ بس، اپنا یقین مت کھونے دینا۔ آدھی جنگ یقین اور حوصلے سے جیتی جاتی ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا، ریلیکس.....''

ایک اچھے طبیب کی طرح سینئر ڈاکٹر میرا سوال ٹال گئے۔ انہوں نے ایس پی صاحب کو اجازت دے دی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں، لیکن اب مجھے لگاتار معائنے کے لیے شہر کے اس بڑے اسپتال میں لانا ہوگا۔ ہم اسپتال سے باہر نکلے تو جیپ کے قریب کھڑے دو سپاہی جلدی سے ہتھکڑی لے کر میری جانب لپکے، لیکن رحمٰن صاحب نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا ''نہیں..... اس کی ضرورت نہیں..... عبداللہ کو میں اپنی گاڑی میں تھانے لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ تھانے دار صاحب کے ساتھ ہماری گاڑی کے پیچھے چلتے رہو۔'' حوالدار نے کھٹ سے سلیوٹ کر کے سر ہلایا ''بہتر جناب.....'' اور رحمٰن صاحب مجھے لیے اپنی سرکاری جیپ کی جانب بڑھ گئے۔ اسپتال سے باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ یہ ساحلی شہر بھی میرے شہر کی طرح وسیع اور جدید تھا۔ شاید ساحل پر بسنے والے شہروں میں بہت سی مماثلتیں ہوتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم جگمگاتے شہر کو چھوڑ کر مضافات میں نکل آئے۔ ہمارے داہنی جانب کچھ فاصلے پر سمندر ٹھاٹھیں مارتا سڑک کے ساتھ ساتھ دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ شاید یہی ساحلی سڑک سیدھی ''تحصیل ماہی'' کے تھانے تک جاتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ مرتضیٰ صاحب نے شہر سے بستی کا فاصلہ تقریباً 30 کلومیٹر بتایا تھا۔ رحمٰن صاحب خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے اور ان کا ڈرائیور اور گارڈ جیپ کے پچھلے کھلے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی نشست پر گم صم بیٹھا، اندھیرے میں سمندر کی سفید لہروں کو کناروں سے ٹکرا کر فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر آغاز کا انجام ''فنا'' ہی تو ہے۔ میری کہانی بھی خاتمے کے قریب ہی تھی شاید۔ رحمٰن صاحب نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا۔ ڈرائیور نے جلدی سے لائٹر دکھا کر ان کا سگریٹ سلگایا اور دوبارہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھے بنا بولے ''اس دن جب میں نے تم سے تمہاری تعلیم کے بارے میں پوچھا تھا تو تم نے ٹھیک طرح سے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' ''آپ نے مدرسے کی سند کے بارے میں پوچھا تھا اور میرے پاس واقعی مدرسے کی کوئی سند نہیں ہے۔'' رحمٰن صاحب ہنس پڑے۔ ''اچھا تو اب بتا دو، تمہارے پاس کون سی سند ہے؟'' ''انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے میں نے.....'' وہ اُچھل ہی تو پڑے ''واقعی..... تو پھر اتنا پڑھ لکھ کر ان ویرانوں کی خاک کیوں چھان رہے ہو، کوئی اچھی ملازمت کیوں نہیں کی تم نے۔'' میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا ''اسے بھی میری ایک ملازمت ہی سمجھیں۔ ملازمت صرف تنخواہ پانے کے لیے ہی تو نہیں کی جاتی۔'' رحمٰن صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور مجھے ایک بار پھر اپنے لفظوں کے بے وقت چناؤ اور ان کے اس طرح اچانک زبان سے پھسل جانے پر خود پر شدید غصہ آیا، لیکن تیر ایک بار پھر کمان سے نکل چکا تھا۔ ''خوب..... میں تو آج تک ملازمت کو صرف تنخواہ پانے کے ذرائع میں سے ایک سمجھتا رہا۔ تم اگر مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ، لیکن اسے زبردستی ہرگز نہ سمجھنا۔ جی چاہے تو بتا دو۔'' ''میری گزارش ہے کہ یہ حکم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ فی الحال میں ایک ممکنہ مجرم کی حیثیت سے آپ کا قیدی ہوں اور میرا ذہن بہت جگہوں پر بٹا ہوا ہے۔ مجھے اپنے رہنما بزرگ کی بھی فکر ستائے جا رہی ہے۔ جانے وہ کیسے ہوں گے۔ ان کی طبیعت یہاں آنے سے پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔'' رحمٰن صاحب نے دھواں اُگلا ''وہ بزرگ بھی تمہاری طرح ادھوری باتیں کرتے ہیں۔ بہرحال اسپتال آنے سے پہلے میں بستی میں ہی تھا تفتیش کے لیے۔ میری ان سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمہارے بارے میں تسلی دی تھی انہیں۔'' میں نے تشکر بھری نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔ ''شکریہ..... آپ ایک مختلف پولیس والے ہیں۔'' رحمٰن صاحب ہنس پڑے ''یہ لقب ہے یا الزام..... چلو یہ بھی قبول ہے۔ تم جانتے ہو، آج بستی کے ایک بچے نے ایسا بیان دیا ہے کہ اگر وہ سچ ہوا تو پورے کیس کا رُخ ہی بدل جائے گا۔ تم جس مسجد میں مقیم ہو، وہاں کے پیش امام کے بیٹے نے پولیس کو بتایا ہے کہ اس نے قتل کی رات اسی پہاڑی ٹیلے پر ایک دوسری عورت کو بھی جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ دوسری عورت کسی چھوٹی گاڑی میں سوار تھی، بچہ ابھی چھوٹا ہے، اس لیے زیادہ جزئیات نہیں بتا سکا، لیکن اس کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنی میم صاحبہ کی گاڑی ٹیلے کی طرف جاتی دیکھ کر بستی سے نکل کر اس جانب بھاگا، تو اس نے راستے ہی میں اس دوسری گاڑی کو بھی اس ٹیلے کی جانب جاتے دیکھا، لیکن اُسی لمحے مسجد سے اس کے باپ نے نکل کر اسے آواز دے کر واپس بلا لیا اور ڈانٹا کہ وہ مغرب کے بعد اندھیرے میں گھر سے کیوں نکلا ہے۔ بچے نے باپ کے ڈر سے اس وقت اُسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی میم صاحب ٹیلے پر گئی ہیں اور ان کے پیچھے، اُس نے ایک دوسری گاڑی بھی جاتے دیکھی ہے، جسے کوئی اور عورت چلا رہی تھی۔ پیش امام صاحب بچے کو گھر لے آئے اور آج جب ہم بیانات لینے کے لیے گئے تو اس بات کا پتا چلا۔'' ایس پی صاحب ضرور اشرف کی بات کر رہے تھے، لیکن یہ دوسری عورت کون تھی؟ میں اور رحمٰن صاحب دونوں ہی اس سوچ میں گم تھے کہ حوالات کا گیٹ آ پہنچا۔

ابھی میں ایس پی صاحب کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر تھانے کے برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ اندر سے تھانے کا محرر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ وہ جلدی سے سلیوٹ کر کے بولا ''جناب پوسٹ مارٹم کی مکمل رپورٹ آ گئی ہے، لڑکی کے چہرے، شانے اور کمر پر جو کھرونچیں اور خراشیں آئی تھیں، وہ اس رپورٹ کے مطابق کسی درندے کے پنجوں کے نشانات تھے۔'' محرر کی بات سن کر ماحول پر ایک سناٹا سا طاری ہو گیا۔ رحمٰن صاحب نے یوں مایوسی سے میری جانب دیکھا، جیسے اُن کا کچھ دیر پہلے جلا امید کا چراغ، ایک جھونکے ہی سے بیٹھ گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کے پنجوں پر نظر ڈالی۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ناخنوں سے تازہ خون ٹپک رہا ہو۔

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

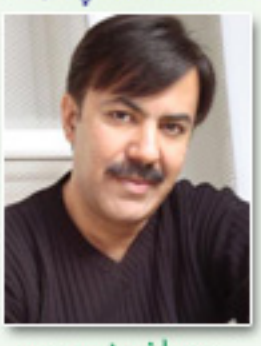

.....ہاشم ندیم.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ میں حوالات میں بیٹھا چھوٹے سے روشن دان کی تنگ سلاخوں کی درز سے اپنے حصے کے چاند کو مستطیل ٹکڑوں میں بٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کاش ان قید خانوں میں ایسے روشن دان بنائے جاتے، جہاں سے کم از کم مجھ جیسے سیاہ مقدر قیدی اپنے دوست، چاند تاروں سے تو ملاقات کر لیتے۔ کیا یہ قید پورے جسم کے ساتھ ساتھ ہماری نظر، سوچ اور نظریے کو بھی قید کرنے کا ایک مکمل انتظام ہوتی ہے۔ میں نے حوالات میں آتے ہی اپنے ہم درد سنتری سے ملنگ کے بارے میں پوچھا۔ سنتری اسماعیل ہنس کر بولا ''وہ پاگل مجنوں..... اُسے تو شام ہی کو ایس پی صاحب نے رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ آج شام جب ایس پی صاحب تھانے آئے، تو وہ بڑے ادب سے اُن سے بولا، ''جناب میرا کام یہاں ختم ہو گیا ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں کوچ کر جاؤں۔'' صاحب بہت ہنسے اور انہوں نے اسے آزاد کر دیا۔'' میں مایوس ہو گیا۔ میں نے اسماعیل سے درخواست کی ''اسماعیل..... تم میرا ایک کام کرو گے؟'' اسماعیل جلدی سے بولا ''ہاں جی..... ضرور..... کیوں نہیں.....'' ''کیا تم کل صبح کہیں سے اس ملنگ کو یہاں بلوا سکتے ہو۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا، لیکن تب میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ کیا تم اسے مجھ سے ملوا سکتے ہو؟'' ''حافظ جی! یہ کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ وہ تو سدا کا دیوانہ ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آنا۔'' میں نے سنتری کی منت کی کہ دیوانہ تو شاید میں بھی ہوں، تو کیا وہ ایک دیوانے کی ملاقات، دوسرے دیوانے سے نہیں کروائے گا۔ جانے اس وقت میرا دل اتنا بوجھل کیوں ہو رہا تھا کہ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اسماعیل ایک دم گھبرا سا گیا ''ارے ارے..... یہ کیا..... نہ عبداللہ..... نہ..... ایسے نہیں روتے..... تم تو بہت بہادر لڑکے ہو۔ یوں دل چھوٹا نہیں کرتے۔ میں کل صبح اسے ضرور کہیں سے بھی تمہارے لیے ڈھونڈ کر پکڑ لاؤں گا، چلو اب آنکھیں پونچھ لو۔'' وہ مجھے کسی بزرگ کی طرح دیر تک سمجھاتا رہا۔ پتا نہیں، کبھی کبھی ہم جی کھول کر رونا چاہتے ہیں، تو وہ ہی ہم سے اتنی زیادہ دور کیوں ہوتا ہے، جسے بھگونے کے لیے ہمارے یہ آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔ اس رات مجھے زہرہ کی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ میں نے دل میں عہد کر لیا کہ کل صبح سلطان بابا سے کہہ کر زہرہ کو پیغام ضرور بھیجوں گا کہ وہ کسی بھی طرح یہاں آ کر مجھ سے ایک بار مل جائے۔ میں ایک بار اپنے مکمل ہوش و حواس میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ نہ جانے پھر کبھی مکمل فرزانگی نصیب ہو گی یا نہیں۔ ڈاکٹر کی باتوں سے آج مجھے احساس ہو چلا تھا کہ میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں بار بار اس مجذوب کی یہ پیشن گوئی گونج رہی تھی کہ ''نہ تو تجھے دنیا کا عشق نصیب ہو گا اور نہ تو مالک کی محبت کا حق دار ٹھہرے گا۔'' پتا نہیں کیوں، لیکن وہ مجذوب میرے اندر سے جیسے زندگی کی آخری رمق، امید کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر لے گیا تھا۔ کیا میرا یہ سفر یونہی لاحاصل ہی چلا جائے گا؟ کیا واقعی میرے حصے میں نہ تو عشقِ مجازی کی چنگاری آئے گی اور نہ ہی عشقِ حقیقی کی مکمل بھڑکتی آگ..... کیا میں یونہی خوامخواہ اِدھر اُدھر سر پٹک رہا تھا؟ انہی سوچوں میں نہ جانے کب صبح ہو گئی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی ایک بار پھر میرا پورا جسم جلنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو اپنا سر سلاخوں سے ٹکرانے سے روکے رکھا، ورنہ میرے سر میں شدید درد کے جو دھماکے ہو رہے تھے، ان کا فوری حل مجھے بس یہی نظر آ رہا تھا کہ اپنا سر اس زور سے دیوار یا سلاخوں پر دے ماروں کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس میں جو بھی مادہ، یا درد کا باعث ہے، وہ بہہ جائے۔ جانے کتنی دیر میں اپنے ہاتھ پاؤں یونہی جکڑے بیٹھا رہا، حتیٰ کہ میری ہاتھ پیر کی انگلیاں مُڑ کر تقریباً چیخ ہی گئیں۔ اسی اثناء میں اسماعیل چائے لیے حوالات کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور جلدی سے میری جانب دوڑا۔ ''عبداللہ..... یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں.....'' میں نے بہ مشکل اپنے لب کھولے ''کچھ نہیں..... تم بس جا کر اُسے ڈھونڈ لاؤ۔ اس سے پہلے کہ میرا ہوش جواب دے جائے، تم اسے لے آؤ.....'' اسماعیل اُلٹے پاؤں باہر بھاگا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آج اس جنوں کو خود پر تب تک حاوی نہیں ہونے دوں گا، جب تک مجھے اپنے کچھ سوالوں کے جواب نہیں مل جاتے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں خود اپنے ہی ماس میں اپنے دانت گاڑ دوں۔ جبڑے کی اینٹھن نے مجھے اس قدر مجبور کیا کہ میں نے زمین پر ریت میں پڑا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھایا اور اسے اپنے دانتوں کے درمیان اس زور سے جکڑ لیا کہ چند لمحوں بعد ہی وہ کڑک سے ٹوٹ کر گر گیا۔ کچھ ہی دیر میں اسماعیل دوڑتا ہوا واپس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ بازار میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر تھک گیا، لیکن وہ ملنگ دوبارہ اسے کہیں نظر نہیں آیا، حالاں کہ وہ عام طور پر اُسی بازار میں کسی نہ کسی دکان یا ہوٹل کے باہر تھڑے یا چبوترے پر پڑا نظر آتا تھا۔ آج تو لوگوں نے بھی اُسے نہیں دیکھا تھا۔ میری حالت تب تک قدرے سنبھل گئی تھی، لیکن

میرا سارا جسم پسینے سے تر تھا اور میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ شاید مجھے پھر سے بخار ہو رہا تھا۔ اسماعیل جلدی سے تھانے دار کے کمرے سے ایک موٹی سی کھیس نما چادر اٹھا لایا، جسے میں نے اچھی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ اسماعیل دُکھ بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا ''یہ روگ کہاں سے لگا لیا، اپنی جوانی کو بابو..... ابھی تو تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔'' پھر اچانک ہی جیسے اُسے کوئی ضروری بات یاد آئی ''ارے ہاں، رات کو یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک بات یاد آئی، سوچا تھا صبح آ کر تمہیں بتاؤں گا، پر یہاں پہنچتے ہی تمہیں دیکھ کر سب بھول گیا۔ وہ دیوانہ جب حوالات میں تمہاری طبیعت خراب ہونے کے بعد تنہا رہ گیا تھا، تب بار بار تمہیں خیالوں میں مخاطب کر کے بس ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ ''اس سے کہو مشرق کو دیکھے..... مشرق کو دیکھے۔'' جانے مشرق میں کیا ہے۔؟'' میں نے چونک کر اسماعیل کو دیکھا۔ حوالات کی سلاخیں اور دروازہ مغرب کی جانب کھلتے تھے۔ میں جہاں قید تھا، وہاں مشرق کی جانب صرف ایک سپاٹ دیوار تھی اور اس میں چھوٹا سا روشن دان تھا اور بس..... پھر بھی میں بہت دیر تک آنکھیں پھاڑے دیوار کی جانب اس امید سے دیکھتا رہا کہ شاید مجھے وہاں کچھ نظر آ جائے، لیکن سب بے سود ہی رہا۔

کچھ ہی دیر میں سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آ گئے۔ سلطان بابا دو دن ہی میں برسوں کے بیمار اور نڈھال سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ابھی کال گڑھ والے حادثے سے ٹھیک طرح سنبھل نہیں پائے تھے کہ یہ نئی افتاد آن پڑی تھی۔ کاش ہم شیخ صاحب کے ہاں کچھ روز اور ٹھہر جاتے تو ان کی حالت بہتر ہو جاتی، لیکن یہ سب اگر ہمارے ہی بس میں ہوتا تو پھر یہ ''کاش'' لفظ ہماری لغت میں کہاں سے آتا؟ مرتضیٰ صاحب مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، لیکن سلطان بابا چپ چاپ بس میری جانب دیکھتے رہے۔ آخر کار، مجھے ہی ان سے پوچھنا پڑا ''آپ کچھ کہتے کیوں نہیں..... اس طرح چپ رہیں گے تو میں اور بھی پریشان ہو جاؤں گا۔ کچھ بات کیجیے۔'' ''کیا کہوں میاں..... سوچتا ہوں تمہارا یہ امتحان کب ختم ہوگا۔ اتنی کڑی آزمائش تو شاید ہی کسی نے جھیلی ہو۔ لگتا ہے اس بار خود مجھ سے بھی کوئی سِرا چھوٹ رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' میں نے مختصر لفظوں میں انہیں ملنگ کی ساری بات بتا دی۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر گہری سانس لے کر بولے ''وہ اب شاید کسی کو دوبارہ نظر نہ آئے، اگر اس کا مقصد اشارہ دینا تھا، تو وہ دے کر چلا گیا۔ اس کا کام واقعی ختم ہوا۔'' میں چاہ کر بھی ان سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ اگر اس کی تنبیہہ سچ ثابت ہوئی، تو پھر انجام کیا ہوگا۔ میں نے دبے لفظوں میں انہیں زہرہ کو پیغام بھیجنے کا کہا۔ وہ بس سر ہلا کر رہ گئے۔ اتنے میں باہر ہلچل سی مچی۔ پتا چلا کہ ایس پی صاحب شہر سے روانہ ہو چکے ہیں اور اب چند لمحوں میں ان کی آمد متوقع ہے۔ اس چھوٹے سے تھانے کے لیے بھی یہ ایک ان ہونی تھی۔ عام حالات میں ایس پی جیسا بڑا افسر شاید سال میں ایک آدھ بار ہی کسی معائنے کے لیے یہاں آیا ہوگا، لیکن ریحان صاحب کے حکومت میں اثر و رسوخ کی وجہ سے اس تھانے کے در و دیوار گزشتہ تین دنوں سے یہ تمام گہما گہمی دیکھ رہے تھے۔ اہل کاروں کی مہینوں پرانی وردیوں کو روز کلف لگا کر چمکایا جا رہا تھا۔ تھانے کے در و دیوار اور احاطے کی صبح و شام دو بار صفائی ہو رہی تھی اور کچھ زیادہ صحت مند سنتری اپنی توند کو چھپانے کے لیے بیلٹ کو اس کے آخری حلقے سے آگے کچھ نئے سوراخ کر کے اور بیلٹ کا فیتہ سانس گھٹنے کی حد تک کس کر تھانے آنے لگے تھے۔ بغل قلعی سے جگمگا رہے تھے اور جوتے پالش سے چمکنے لگے تھے۔ ہفتوں کی بڑھی حجامت روزانہ بننے لگی تھی اور سارے رنگروٹ صبح سویرے اپنی گردن پر موٹی مشین پھروا کر اور سارے بال اُڑا کر آنے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایس پی صاحب تیزی سے تھانے میں داخل ہوئے۔ تھانے دار نے سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب کو پہلے ہی برآمدے میں بٹھا دیا تھا۔ آج ایس پی کا رُخ خلافِ معمول سیدھا حوالات کی جانب تھا۔ وہ سلاخوں کے قریب آ کر ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولے ''آئی۔ جی نصیر صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا ''کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن بہت مہربان ہیں وہ میرے۔'' رحمٰن صاحب پشیمانی سے بولے ''عجیب لڑکے ہو تم بھی، تم نے اتنے دن سے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم..... میرا مطلب ہے تم کم از کم کوئی اشارہ ہی دے دیتے۔'' میرے منہ سے اچانک بے اختیار ایک تلخ بات نکل گئی ''کیا ایسا کوئی اشارہ دینے سے میرے جرم کی نوعیت بدل جاتی.....؟'' وہ چونکے ''نہیں..... لیکن شاید میں اتنا شرمندہ نہ ہوتا جتنا آج صبح اُن کے فون کے بعد ہوا۔'' ''لیکن میں نے تو ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ یہ بات تو آپ خود بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔'' ''ہاں، جانتا ہوں، لیکن شاید تمہارے بزرگ نے ان سے رابطہ کیا ہے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئے۔'' تھانے دار نے جلدی سے ایس پی صاحب کو بتایا کہ اس نے ایس۔ پی کے معائنے کی وجہ سے میرے دونوں ملاقاتیوں کو پچھلے برآمدے میں بٹھا رکھا ہے۔'' رحمٰن صاحب نے جلدی سے انہیں اندر لانے کو کہا۔ تھانے دار خود بھاگا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم چاروں تھانے دار کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رحمٰن صاحب بہت الجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے ''یقین جانیں، یہ میری زندگی کا پہلا کیس ہے اور پہلا موقع ہے کہ میں ایک ہی دن میں کئی کئی بار حیرت کے اتنے شدید جھٹکوں سے دوچار ہوا ہوں۔ آپ لوگ پہلے ہی نصیر صاحب سے اپنا ناتا بتا دیتے۔ وہ میرے نہایت قابلِ احترام استاد ہیں۔ میں نے اکیڈمی نے ان ہی کی سرپرستی میں ٹریننگ لی تھی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، انہی کی وجہ سے ہوں اور آج صبح سویرے جب ان کی کال آئی، تو یقین جانیے، میں دل ہی دل میں بہت نادم ہوا۔ اس تمام عرصے میں میرے کسی بھی برتاؤ سے آپ کو جو بھی کوفت ہوئی ہو، میں اس سب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' سلطان بابا بولے ''آپ نے کچھ بھی ایسا برتاؤ نہیں کیا، جو آپ کے فرض کے دائرے سے باہر ہو اور پھر سچ تو یہ ہے کہ اگر عبداللہ میاں کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی، تو شاید نصیر صاحب تک میری عرض داشت کبھی نہ جاتی۔ اس جیسے نہ جانے کتنے الزام، کتنے کلنک لگنا ابھی باقی ہیں۔ کہاں ہر بار نصیر صاحب کو زحمت دیتے پھریں گے ہم..... لیکن اس بار معاملہ کچھ اور تھا، لہٰذا انہیں درمیان میں لانا ہی پڑا۔ امید ہے آپ اس سفارش کا بُرا نہیں مانیں گے.....'' رحمٰن صاحب گڑبڑا کر بولے ''نہیں..... ہرگز نہیں..... یقین جانیے، یہ سب میرے لیے بہت عجیب ہے۔ اتنا اختیار رکھنے کے باوجود اگر کوئی اتنی تکلیف جھیلے تو اسے سچائی کی دوسری سند کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی ذاتی مچلکہ بھر کر عبداللہ کو ضمانت پر لے جا سکتا ہے۔ ہاں، بس اتنا خیال رکھنا ہوگا کہ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، اسے علاقے ہی میں موجود رہنا ہوگا۔ میں ذاتی مچلکے کے تکلف میں بھی نہ پڑتا کہ نصیر صاحب کی ضمانت میرے لیے دنیا کی کسی بھی ضمانت سے بڑھ کر ہے، لیکن آپ جانتے ہیں، سرکاری قواعد و ضوابط بھی میرے پاؤں کی بہت سی زنجیروں میں سے ایک ہیں۔''

مرتضیٰ صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے بستی کے پیش امام کی حیثیت سے ایک مچلکہ بھر دیا اور اس پر اپنے دستخط اور انگوٹھے کی مہر ثبت کر دی۔ جاتے جاتے رحمٰن صاحب نے ایک اور خبر سنائی کہ لڑکی کے چہرے اور جسم پر خراشوں اور ناخن کی کھرونچوں کے جو نشانات تھے، وہ میرے خون اور گزشتہ شام لیے گئے میرے ناخنوں کے مواد سے مماثلت نہیں رکھتے۔ گویا فی الحال میں ایک فوری نوعیت کے شک سے پھر باہر نکل چکا تھا۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اشرف نے جو کچا پکا حلیہ اس دوسری عورت کا بتایا تھا، اس کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش بھی جاری ہے، لیکن چوں کہ ایک بچے کی یادداشت اور منظر نگاری بہر حال اتنی پختہ نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا ابھی کچھ مشکلات کا سامنا تھا، لیکن رحمٰن صاحب پُر امید تھے کہ پولیس جلد درست خطوط پر کیس کی تفتیش شروع کر دے گی۔ وہ ہمیں رخصت کرنے خود تھانے کے صحن تک آئے اور سلطان بابا کے لاکھ انکار کے باوجود اپنے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ہمیں بستی چھوڑ آئے۔ شاید اس ہدایت کے پیچھے کہیں نہ کہیں ان کی یہ خواہش بھی کارفرما تھی کہ بستی سے مجھے ہتھکڑیاں لگا کر گرفتار کر کے لاتے وقت بستی والوں کی نظر میں میرے مجموعی تاثر میں جو بگاڑ پیدا ہوا تھا، اس کی کچھ تلافی تو ممکن ہو۔ ہم انسان ہوتے ہی اتنے ظاہر پرست ہیں کہ ہماری عزت اور ذلت کے پیمانے اسی قدر سطحی اور ناپائیدار بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے رحمٰن صاحب کا یہ کلیہ سولہ آنے درست ثابت ہوا اور ہمیں ایس پی کی گاڑی سے اُترتے دیکھ کر بستی والوں کے دل میں اگر کوئی رہا سہا شک باقی بھی تھا، تو جاتا رہا۔ ویسے بھی یہ سیدھے سادے مچھیروں کی بستی تھی اور یہاں کے لوگ رشتوں کے معاملے میں زیادہ بھاؤ تاؤ کے قائل نہیں تھے۔

اشرف کو اسکول سے آتے ہی جب یہ پتا چلا کہ میں واپس آ گیا ہوں، تو وہ دوڑتا ہوا مسجد آ پہنچا۔ میں مسجد سے ذرا فاصلے پر کھجور کے تین چار جُڑے ہوئے درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھا ہوا تھا۔ اشرف مجھے کچھ بتانے کے لیے بے چین تھا، لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہی ظہر کی نماز ختم ہوئی تھی اور دو چار نمازی مجھ سے ملنے کے لیے کچھ دیر رُک گئے تھے، لہٰذا اُن کے جانے تک اشرف ریت میں گھروندے بنانے کا کھیل کھیلتا رہا اور پھر جیسے ہی آخری نمازی مجھ سے رُخصت ہوا، وہ جلدی سے لپک کر میرے قریب آ گیا۔ ''پتا ہے..... کل وہ پتنگ والے صاحب آئے تھے شام کو وہاں۔ میرے لیے بہت سی پتنگیں بھی لائے تھے، پر میں نے چھپ کر دیکھا تھا۔ وہ رو رہے تھے اُس جگہ بیٹھ کر۔'' میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اُس بدنصیب کو تو اب تمام عمر رونا تھا۔ ''اور پتا ہے، وہ زور زور سے کسی کو کہہ رہے تھے کہ تم نے اچھا نہیں کیا..... یہ تم نے اچھا نہیں کیا..... پر طالب جی..... وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔'' میں زور سے چونکا۔ اشرف مجھے طالب اور سلطان بابا کو بڑے مولوی جی کہتا تھا، لیکن آخر یہ ریحان کس سے خود کلامی کر رہا تھا۔ کس نے، کیا اچھا نہیں کیا۔ میں نے اشرف کو زیادہ کریدا تو مجھے اتنا سمجھ میں آیا کہ ریحان عموماً جب کبھی وہاں تنہا آتا تھا، تو خود کلامی ضرور کرتا تھا۔ دنیا کے زیادہ تر بڑے اور کام یاب انسان اندرونی طور پر شدید تنہائی کا شکار ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کے آس پاس عملہ تو سیکڑوں اور ہزاروں میں ہوتا ہے، لیکن ایک دوست کی کمی انہیں سدا پریشان کرتی رہتی ہے، ان میں سے بہت سے اس خود کلامی کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید ریحان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ شام تک دو چار مرتبہ میری طبیعت بگڑی اور پھر سنبھل بھی گئی، لیکن اس دھوپ چھاؤں کے کھیل نے مجھے نڈھال کر ڈالا، لہٰذا مغرب کے بعد میں کچھ دیر کے لیے مسجد کے حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس دوران سلطان بابا لگاتار مجھے سادہ پانی پر کچھ دم کر کے پلاتے رہے اور میرے اندر کی جلن کو اس پانی سے قدرے سکون بھی ملتا رہا۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی آئے تھے اور انہوں نے بڑی عجیب سی بات بتائی کہ کچھ گھاؤ اور کچھ زخم بظاہر بھر جانے کے باوجود اس خاص مدت میں ایک بار پھر ٹیس پکڑ لیتے ہیں، جب وہ تاریخیں اور وہی خاص وقت پلٹتا ہے، جس میں ماضی میں ہم نے وہ زخم یا چوٹ کھائی ہوتی ہے۔ ان میں کچھ زخم سہ ماہی، ششماہی اور کچھ تو سال بھر کے بعد بھی دوبارہ ہرے نہ بھی ہوں، تب بھی اپنی پوری کسک اور بے چینی کے ساتھ پلٹتے ہیں۔ ان کے اس کلیے کی رو سے مجھے پچھلے ماہ انہی تاریخوں میں یہ زہریلے گھاؤ لگے تھے اور کتوں کا زہر میرے جسم میں پھیلا تھا۔ بروقت ملی دوا اور ویکسین کے ٹیکوں نے وقتی طور پر میری جان تو بچا لی، لیکن ان درندوں کے خونخوار جبڑوں کا زہر میرے خون کے خلیوں ہی میں دوا اور ویکسین سے بچنے کے لیے اپنے ہی بنائے کسی حفاظتی خول میں جا کر چھپ گیا تھا اور اب ٹھیک اسی وقت اور تاریخ کو تیس دن کا عرصہ گزرتے ہی وہ پھر سے میرے اعصابی نظام پر حملہ آور ہوا تھا۔ گویا اس زہر نے اپنے دائرے کو مکمل کرنے میں مہینے بھر کا عرصہ لیا تھا اور یہ حملے اب ہر ماہ انہی تاریخوں میں اور اسی خاص وقت پر میرے اعصابی نظام کو تباہ کرنے کے لیے ہوتے رہیں گے۔ بظاہر ایلوپیتھی اور جدید طب میں اس کی وجہ اور مثال ڈاکٹروں کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی، پر بقول حکیم صاحب ان کی سات نسلیں حکمت ہی کے پیشے سے وابستہ رہی ہیں اور وہ اپنی پرانی حکمت کی کتابوں میں موجود مُستند تفصیل پڑھنے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ انہیں سوچوں میں گم نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی ہماری نیند اس قدر بے چین اور کچی ہوتی ہے کہ ہم سوتے وقت بھی خود کو جاگتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو بند آنکھوں کے پردے تلے بھی ہمیں اپنے آس پاس ہوتی حرکات کا ادراک ہوتا رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔ جانے وہ خواب تھا یا سراب..... لیکن میں نے اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں تلے ایک عورت کی شبیہہ بنتی محسوس کی۔ میں بے چینی سے کسمسایا، لیکن اس عورت کی تصویر بنتی چلی گئی۔ عجیب سی سفاکی تھی اس کے چہرے پر۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے..... پر کہاں.....؟ وہ بہ یک وقت میرے لیے بے حد اجنبی اور بہت شناسا چہرہ تھا۔ اور وہ عجیب سی سفاکی لیے میری جانب گھور رہی تھی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور خوف کے مارے جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کچھ دیر تک تو مجھ سے حرکت بھی نہ ہو سکی۔ وہی عجیب سی کپکپی میرے سارے وجود پر طاری تھی۔ میں نے سنا تھا، ہم جس بات کا بوجھ اپنے ذہن پر لیے بستر پر جاتے ہیں، وہی واقعہ ٹھیک اسی طرح ہمارے خواب میں وقوع پزیر ہوتا ہے۔ ایس پی صاحب کی زبانی جب سے ایک دوسری عورت کا اس قصے میں ذکر سُنا تھا، تب سے شاید وہی عورت میرے حواس پر بھی سوار تھی۔ تبھی میں سوتے میں بھی اُس کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے دور سے کسی چھوٹی گاڑی کے انجن کی آواز سُنائی دی۔ ہوا کا رُخ بدلا اور آواز غائب ہو گئی۔ میں لپک کر حجرے سے باہر نکلا۔ دور اسی پہاڑی ٹیلے پر کسی گاؤں کی روشنیاں مجھے نظر آئیں۔ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر گئی اور میں اس جانب دوڑا۔ دور سے میں نے کسی عورت کی پشت دیکھی۔ اس کی لمبی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی اور وہ سمندر کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔ گاڑی کی پارکنگ والی بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ میرے بھاگتے قدموں کی آواز پر وہ گھبرا کر پلٹی اور چند لمحوں کے لیے ملگجے سرخ اجالے میں اُس کے چہرے پر میری نظر پڑی۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ یہ وہی عورت تھی، جسے کچھ دیر پہلے میں نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا تھا۔

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

کچھ لمحے وہ مجھے اور میں اسے یونہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے، ٹیلے پر بہت اندھیرا تھا اور پس منظر میں ساحل پر پھیلی چاند کی قدرتی روشنی اس چوٹی کو مزید تاریک بنا رہی تھی۔ اگر اس چھوٹی مارک ٹو کار کی پارکنگ والی بتیاں روشن نہ ہوتیں، تو میں اتنی دور سے شاید اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پاتا۔ گاؤں کے اردگرد روشنی کا ایک سرخ ہالہ سا بنا ہوا تھا اور اسی ہالے میں مجھے اس کے چہرے کی دھیمی سی، لیکن بے حد سفاک جھلک نظر آئی تھی، نہ جانے اس چہرے میں ایسا کیا تھا کہ میری ریڑھ کی ہڈی پر گردن کی پشت سے ہوتی ہوئی سرد پسینے کی ایک لہر سی دوڑ گئی، میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اسے ہوشیار کر دیا تھا، وہ پل بھر میں ایک جھٹکے سے مڑی اور بجلی کی طرح گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں زور سے چیخا ''میری بات سنیے..... رک جائیے.....'' لیکن وہ بھلا کہاں رکنے والی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گاڑی نے لمبا سا موڑ کاٹا اور فراٹے بھرتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی اور جب تک میں گاڑی کے مقام تک پہنچا، وہ اندھیرے میں تحلیل ہو چکی تھی، بہت دیر تک تو میں اپنی پھولی سانسوں پر قابو ہی نہیں پا سکا۔ گاڑی جا چکی تھی اور اب صرف اس کے پہیوں کے نشانات ہی وہاں باقی رہ گئے تھے یہ ٹھیک وہی جگہ تھی، جہاں سے پولیس کی تفتیش کے مطابق لیلیٰ نیچے گری تھی یا اسے دھکا دیا گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چٹانوں کے نیچے جھانکا، تاکہ میں وہ قاتل گہرائی دیکھ سکوں، جس نے ایک معصوم جان لی تھی، اچانک مجھے زوردار چکر آیا اور مجھے لگا کہ میں خود بھی چند لمحوں میں اسی گہرائی کا شکار ہو جاؤں گا، لیکن بھلا ہو قریب نکلی چٹان کے ایک پتھر کا، جو لہراتے وقت میرے ہاتھ میں آ گیا اور میں اسی کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ مجھے کبھی بھی اونچائی کے خوف (Hieght Phobia) کا عارضہ لاحق نہیں رہا، لیکن آج میں نہ جانے یہ اونچائی کیوں جھیل نہیں پا رہا تھا۔ میں اکثر خواب میں خود کو کسی اونچی جگہ پر معلق یا پھر اونچائی سے خود کو نیچے گرتے ہوئے محسوس کرتا تھا اور ہر بار میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ آج یوں لگا، جیسے وہ خواب سچ ہونے کو تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اسپتال والے سینئر ڈاکٹر نے ریبیز کی ایک علامت ''اونچائی کا خوف'' بھی بتائی تھی۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی، تو مشرق کی سمت میں کوئی چیز ریت میں پڑی چمکتی نظر آئی۔ میں نے اسے اٹھایا تو سرخ رنگ کی ایک پتلی نوک دار ہیل تھی۔ اوہ، گویا وہ پراسرار عورت اپنی جوتی کی ایڑی تڑوا کر جلدی میں یہیں چھوڑ گئی تھی۔ اگلے روز ٹھیک اسی جگہ میں رحمٰن صاحب اور ان کی ٹیم کے ہم راہ کھڑا تھا اور وہ سرخ جوتی کی ایڑی اب رحمٰن صاحب کے ہاتھ میں تھی، جسے وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے ''حیرت ہے..... اگر یہ وہی عورت تھی، جس کی تلاش میں ہم دربدر بھٹک رہے ہیں، تو پھر اس کی ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی اور میں یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ میں بھی روایتی پولیس والوں کی طرح تفتیش میں الجھ کر اور ہر طرف جال بچھا کر مطمئن ہو گیا تھا، جب کہ سب سے اہم، لیکن غیر متوقع جگہ پر ناکہ لگوانا بھول گیا۔ میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اگر کوئی اور عورت بھی اس کیس کا مرکزی کردار ہے، تو وہ واپس یہاں بھی آ سکتی ہے۔ ضرور اس جگہ میں کوئی خاص بات ہے، جو بظاہر ہمیں محسوس نہیں ہوئی، لیکن اس کی کیس کے باقی کرداروں کے لیے کوئی نہ کوئی شدید جذباتی اہمیت ہے۔ اب شاید وہ دوبارہ یہاں نہ آئے، کیوں کہ وہ جان چکی ہے کہ وہ لوگوں کی نظروں میں آ گئی ہے۔ لہٰذا اب ہمیں خود اس کے پیچھے جانا ہوگا۔'' رحمٰن صاحب نے گاڑی کا حلیہ اور عورت کی شبیہ کی تفصیلات مجھ سے کئی بار پوچھیں۔ نمبر میں نوٹ نہیں کر پایا تھا، کیوں کہ میرا فاصلہ گاڑی سے بہت زیادہ تھا، البتہ گہرے نیلے یا سیاہ رنگ کی ایسی مارک ٹو گاڑیاں تو شہر میں نہ جانے کتنی ہوں گی۔ بہرحال، رحمٰن صاحب کے نقطۂ نظر سے یہ کیس میں بڑی پیش رفت تھی اور شام ڈھلنے تک اس مقام پر مختلف پولیس والوں کا آنا جانا برقرار رہا۔

اس وقت بھی سورج ڈھلنے کے قریب میں دور ریت پر بیٹھا، تھانے دار کو اپنے محرر کو کچھ تفصیلات لکھواتے ہوئے دیکھ رہا تھا، شاید وہ وقوع کا نقشہ پھر سے بنا رہے تھے، تھانے دار کی آواز مجھ تک آ رہی تھی۔ محرر نے کچھ غلط لکھ ڈالا۔ تھانے دار چلایا ''میں نے کہا تھا مشرق کی سمت سے نشانی ملی..... مشرق کی سمت سے..... سمجھ نہیں آتا کیا.....؟'' اور ٹھیک اسی لمحے میرے کان میں اسماعیل سنتری کی آواز گونجی، اس نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ وہ مجذوب میرے لیے یہی پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں مشرق کی سمت دیکھوں، اور مجھے پہلی نشانی مشرق ہی میں ملی تھی، جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ رات جب میں اس عورت کو دیکھنے کے بعد واپس حجرے میں پہنچا، تو سلطان بابا میری تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔ میں نے انہیں اپنے خواب اور پھر اس عورت کے بارے میں بتایا کہ جس ہیولے کو چند لمحے پہلے میں نے بند آنکھوں کے پردے تلے دیکھا، وہی کچھ دیر بعد میرے سامنے حقیقت بن کر کھڑا تھا۔ سلطان بابا میری بات ختم ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک میری جانب دیکھتے رہے۔ ''جانتے ہو..... یہ تمہارا پہلا الہام تھا۔ آج تک تمہیں جو کچھ نظر آتا رہا، وہ ماضی میں ہو چکا تھا اور وہ کیا کہتی ہے سائنس کی ''ڈائی پولر تھیوری آف گریوٹی''..... اس کے مطابق وہ سب صرف بنی ہوئی اور گزری ہوئی تصویروں کے فریم ہوتے تھے، لیکن اب جو تم نے دیکھا، وہ ماضی نہیں مستقبل تھا۔ لگتا ہے تمہاری ریاضت قبول ہو رہی ہے عبداللہ میاں..... جیتے رہو۔'' مجھے دعا دیتے وقت ان کی آنکھوں میں نمی اور میرے سر پر رکھا ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ تھانے دار اور محرر نے اپنا کام ختم کر لیا اور جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ میں آئندہ کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کروں، تو فوراً بستی کے پوسٹ آفس سے ماہی تحصیل تھانے کے نمبر پر فون کر کے بتا دوں۔ سورج ڈھلتے ہی سب عملہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اگلی صبح رحمٰن صاحب کا پیغام آ گیا کہ میں تھانے آ کر اس عورت کا خاکہ بنوا دوں۔ میں بستی سے چلنے والی واحد قدیم سی بس میں سوار ہو کر تھانے پہنچا، تو زیادہ تر عملہ تھانے دار سمیت کسی چھاپے پر گیا ہوا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے چند ٹکڑے ان شریر بچوں کی طرح اِدھر اُدھر ڈول رہے تھے، جو اسکول سے بھاگ کر کھلیانوں اور میدانوں میں مٹر گشت کرتے پھرتے ہیں۔ خاکے بنانے والا فن کار اور محرر تھانے میں موجود تھے۔ محرر نے مجھے اپنے ہی کمرے میں بلا لیا۔ کمرا کیا تھا، چھوٹا سا کیبن تھا، جہاں ایک طرف میز پر ایک پرانا سا وائرلیس نظام اور ایک قدیم سا مٹیالے رنگ کا ٹیلی فون پڑا ہوا تھا، جس کے ڈائل کے اوپر ایک چھوٹا سا زنگ آلود تالا لگا تھا۔ تالے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس میں چابی گھمانے کے مواقع کم ہی آتے ہوں گے۔ محرر نے مجھے فن کار مصور کے ساتھ بٹھا دیا اور خود چائے کا کہنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اس رات اس عورت کے چہرے کا صرف دایاں حصہ ہی دیکھا تھا، وہ بھی سرخ ملگجے اندھیرے میں، چہرے کا بایاں حصہ نقاب اور مکمل اندھیرے میں چھپا ہوا تھا، لہٰذا میں احتیاط سے سوچ سوچ کر مصور کو اس عورت کے خدوخال اپنی یادداشت کے مطابق بتا رہا تھا، جسے وہ تیزی سے کاغذ پر پینسل کے ذریعے اسکیچ کی صورت میں اتار رہا تھا۔ اچانک مصور نے اپنی جگہ سے ذرا حرکت کی اور پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ کمرے کی مشرقی سمت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہٹتے ہی میں نے دیکھا، اس کے پیچھے دیوار پر میخوں کی مدد سے جھولتا ہوا ملک کا ایک پرانا سا نقشہ لٹکا ہوا تھا۔ میں مصور کو تفصیلات بتاتے بتاتے بے خیالی میں نقشے میں اپنا شہر ڈھونڈنے لگا۔ اپنے شہر سے رحیم پور، رحمٰن آباد پھر جبل پور، کمال آباد اور پھر کال گڑھ اور اب یہ چھوٹی سی تحصیل ماہی، میں نقشے پر خیالی انگلی سے اپنے سفر کی منزلوں کے نقطے جوڑتا رہا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ میں نے جلدی میں دو تین بار پھر نقشے پر ان نقطوں کو جوڑا، سلطان بابا نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وقت ملے تو میں نقشہ دیکھ لوں۔ مصور اپنے کام میں جتا ہوا تھا، اسے مجھ سے جتنی تفصیل مل سکتی تھی، میں اسے بتا چکا تھا، میں نے زمین پر پڑے اس کے کینوس کے تھیلے میں سے جھانکتی بہت سی رنگ برنگی پینسلوں میں سے ایک پینسل نکالی اور اس کی مدد سے اب تک کے اپنے سفر کے نقطوں کو جوڑا اور میری آنکھیں پھیلتی گئیں۔ ان نقطوں کو جوڑنے سے جو شبیہہ اس مٹیالے نقشے پر میری رنگین پینسل نے بنائی تھی، وہ پہلے الف اور پھر للہ تک آ کر رک گئی تھی، یعنی اگر مکمل لفظ جوڑا جاتا، تو اللہ کا اللہ بنتا تھا، یعنی حرف ہ کی کمی تھی، جسے جوڑنے سے پورا ''اللہ'' کا نام بن جاتا۔ میرے دل و دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ سلطان بابا نے کہا تھا کہ انہیں ہمارے سفر کے راستوں اور منزلوں کے بارے میں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ کیا قدرت میرے راستوں اور پڑاؤ کے مقامات کے ذریعے اپنا پورا نام لکھوانا چاہتی ہے۔ تو کیا اب تک کا میرا یہ سارا سفر پہلے ہی سے طے شدہ تھا؟ کیا یہ سفر اسی وقت طے ہو چکا تھا، جب عبداللہ نام کا یہ اعزاز ساحر کے نام کی جگہ میرے حصے میں لکھ دیا گیا تھا، مصور جانے کب سے خاکہ مکمل کر چکا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ میں دیوار کے نقشے سے ہٹ کر اس کی تصویر کو دیکھ کر اپنا حتمی فیصلہ سناؤں، لیکن اس وقت میرے حواس میرے قابو ہی میں کب تھے۔ محرر کب کا چائے رکھ کر جا چکا تھا، جو اب پانی ہو چکی تھی۔ میں نے خاکے پر نظر ڈالی، مصور اصل چہرے سے بہت قریب تھا، میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ایسا ہی ایک خاکہ میرے لیے بھی بنا دے۔ مصور نے بنا کسی پس و پیش کے ہو بہو ویسا ہی دوسرا خاکہ بنا کر میرے حوالے کر دیا اور ایک بار پھر اس آدھے چہرے کے خاکے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میری اس عورت سے پہلے بھی کہیں نہ کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ کاش میں اسے بروقت پہچان پاتا۔

میرے بستی پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت بس نکلنے کو تھا۔ نماز پڑھ کر جب میں مسجد سے باہر آیا، تو دور آسمان پر میں نے دھانی رنگ کی ایک پتنگ اڑتے ہوئے دیکھی۔ نیچے ساحل پر اشرف اپنے دوستوں کے ساتھ خوشی میں سرشار پتنگ کو ڈھیل دیے جا رہا تھا اور اس کی دھانی پتنگ، دور آسمان میں اتنی بلند ہو چکی تھی، جہاں سے سمندر کے اوپر کا ہلکا نیلا آسمان بھی دھانی رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا، میں نے چونک کر دور ٹیلے کی جانب دیکھا تو ریحان کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ مجھے تھانے دار نے بتایا تھا کہ ٹھیک اسی رنگ اور ماڈل کی دوسری گاڑی ریحان نے لیلیٰ کو بھی کمپنی کی طرف سے دے رکھی تھی۔ ریحان حسبِ معمول سمندر کی طرف چہرہ کیے، گم صم سا کھڑا تھا۔ آج اس کے ساتھ اس کا پرانا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اس ڈرائیور کو میں پہلے بھی ریحان کے ساتھ تھانے والی ملاقات کے روز دیکھ چکا تھا، جو پینسٹھ سے ستر برس کے پیٹے کا ایک سنجیدہ اور کم گو شخص تھا۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ میں اپنی زندگی میں اب تک جتنے بھی ڈرائیوروں سے ملا تھا، وہ گفتگو کے معاملے میں دو انتہاؤں پر تھے، یا تو بے انتہا باتونی یا پھر انتہائی خاموش..... ریحان میرے قدموں کی آہٹ سن کر پلٹا ''اوہ..... تم ہو..... مجھے رحمٰن صاحب نے بتایا تھا کہ تمہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ چلو اچھا ہوا..... پولیس کی غلط فہمی دور ہو گئی.....'' میں نے غور سے ریحان کی طرف دیکھا ''مجھے پولیس کی کبھی اتنی پروا ہی بھی نہیں، لیکن کیا آپ کا دل بھی میری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔'' ریحان اسی طرح خلا میں

گھورتا رہا۔ ”جو خود اپنی ذات ہی سے بدگمان ہو، اسے بھلا اوروں سے بدگمانی کا موقع ہی کب ملتا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ ریحان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اسے اپنی تنہائی میں مداخلت بھی شاید پسند نہیں آئی تھی۔ اتنے میں اس کا ڈرائیور گاڑی سے نکل کر ہمارے قریب آگیا اور ریحان سے بولا ”چھوٹے صاحب..... سورج ڈھلنے والا ہے، ہماری واپسی کا وقت ہوگیا ہے.....“ ریحان کی آواز درشت تھی۔ ”کچھ دیر میں چلتے ہیں.....“ لیکن میری حیرت بڑھ گئی، جب ڈرائیور نے دوبارہ اصرار کیا۔ ”نہیں چھوٹے صاحب..... سورج ڈھل جائے گا..... ہمیں ابھی روانہ ہوجانا چاہیے.....“ ریحان نے کڑی نظروں سے ڈرائیور کو دیکھا، لیکن بادل نخواستہ اس نے اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ایک ڈرائیور کی ہدایت پر ریحان کا یوں بنا چوں چراں کیے چل دینا مجھے عجیب سا لگا اور پھر سورج ڈھل جانے میں ایسی کیا بات تھی، ایسی ہدایات تو عام طور پر چھوٹے بچوں کے لیے ہوتی ہیں کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر لوٹ آنا، جب کہ ریحان کے بارے میں مجھے جتنا کچھ پتا چلا تھا، اس اعتبار سے تو وہ اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ ماں باپ عرصہ پہلے انتقال کر چکے تھے اور وہ اکلوتا تھا، لہٰذا اس کا گھر میں انتظار کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک لیلیٰ تھی، جو اس کی زندگی میں بہار بن کر آنے سے پہلے ہی پت جھڑ کی نذر ہو چکی تھی۔ پھر گھر واپس لوٹنے کی یہ جلدی کیوں؟ میں خود اپنے آپ ہی سے سوال کر کے خود ہی ان کے جواب تلاش کرتا رہا۔ سورج ڈھلنے کا تعلق اندھیرے سے بنتا ہے، تو کیا ریحان تاریکی سے خوف کے کسی اسرار میں مبتلا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں ریحان کے پیچھے جا کر دیکھوں کہ وہ اس وقت اپنے گھر ہی گیا ہے یا اس کی کوئی اور مصروفیت ہے؟ عشاء کے بعد مرتضیٰ صاحب میرے اور سلطان بابا کے لیے گھر کا بنا ہوا کچھ میٹھا لے کر آئے، تو اشرف بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں نے اشرف کو اشارہ کیا اور ہم دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے اور میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران اس سے پوچھا کہ کیا اس کے پتنگ والے صاحب کبھی شام ڈھلنے کے بعد بھی ساحل کی طرف آئے ہیں۔ اشرف نے کچھ دیر سوچا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں ناں..... وہ تو میم صاحبہ کو بھی کبھی دیر تک وہاں نہیں رہنے دیتے تھے، حالاں کہ میرے سامنے کئی مرتبہ میم صاحبہ نے انہیں بولا بھی تھا کہ ہم رات کو پتنگ اڑائیں گے اور اپنی پتنگ ستاروں تک لے کر جائیں گے، لیکن صاحب کبھی رات تک رکتے ہی نہیں تھے۔“ میں نے مصور کا بنا ہوا خاکہ اشرف کو دکھایا ”کیا اس رات تم نے اسی عورت کو پہاڑی پہ آتے دیکھا تھا۔“ اشرف نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا ”ہاں ہاں..... یہی تو تھی۔ بہت تیز گاڑی چلا رہی تھی۔“ کچھ گتھیاں ایک جانب سے الجھ رہی ہوتی ہیں، تو دوسرے سرے سے ان کی گرہیں کھل بھی رہی ہوتی ہیں۔

اگلی صبح میں نے پوسٹ آفس سے تھانے فون کر کے رحمٰن صاحب کے دفتر کا نمبر لیا اور انہیں فون کر کے گزارش کی کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے تھانے پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی دو گھنٹے بعد وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سینئر ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق میرے دوروں کی تعداد میں اضافہ اور ان کے درمیانی وقفے میں روز بہ روز کمی ہو رہی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے مکمل جنوں سے پہلے لیلیٰ کے قتل کی گتھی سلجھ جائے اور اس کے لیے مجھ ان کی کچھ مدد کی ضرورت ہے۔ رحمٰن صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا ”لیکن تمہارا علاج بھی تو ساتھ ساتھ چل رہا ہے..... پھر تمہیں اتنا پختہ یقین کیوں ہے کہ تم مکمل جنوں کی منزل کو پہنچ کر ہی رہو گے.....؟ بہرحال، میں ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر ہوں..... اور یہی میرا فرض بھی ہے.....“ ”نہیں میرے لیے فرض سے بڑھ کر آپ کا ایک اور احسان ہوگا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ میری اور ریحان کی ایک ملاقات کا بندوبست کروا دیں، لیکن ہماری ملاقات شامل ڈھلنے کے بعد ہونی چاہیے۔“ رحمان صاحب کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”لیکن شام ڈھلنے کے بعد ہی کیوں، شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ ریحان شام کے بعد کسی سے بھی ملاقات نہیں کرتا۔ پولیس کو بھی اس نے ہمارے بڑوں کے ذریعے خاص ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ مغرب کے بعد کسی شخص سے بھی نہیں ملتا، چاہے طوفان ہی کیوں نہ آجائے۔ ہم بھی اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے، کیوں کہ بڑا آدمی ہے اور اس کی پہنچ بھی دور تک ہے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا ”لیکن کیا یہ بہت عجیب بات نہیں ہے..... ایک شخص مغرب ہوتے ہی دنیا کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے میں کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو اس سے کیسے رابطہ ہو سکے گا۔“ ”ایمرجنسی کے لیے اس کے ایک پرانے ڈرائیور کا فون نمبر موجود ہے، جو مغرب کے بعد ریحان کی تمام فون کالز اور پیغام وصول کرتا ہے۔ اصل میں یہ ڈرائیور ریحان کے باپ سیٹھ غیاث کے دور کا ہے اور یہی دنیا کا وہ واحد فرد ہے، جسے ریحان کا اعتماد حاصل ہے۔“ ”لیکن یہ معما کیسا ہے؟“ ”کچھ نہیں..... بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، ویسے عام لوگوں میں یہی بات مشہور ہے کہ ریحان کو بچپن ہی سے اندھیرے کا کوئی خوف (Darkness Phobia) ہے۔ بڑے گھروں کے بچوں میں تنہائی کی وجہ سے ایسی نفسیاتی بیماریاں کچھ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں ہوتیں اور پھر آخر یہ اس کی اپنی زندگی ہے۔ اس کی مرضی کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد کسی سے ملے یا انکار کر دے۔ ہم اس پر زبردستی بھی تو نہیں کر سکتے۔“ میں نے گہری سانس لی ”مطلب یہ کہ میرا ریحان سے مغرب کے بعد ملنا ممکن نہیں ہوگا۔“ ”میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا، لیکن ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہ بہت مشکل لگتا ہے۔“ ”اچھا آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مجھے شام ڈھلے اس کے گھر تک پہنچا دیں۔ یا مجھے اس کا پتا دے دیں۔ میں اپنے طور پر اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔“ رحمٰن صاحب اب بھی کچھ مخمصے میں تھے۔ ”ہاں..... یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے..... میرا عملہ تمہیں ریحان کی کوٹھی کے باہر پہنچا دے گا، لیکن میں اب بھی سمجھ نہیں پایا کہ تم اس سے مغرب کے بعد کیوں ملنا چاہتے ہو۔ میں نے سنا ہے، ریحان اپنی اس اندھیرے سے ڈرنے والی بیماری کے علاج کے لیے بیرون ملک کے بھی بہت سے چکر لگا چکا ہے اور وہاں کے اعلیٰ پائے کے معالجین سے بھی مشورہ کر چکا ہے، لیکن اس کا مرض ”مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی“ کے مصداق پھیلتا ہی چلا گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری اس مداخلت پر وہ ناراض ہو کر تمہارے لیے مزید مسائل نہ کھڑے کر دے۔ یاد رکھو، تم ابھی تک ضمانت پر ہو۔ تمہیں مکمل رہائی نہیں ملی۔“ ”جی میں جانتا ہوں، لیکن پھر بھی میں یہ خطرہ مول لینا چاہوں گا۔ میں آپ کی سرکاری مجبوریاں اور ریحان کا اثر و رسوخ جانتا ہوں۔ اسی لیے خود اپنے طور پر ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ رحمٰن صاحب نے ہنکارا بھرا اور ٹھیک تین گھنٹے بعد مغرب سے کچھ پہلے مجھے ایک عظیم الشان کوٹھی کے بہت بڑے سے گیٹ کے قریب اتار کر پولیس کی جیپ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مغرب کی اذان ختم ہوتے ہی گیٹ پر لگی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے انٹرکام پر کسی کی آواز ابھری ”کون ہے؟“ ”میں عبداللہ ہوں۔ مجھے ریحان صاحب سے ملنا ہے۔“ فوراً جواب ملا۔ ”وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔ آپ صبح آئیں۔“ انٹرکام پر کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی طاری رہی۔ پھر کوئی تھکی تھکی سی آواز میں بولا ”ہاں بولو..... کیا بات کرنی ہے تمہیں؟“ یہ آواز میرے لیے اجنبی تھی، مجھے یوں لگا، جیسے کوئی عورت ریحان کی آواز میں بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

(باقی آئندہ)

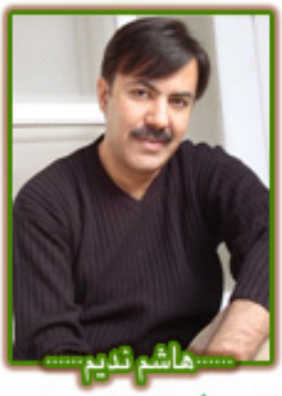

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

میں کچھ دیر تو اس آواز کے اتار چڑھاؤ ہی میں الجھا رہا۔ انٹرکام پر دوبارہ ذرا درشتی سے پوچھا گیا ''تم کچھ لیلیٰ کے بارے میں بتانے والے تھے؟''، ''جی..... لیکن آپ کون بول رہے ہیں؟ کیا میں ریحان صاحب سے بات کر سکتا ہوں.....'' دوسری جانب سے جھنجھلائی ہوئی تیز آواز اُبھری ''میں ریحان بول رہا ہوں، جلدی بولو تمہیں کیا کہنا ہے۔'' اس بار آواز واقعی ریحان ہی کی تھی۔ میں نے اپنی درخواست دہرائی۔ ''کیا میں آپ سے مل کر بات نہیں کر سکتا، آپ اپنے مہمانوں کو اس طرح دروازے ہی سے بات کر کے لوٹا دیتے ہیں؟'' دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ شاید انٹرکام رکھ دیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گیٹ کے قریب قدموں کی چاپ اُبھری اور دربان نے گیٹ کھول دیا۔ دروازے کے بالکل سامنے اندر جاتی پکی سڑک کے دونوں طرف دور تک خوب صورت بجلی کے کمان نما کھمبوں کی قطار سی چلی گئی تھی، جن پر لٹکے چھوٹے چھوٹے فانوس یوں جل رہے تھے کہ انہوں نے دُودھیا روشنی کا ایک سیلاب سا بہا رکھا تھا۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ کوٹھی میں چاروں طرف روشنی کا ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ ہر سُو چراغاں جیسی کیفیت تھی۔ میں نے جس شخص کے قدموں کی چاپ سُنی تھی، وہ ریحان کا وفادار ڈرائیور تھا، جس کے چہرے پر برہمی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا، لیکن پھر اپنے تاثرات چُھپا کر بولا ''معذرت چاہتا ہوں، لیکن اس وقت چھوٹے صاحب کسی سے بھی نہیں ملتے، چاہے کچھ بھی ہو جائے''، ''چاہے کچھ بھی ہو جائے، چاہے معاملہ کسی کی زندگی یا موت ہی کیوں نہ ہو۔'' ڈرائیور نے میری بات کے جواب میں دوبارہ سختی سے کہا۔ ''ہاں، چاہے کچھ بھی ہو جائے، لیکن ایسے موقعوں کے لیے میں ہمیشہ موجود رہتا ہوں۔ تم تو اُسی ساحلی مسجد کے طالب ہو نا۔ تو تمہارا نام عبداللہ ہے۔ تمہیں جو بھی اطلاع دینی ہے، تم مجھے دے سکتے ہو۔'' ڈرائیور نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ شاید وہ یہی سمجھا تھا کہ میں ریحان کی حیثیت دیکھ کر کچھ پیسے بٹورنے کے لیے اتنی دور آیا ہوں اور خاص اسی مقصد کے لیے ریحان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے نوٹ دوبارہ ڈرائیور کے ہاتھ میں پکڑائے ''تم غلط سمجھ رہے ہو، مجھے جو بات کرنی ہے، اس کا براہِ راست تعلق ریحان صاحب ہی سے ہے، لیکن اگر وہ واقعی اس قدر مجبور ہیں کہ مجھ سے ملنے کے لیے دروازے تک بھی نہیں آ سکتے، تو مجھے واپس پلٹ جانا چاہیے، ہاں البتہ ایک پیغام ضرور دے دینا کہ میں اس عورت کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، جو لیلیٰ کی موت کی رات پہاڑی ٹیلے پر آئی تھی۔'' میں اپنی بات ختم کر کے پلٹ گیا، لیکن میں نے مُڑتے مُڑتے بھی ڈرائیور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرتے دیکھ لیا، حالاں کہ میں نے صرف اشرف ہی سے اب تک اس عورت کی قتل والی رات ٹیلے پر آمد کا سُنا تھا، لیکن پھر بھی یہ صرف ایک اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نہیں تھا، میرا وجدان نہ جانے کیوں مجھے بار بار اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اُس پراسرار عورت کا اس قتل سے ضرور کوئی ایسا تعلق تھا، جس کے دھاگے لیلیٰ اور ریحان کے ماضی سے جُڑے ہوئے تھے۔ میں شہر سے ساحل کی طرف جانے والی آخری بس لے کر جب ساحل پر اُترا تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ جانے سے پہلے میں سلطان بابا کو بتا گیا تھا، پھر بھی وہ مسجد کے باہر مجھے اپنا انتظار کرتے ملے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر بشاشت سی آ گئی۔ ''جانتے ہو میاں..... کسی استاد کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی کیا ہوتی ہے.....؟'' میں ان کا مُدعا سمجھ کر مسکرایا۔ ''جب وہ اپنے کسی نالائق شاگرد کو اپنے راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے دیکھتا ہے۔'' میری ''نالائق شاگرد'' والی اصطلاح پر وہ بھی مُسکرا دیے۔ کال گڑھ سے نکلنے کے بعد میری زیادہ تر کوشش یہی رہی تھی کہ میں سلطان بابا کی طبیعت کے پیشِ نظر انہیں کم سے کم زحمت دوں۔ ڈاکٹروں نے بھی انہیں سختی سے آرام کی تلقین کی تھی، اس لیے میں حتی الامکان ان کے ذہن پر کسی بھی طرح کا بوجھ ڈالنے سے احتراز کرتا، لیکن آج ان کی بات سُن کر نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ سلطان بابا خود بھی دانستہ مجھے اس معاملے میں اپنا وجدان آزمانے کا موقع دے رہے تھے۔ شاید میری تربیت کا عملی دور شروع ہو چکا تھا اور اب زندگی کی گرہیں مجھے خود کھولنی تھیں۔

اگلی صبح فجر کے بعد میں ساحل پر چہل قدمی کرنے چلا گیا۔ صبح کی اوس سے بھیگی ٹھنڈی ریت، پاؤں کے تلوؤں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مجھے حکیم صاحب نے کل ایک بار پھر گیلی ریت پر چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ بقول ان کے، یہ میرے کم زور اعصاب کے لیے بہت اچھا تھا۔ انہوں نے مجھے دھوپ اور گرمی سے بھی خود کو حتی الامکان بچانے کی ہدایت کی تھی۔ شاید جنون اور تپش کا آپس میں کچھ گہرا تعلق تھا۔ پھر سورج کا تانبا زمین پر بہنے کے چند لمحے بعد ہی، جب ابتدائی کرنیں شریر بچوں کی طرح آپس میں لڑتی جھگڑتی زمین کو سب سے پہلے چُومنے کے لیے لپک رہی تھیں اور میں اپنی چہل قدمی ختم کر کے حُجرے میں جانے کے لیے مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، تو میں نے اچانک اپنے شام والے تیر کو ٹھیک نشانے پر لگتے دیکھا۔ دور نیچے آتی کولتار کی سڑک پر سفید مرسڈیز دوڑتی ہوئی اوپر پہاڑی کی جانب آ رہی تھی۔ یہ مرسڈیز میں کل شام ہی ریحان کے پورچ میں کھڑی دیکھ چکا تھا۔ شاید شہر کے اندرونی راستوں کے لیے وہ یہی کار استعمال کرتا ہوگا۔ گاڑی چند لمحوں میں مسجد کے باہر ریت کے بڑے میدان میں پہنچ کر رک گئی اور اس میں سے ریحان کا ڈرائیور برآمد ہوا۔ وہ تنہا آیا تھا۔ ''چھوٹے صاحب تم سے کل شام نہ ملنے پر معذرت خواہ ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہیں لینے کے لیے بھیجا ہے۔ تم چاہو تو ناشتا وہیں چل کر کر لینا۔'' سلطان بابا گاڑی کی آواز سُن کر صحن ہی میں نکل آئے تھے۔ میں نے ان کی جانب دیکھا۔ انہوں نے رضامندی کے اظہار میں دھیرے سے سر ہلایا۔ ڈرائیور کا نام یعقوب تھا اور وہ راستہ بھر بالکل خاموش رہا۔ میں نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہم کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے، تو دربان نے بتایا کہ ریحان صاحب کوٹھی کے پچھلے حصے میں بنے گالف کورس میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ایکڑوں پر پھیلی ہوئی جدید وضع کی کوٹھی تھی، جس کے اندر ہی گھاس کے اتنے وسیع لان تھے کہ ایک بہت بڑے گھاس کے قطعے کو گالف کے کھیل کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہمارے گھر میں پاپا نے بھی فارم ہاؤس کے پیچھے ایک چھوٹا سا گالف کورس بنا رکھا تھا، لیکن مجھے کبھی بھی اس دھیمے سے کھیل کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ یعقوب کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر پچھلی جانب جاتے ہوئے میں نے ٹینس کورٹ اور باسکٹ بال کے پختہ میدان بھی بنے دیکھے۔ شاید ریحان اپنے تمام کھیلوں کے شوق گھر ہی میں پورے کر لیتا تھا۔ گھر کے اندر ہی ایک مصنوعی ندی بھی بنائی گئی تھی، جس پر بنا پُل پار کرتے ہی دور بڑی بڑی سبز چھتریوں کے نیچے ریحان اور دو افراد کا عملہ مجھے نظر آیا، جو ریحان کے گالف والی چھڑیوں کا بیگ اور گیند وغیرہ تھامے کھڑے تھے۔ ریحان نے ریت کے ایک چھوٹے سے مصنوعی ڈھیر کے پیچھے پڑی گیند کو بہت احتیاط سے تاک کر چھڑی کی ضرب لگا کر اچھالا اور گیند کچھ دور ایک چھوٹی سی ڈھلوان پر بنے ایک سفید گول سوراخ میں غائب ہوگئی۔ عملے نے ستائشی جملوں سے اپنے صاحب کی پزیرائی کی۔ مجھے دیکھ کر ریحان نے چھڑی عملے کے حوالے کی اور اپنے ہاتھوں پر پہنے چھوٹے سفید دستانے بھی یکے بعد دیگرے اُتار دیے۔ عملہ اِدھر اُدھر ہو گیا اور ڈرائیور یعقوب بھی ایک خاص مقام پر آ کر رُک گیا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا ریحان کے قریب پہنچا۔ اس کے سفید کرچ کرچ ہوتے گھاس پر عجیب سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اس نے میز پر پڑے جوس کے گلاس کے اوپر سے پلاسٹک کا کور اُتارا ''ناشتا کرو گے.....؟'' ''نہیں..... میں ناشتے میں صرف ایک کپ چائے لیتا ہوں، ساتھ میں رات کی باسی روٹی کا ایک بچا ہوا ٹکڑا۔'' ریحان نے جوس کا ایک لمبا سا گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اُتارا اور قریب پڑی رس بھری کی پلیٹ سے ایک تازہ رس بھری اٹھا کر اپنے منہ میں رکھی۔ وہ حسبِ معمول کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے مجھ سے نہیں، مُجھ سے پرے کھڑے کسی شخص سے بات کر رہا ہو۔ ''کیا مذہب کے لیے یہ جوگ لازمی ہوتا ہے؟ میں یعقوب کی کل کی پیسوں والی حرکت پر معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے رحمٰن صاحب نے بتایا تھا کہ تم کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ وہ تمہیں کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ کل تم کچھ اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ تم چاہو تو ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں۔'' ریحان نے اپنے اندر کی بے چینی کو اپنے سرد رویے سے بخوبی ڈھانپ رکھا تھا، لیکن اس کے لہجے کی لرزش کو میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔ شاید لیلیٰ اس کی ایسی کمزوری تھی، جس کا ذکر آتے ہی وہ خود اپنے بنائے پہرے پھلانگ کر اپنے خول سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن عمر بھر کی پروئی خاردار تاروں کو کاٹنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے غور سے اس کے ہاتھوں کی خفیف لرزش کو دیکھا۔ ''آپ نے یہی بات گزشتہ شام کیوں نہیں سُنی.....؟ میں لیلیٰ کے آخری لمحات کا واحد عینی شاہد ہوں۔ میری ذہنی حالت بھی کچھ ایسی بہتر نہیں کہ میں تمام باریکیوں کو ٹھیک طرح سے اپنے ذہن میں جمع رکھ سکوں۔ اس لیے میں شام ڈھلے آپ کے دروازے تک آیا تھا۔'' ریحان نے اپنے لہجے کی تلخی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ ''تمہیں ایک چھوٹی سی بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ میں شام ڈھلنے کے بعد کسی سے ملاقات نہیں کرتا۔ میرے کاروباری حلقے میں بھی سب ہی کو یہ بات پتا ہے اور میں اپنے معمول کے خلاف کبھی نہیں جاتا۔'' ''کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' ریحان کی آواز بلند ہوگئی ''نہیں..... میں اپنے ذاتی معاملات پر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ بہتر ہوگا تم بھی اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کرو۔'' میں نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے، ''بہتر ہے..... اگر ہم دونوں کے درمیان اعتماد کا اسی قدر فقدان ہے، تو پھر میری یہاں موجودگی بھی بے معنی ہے۔'' ریحان نے مجھے آواز دی ''سنو..... تم..... تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اس کا تعلق میرے بچپن کے ایک خوف سے ہے۔ میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کسی طرح اپنے اس ہسٹریا پر قابو پا سکوں..... لیکن فی الحال میرے لیے اس موضوع پر بات کرنا بھی نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ امید ہے اب تم مزید اصرار نہیں کرو گے۔'' میں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس وقت روئے زمین پر اس سے زیادہ مجبور انسان شاید اور کوئی نہ ہوگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یقین جانو، کل جب سے مجھے تمہارا پیغام ملا کہ تم لیلیٰ کی آخری سانسوں کے شاہد ہو اور مجھے اُس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے ہو، تو میں رات بھر سو نہیں پایا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ محبت کس قدر ظالم اور جابر جذبہ ہوتا ہے۔ چاہے، اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی، لیکن اس سے متعلق ہر ذکر، ہر یاد میرے لیے پہلے سے کہیں قیمتی ہوگئی ہے۔ میں اپنی تمام دولت دے کر بھی اس سے جُڑی چھوٹی سے چھوٹی بات، ہر یاد اپنے دل کی پٹاری میں بند کر لینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، تمہیں روپے پیسے یا کسی صلے کی حرص نہیں ہے، لیکن میں تمہیں دل سے نکلی دعا کا خزانہ تو دے سکتا ہوں۔ کاش تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی، تو آج میرے دل کا حال جان پاتے۔'' ریحان اپنی بات ختم کر کے یوں ہانپنے لگا، جیسے نہ جانے کتنی دور سے دوڑ کر آیا ہو۔ تو اب نوبت یہ آ گئی تھی کہ لوگ میرے حُلیے کو دیکھ کر مجھے محبت کی دہائی دینے لگے تھے۔ بہر حال، ریحان نے لیلیٰ کے لیے اپنے جذبات کھول کر بیان کر دیے تھے۔ مجھے اس کے لہجے میں کوئی کھوٹ محسوس نہیں

ہوا۔ ویسے بھی محبت کرنے والے اپنے اندر کوئی کھوٹ کیسے پال سکتے ہیں۔ محبت ہمارے اندر اتنی جگہ ہی کہاں رہنے دیتی ہے کہ کوئی اور جذبہ پنپ سکے؟ محبت ہمیں اندر سے بھر دیتی ہے، مکمل کر دیتی ہے۔ ریحان بھی اندر سے مکمل تھا۔ لیلیٰ کی محبت نے اس کے اندر کسی چھل کپٹ کا خانہ خالی ہی نہیں چھوڑا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں یہ خوف کیسا تھا۔ یہ اذیت کیسی تھی، جو اُسے اپنا درد اندر دبائے رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں پلٹ کر چند قدم آگے بڑھا اور ریحان کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا۔ ''لیلیٰ نے مجھ سے صرف ایک ہی جملہ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی سانسیں ہار گئی.....'' ریحان نے تڑپ کر میرے دونوں کاندھے اتنی زور سے پکڑ لیے کہ اس کی انگلیاں میرے شانوں میں پیوست ہونے لگیں۔ ''کیا..... لیلیٰ نے تم سے کیا کہا تھا..... مجھے بتاؤ..... خدا کے لیے مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ.....'' اور ٹھیک یہی وہ لمحہ تھا، جب میرے ذہن میں بہ یک وقت بہت سے جھماکے ہوئے۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا دعویٰ کبھی نہ تھا، لیکن ریحان کی آنکھوں نے میرے اندر نہ جانے ایک ہی پل میں کتنی بصارتیں بھر دیں۔ شاید قدرت بہ یک وقت مجھ سے میری فرزانگی چھین بھی رہی تھی اور میرے اندر دیوانگی کے ساتھ ساتھ ایک ان جانی روشنی بھی کسی درز سے مستقل چھن کر آ رہی تھی۔ میں دھیرے سے بولا ''لیلیٰ نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے اُسے معاف کیا۔ ریحان کے سر پر جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑے سے حملہ کر دیا ہو۔ وہ اپنا سر تھام کر وہیں کرسی پر گر گیا۔ دور کھڑے یعقوب کے ساکت وجود میں بے چینی سے حرکت پیدا ہوئی، لیکن شاید اس کی حد وہیں تک تھی۔ بادل نخواستہ وہ پھر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ ریحان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اتنی جلدی نمودار ہوئیں، جیسے کوئی کسی گیلے اسپنج کو دبا دے۔ پھر جب وہ بولا تو اس کی آواز لرز رہی تھی ''لیکن..... وہ کس کو معاف کرنے کی بات کر رہی تھی.....'' ''یہ تو میں نہیں جانتا۔ شاید اُسی ان جان عورت کو، جسے اس رات پہاڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔'' ریحان بالکل ہی چپ ہو گیا۔ میرے مزید وہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اب ریحان کو لیلیٰ کی یادوں کی بارات کو ڈولی چڑھانے میں گھنٹوں لگ جائیں گے۔ میں نے یعقوب سے کہا کہ وہ اپنے صاحب کا خیال رکھے، میں بس لے کر بستی چلا جاؤں گا۔ واپسی پر آتے ہوئے میں تھانہ ماہی کے اسٹاپ پر اُتر گیا۔ اسماعیل سنتری کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر میں واپس بستی آ گیا۔ جانے اُس دن گرمی ہی کچھ زیادہ تھی یا پھر خود میرا ہی دم، جس سے گھٹا جا رہا تھا۔ وہی ایک عجیب سی بے چینی چاروں طرف سے مجھے گھیر رہی تھی، جو مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتی رہتی تھی کہ کچھ اَن ہونی ہونے کو ہے۔ شام تک میں بالکل ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ مجھے سلطان بابا نے بتایا تھا کہ پیش گوئی، الہام اور وجدان کا خود بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ منوں اور ٹنوں جیسا وزنی اور ہمارے کومل انسانی وجود پر ایسے لمحات بے حد گراں اور بھاری گزرتے ہیں، تو کیا میرے شانوں کو بھی اس وجدان کا بھاری وزن توڑ رہا تھا۔ آج ہفتے کی رات تھی، لہٰذا ساحل پر اور پہاڑی ٹیلے پر غیر معمولی چہل قدمی تھی۔ کافی خاندان چھوٹے بچوں سمیت ساحل کی سیر کو آئے ہوئے تھے۔ مغرب سر پر آ گئی تھی، لیکن ابھی تک کافی لوگ ساحل کی اس ویران پٹی کے اردگرد بکھرے تھے۔ نماز کے بعد میرے اندر کی بے چینی نے مجھے زیادہ ستایا تو میں ٹیلے کی چوٹی کی جانب چلا گیا۔

ملگجا اندھیرا چھا چکا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر فاصلے پر ٹولیوں میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے، مشروبات پی رہے تھے، اپنے بچوں کے ساتھ دل بہلا رہے تھے۔ میں ان سب سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا اور دور پہاڑی سے نیچے جھاگ اُڑاتے سمندر کو دیکھنے لگا۔ وہی سمندر، جس کے دوسرے کنارے پر زہرہ رہتی تھی۔ جانے سلطان بابا نے اسے میرا پیغام بھیجا ہوگا یا نہیں۔ میرے اندر زہرہ کو براہِ راست مخاطب کرنے کی جھجک آج بھی روزِ اوّل کی طرح موجود تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے کسی نے میری پشت پر موجود ٹیلے کے پیچھے سے دھیرے سے آواز دی ''عبداللہ'' میں چونک کر پلٹا، لیکن اندھیرے کی وجہ سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں اپنا وہم سمجھ کر پھر سے سمندر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔ ''عبداللہ'' عجیب سی کرخت، لیکن نسوانی آواز کے تعاقب میں، میں نے ایک بار پھر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر اگلے ہی لمحے میرے تمام جسم کا خون ایک ہی پل میں میری نسوں میں جم گیا۔ اپنا آدھا چہرہ سُرخ پلّو میں چھپائے اور اپنے وجود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھکے، وہ چٹان کی آڑ میں کھڑی تھی۔ ہاں..... یہ وہی تھی، جسے اس رات میں نے اس جگہ اپنی سرخ سینڈل کی ایڑی ٹوٹی چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہی عورت تھی، جس کی تلاش میں پولیس دربدر بھٹک رہی تھی اور جسے لیلیٰ کے قتل کی رات چوٹی کی جانب آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ اس طرح چھپ کر کھڑی تھی کہ کچھ دُور موجود ایک خاندان کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑ سکتی تھی کہ وہاں کوئی اور موجود ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور ہماری باتوں کی آواز بھی بہ مشکل ہی وہاں تک پہنچتی۔ میرے حواس ابھی تک جامد تھے۔ ''تم اس روز بھاگ کیوں گئی تھیں.....؟'' وہ غرّائی ''میرے پاس ان باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ ریحان سے دور رہو۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالو، ورنہ جہاں ایک جان گئی ہے، وہاں دوسری بھی جا سکتی ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیا ''تو میرا شک صحیح ہے۔ لیلیٰ کی موت تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے.....'' وہ دبی آواز میں چلائی۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا، جیسے وہ آواز بگاڑ کر بول رہی ہے ''تم اپنے کام سے کام رکھو مولوی..... اور تم نے ریحان سے جھوٹ کیوں بولا کہ اس رات لیلیٰ نے تم سے کوئی بات کی تھی۔ میں اسی ٹیلے پر موجود تھی، جب وہ نیچے گری تھی۔ اس وقت نیچے کوئی نہیں تھا۔ میں نے اسے نہیں مارا، لیکن اگر وہ میرے اور ریحان کے درمیان آنے سے باز نہ آتی، تو میں واقعی اسے ختم کر دیتی۔ اس کی آواز میں اس قدر سفاکی تھی کہ میں اندر تک لرز کر رہ گیا۔ اس نے آج بھی اپنا آدھا چہرہ پوری طرح ڈھک رکھا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کی شخصیت میں کسی بڑی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر غرّائی ''میں تمہیں آج آخری بار تنبیہ کرنے آئی ہوں کہ اگر تم نے دوبارہ ریحان کے دل میں اس منحوس لیلیٰ کی محبت جگانے کی کوشش کی، تو اگلا نمبر تمہارا ہی ہوگا۔'' اچانک تین چار بچے اپنی گیند کے پیچھے پیچھے چوٹی کی جانب دوڑے اور ان کی مائیں انہیں روکنے کے لیے ان کی طرف لپکیں، جونہی چند لوگ ہمارے درمیان حائل ہوئے اور ایک لمحے کے لیے میری توجہ ہٹی، تو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، تو وہ کسی چھلاوے کی طرح وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں فوراً بھاگ کر چٹان کے پیچھے پہنچا۔ مجھے دور اندھیرے میں ایک ہیولا تیزی سے دوڑتے ہوئے اُس جانب بڑھتا نظر آیا، جہاں کچھ لوگوں کی گاڑیاں پارک تھی۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں جلدی میں اس کی جانب دوڑا۔ آج وہ کسی دوسری گاڑی میں آئی تھی۔ شاید اسے پولیس کے پہرے کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن وہ شاطر تھی۔ اس نے ساحل پر آنے کے لیے ہفتے کی شام کا انتخاب کیا تھا، جب ویک اینڈ منانے کے لیے شہر کے بہت سے گھرانے اس پوائنٹ کا رخ کرتے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس کی گاڑی فرّاٹے بھرنے لگی۔ دفعتاً مجھے اندھیرے میں ٹھوکر لگی اور میں مُنہ کے بل ریت پر گر گیا۔ اٹھتے وقت میری نظر ریت میں دھنسی ایک چھوٹی سی چیز پر پڑی اور میری آنکھیں پتھر کی ہو گئیں۔ میں وہیں ڈھے گیا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ عورت کون تھی۔

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

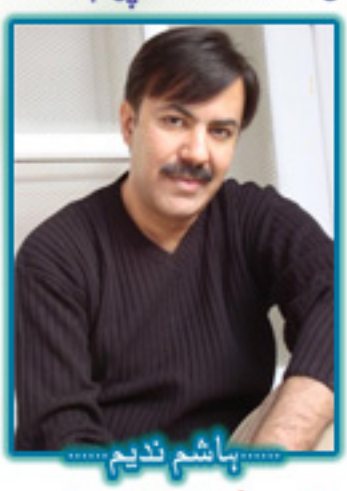

.....ہاشم ندیم.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے بہ راہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

اس رات میں ایک پل کے لیے بھی پلک نہیں جھپکا پایا۔ زندگی کے کتنے زاویے اور محبت نامی اس عفریت کے کتنے رخ ہو سکتے ہیں، شاید یہ بتانا ہم میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ کم از کم میں نے تو جب بھی یہ سوچ کر آخری صفحہ پلٹا کہ شاید یہ باب بند ہوا، ٹھیک اُسی لمحے خود کو پھر سے پہلے صفحے پر پایا۔ اگلی صبح میں نے ڈاک خانہ کھلتے ہی سب سے پہلا فون رحمٰن صاحب کو کیا اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں تھانہ ماہی میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ میری بات سُن کر اُن کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ حسبِ معمول ان کا چہرہ سگریٹ کے نیلے دھوئیں کے پار دُھند میں ڈوبا نظر آ رہا تھا، ''تم جانتے ہو، تم جس جگہ مجھے رات کو چھاپہ مارنے کا کہہ رہے ہو، وہاں دن میں باقاعدہ اجازت لے کر جانے کے لیے بھی نہ جانے کتنے ایوانوں کی گھنٹیاں ہلانا پڑتی ہیں۔ مجھے محکمے سے اجازت ملنا تو دُور، اس بات کا ذکر کرتے ہی سخت سُست سُنا کر تبادلہ کر دیا جائے گا۔'' ''لیکن آپ کی اتنے عرصے کی نوکری میں چند افسرانِ بالا تو ایسے ہوں گے، جن پر آپ کا بھرم اور اعتماد قائم ہوگا۔ کیا آپ انہیں بھی مدد کے لیے نہیں پکار سکتے۔ آپ بہر حال اپنا فرض ہی تو پورا کریں گے یا پھر محکمہ آپ کو صرف وہاں کارروائی کی اجازت دیتا ہے، جہاں کارروائی کرنے سے کسی ایوان کی گھنٹی نہ ہلتی ہو۔'' رحمٰن صاحب نے ایک لمبا سا کش لے کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا ''بات تلخ ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ ہماری ان دیکھی حدیں ہمیشہ ہی سے مقرر ہیں'' وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں گم رہے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولے، ''ٹھیک ہے..... آج یہ جوا بھی کھیل لیتے ہیں۔ مجھے تمہارے وجدان پر بھروسا کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ سُجھائی بھی نہیں دے رہا، لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میرے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہاتھ ذرا سا بھی ترچھا پڑا تو حکام کو مجھے فارغ کرنے میں چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت لگے گا اور ایسی صورت میں، میں بھی تمہاری ہی مسجد کے حجرے میں اپنا بستر ڈالوں گا۔'' انہوں نے چند فون نمبر گھمائے اور پھر شام ڈھلتے ہی ہم کچھ ضروری نفری کے ساتھ اپنی منزل کے دروازے پر موجود تھے۔ ممکنہ مزاحمت کے بعد دروازہ کُھلوا لیا گیا۔ رحمٰن صاحب نے اپنے عملے کو ہدایت کر دی تھی کہ جب تک وہ خود کسی سے بات کروانے کا نہ کہیں، تب تک کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا پیغام یا فون انہیں منتقل نہ کیا جائے۔ گھر میں عجب سناٹا طاری تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے تو مرکزی عمارت کے دروازے کو مقفل پایا۔ رحمٰن صاحب کے اشارے پر دو مضبوط جسم کے سپاہیوں نے کافی مشقت کے بعد تالا توڑ ڈالا۔ اندرونی جانب سے دو تین سہمے ہوئے نوکر اور خدّام نکلے، جو باورچی خانے کے دروازے سے باہر نکلنے کی تگ و دو میں تھے۔ انہیں اطمینان دلوایا گیا کہ کوتوالی کو اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ اوپر کی منزل کے کمرے کُھلے پڑے تھے۔ مجھے ایک پردے کے پیچھے سے دو گھنگھروؤں کی جوڑیاں بھی جھلکتی نظر آئیں۔ اگلا کمرہ چھوٹا سا ہال تھا، جہاں طبلہ اور ہارمونیم سلیقے سے پڑے تھے۔ شاید یہاں رقص کی مشق کی جاتی ہو۔ ہمارے اس گھر میں داخل ہونے سے لے کر اب تک لگاتار رحمٰن صاحب کے ڈرائیور، گارڈ، تھانے دار اور دیگر عملے کے دستی وائرلیس سیٹ (واکی ٹاکی) پر درجنوں پیغام وصول ہو چکے تھے۔ جس میں رحمٰن صاحب کو اعلیٰ حکام اور شہر کے کمشنر اور آئی جی وغیرہ کی طرف سے مسلسل ہدایت کی جا رہی تھی کہ وہ جہاں بھی ہوں، اپنا مشن ختم کر کے فوراً ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں۔ رفتہ رفتہ یہ پیغام دھمکیوں کی صورت اختیار کر گئے، لیکن ایس پی صاحب شاید اپنی آخری کشتی بھی جلا کر نکلے تھے۔ پولیس کے جوان مختلف دروازوں کو دھکیلتے جا رہے تھے اور ہر کمرا بے حد سجا ہوا، نفیس ساز و سامان سے آراستہ اور بہترین آرائش کا شاہکار تھا۔ کمروں کی کلر اسکیم پر بھی بہت دھیان دیا گیا تھا، لیکن سبھی کمرے خالی تھے اور پھر آخری کمرا بند ملا۔ رحمٰن صاحب نے اندر موجود فرد کو تنبیہ کی کہ دروازہ کھول دیا جائے ورنہ وہ اُسے توڑ دیں گے۔ اندر سے آواز ابھری ''تھوڑا انتظار کریں.....'' کچھ دیر بعد کسی کے تھکے قدم گھسیٹنے کی آواز آئی اور دروازہ کُھل گیا۔ زنانہ کپڑے اور کاسمیٹکس اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ کمرے کی ڈریسنگ ٹیبل پر دنیا کی بہترین کمپنیوں کا میک اپ کا سامان سجا ہوا تھا۔ ایک پردے کے پیچھے سے مجھے وہ سُرخ سینڈل بھی جھانکتے ہوئے نظر آ گئے، جن کی ایک ایڑی اس وقت پولیس کی تحویل میں تھی۔ ایک عورت دروازہ کھولنے کے بعد کمرے میں اندھیرا کر کے دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ رحمٰن صاحب کے اشارے پر عملے کے کسی فرد نے کمرے کی بتی جلائی تو پہلے ہماری نظر کمرے کے سامان اور پھر اُس سکڑے سمٹے وجود پر پڑی۔ رحمٰن صاحب نے کڑک کر اُسے کھڑا ہونے کو کہا، تو گھٹنوں میں چھپا ایک چہرہ دھیرے دھیرے اٹھا اور پولیس کا سارا عملہ رحمٰن صاحب سمیت ہکا بکا رہ گیا۔ عورت کے بھیس میں ہمارے سامنے ریحان کھڑا تھا اور اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔

آگے کی کہانی زیادہ پے چیدہ نہیں تھی۔ رحمٰن صاحب نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اخبار اور میڈیا تک اس چھاپے کی خبر نہ پہنچے، لیکن پھر بھی صبح کے تمام اخبارات کی شہہ سرخی ملک کے بڑے صنعت کار ریحان کی اپنی منگیتر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتاری ہی کی تھی۔ ایک رات پہلے جب میں اُس

عورت کا پیچھا کرتے ہوئے گر پڑا تھا، تب نیچے ریت میں مجھے سفید کرچ کے جوتوں کا ایک سول نظر آیا تھا۔ یہ اُن ہی جوتوں میں سے ایک کا سول تھا، جو میں اُسی صبح ریحان کو گالف کورس میں پہنے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ریحان گرفتار ہوا تو رات بھر نہایت بے چین رہا اور اپنا وجود چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کا برتاؤ بھی بہت عجیب تھا۔ کبھی وہ نسوانی آواز میں پولیس کے عملے کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا، تو کبھی ان کی منت کرتا کہ اسے واپس جانے دیا جائے، کیوں کہ گھر میں ''ریحان'' اکیلا گھبرا رہا ہوگا۔

میں نے رحمٰن صاحب سے خصوصی درخواست کی تھی کہ اس کی یہ حالت عام نہ ہونے پائے اور ہمیں ہر حال میں ریحان کا پردہ رکھنا ہوگا۔ اگلی صبح تک ریحان بالکل لاتعلق ہو چکا تھا اور ہر سوال کے جواب میں صرف خلا ہی میں گھورتا رہتا۔ اس نے صبح ہی اقرار کرلیا کہ ''وہ لیلیٰ کو مارنا نہیں چاہتی تھی، لیکن ہاتھا پائی کے دوران لیلیٰ کا پاؤں پھسلا اور وہ اونچائی سے گر گئی۔'' ریحان کے بیان سے لگتا تھا، جیسے وہ کسی تیسری ہستی کے بارے میں بیان دے رہا ہو، لیکن ''وہ'' کون تھی، جو ریحان کے اندر برسوں سے بسیرا کیے بیٹھی تھی۔ یہ وہ معمّا تھا، جس کا سراغ ماہر نفسیات دانوں کی سات رُکنی ٹیم پورے پانچ دن بعد لگا پائی۔

تفتیش کا آغاز ریحان کے بچپن سے ہوا۔ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونے والا ریحان، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں کبھی اسے بیٹے کا پیار دیتی اور کبھی بیٹی کا سنگھار کر کے اس کے ساتھ کھیلتی، لیکن منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے بچے کو گھر سے باہر کم ہی نکالا جاتا۔ پھر نہ جانے کب ریحان کے باپ غیاث الدین کی زندگی میں ایک کنول نامی لڑکی، جو اس کی پرانی سیکریٹری کی جگہ صرف چند دن کے لیے آئی تھی، داخل ہوگئی اور دھیرے دھیرے اس کے دل و دماغ ہی پر نہیں، پورے کاروبار پر قابض ہوتی چلی گئی۔ غیاث کا اپنی بیوی سے آئے دن جھگڑا رہنے لگا اور چار سالہ ریحان پردوں کے پیچھے چھپا اپنے ماں باپ کو چیخ چیخ کر لڑتے ہوئے دیکھ کر روتا رہتا۔ بات اتنی بڑھی کہ غیاث اپنی بیوی پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا اور ایک دن تو ریحان نے اپنے باپ کو اپنی ماں کا گلا دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بات کورٹ کچہری تک چلی گئی اور ریحان کی ماں کو اس کے والدین آکر اپنے ساتھ لے گئے۔ ریحان کو اس کے باپ نے جانے نہیں دیا اور معصوم ریحان اپنے گھر کے پورچ میں کھڑا روتے ہوئے اپنی ماں کو نانا کی کار میں پچھلی سیٹ پر ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پلٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی ماں کی آنکھوں سے ٹپکے آخری دو آنسو ہمیشہ کے لیے ریحان کی روح کو بھگو گئے۔ شاید پہلی مرتبہ اُسی دن اس کے اندر کی شخصیت دو حصّوں میں تقسیم ہوئی تھی، جس میں سے ایک حصّہ ریحان کے پاس رہ گیا اور دوسرا حصہ ہمیشہ کے لیے اس کی ماں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔

باپ نے ننھے ریحان کو درختوں اور پردوں کے پیچھے چھپ کر اپنی ماں کے لیے روتے ہوئے دیکھا، تو اپنے وفادار ڈرائیور یعقوب کو ہدایت کی کہ اس کے دفتر سے واپس آنے تک وہی ریحان کے بہلنے کا کچھ سامان کیا کرے۔ ڈرائیور کو اور تو کچھ نہ سوجھی، وہ اداس ریحان کو لیے بنگلے کے پیچھے اپنے سرونٹ کوارٹر میں لے آتا، جہاں اس کی بیوی اور چھ بیٹیاں ہر ممکن کوشش کرتیں کہ ان کے صاحب کے لاڈلے کا دل بہلا رہے، لڑکیوں کے کھیل زیادہ تر وہی ہوتے، گڑیا اور گڈے کی شادی، کوکلا چھپاکی، ہنڈکلیا بنانا یا پھر ایک دوسرے کو سستی نیل پالش اور سرخی سے سنوارنا۔ سو، ریحان بھی انہی مشغلوں میں گم ہوتا گیا۔ تیسرے ماہ ریحان کی سگی ماں کو طلاق بھیجنے کے ساتھ ہی اُس کا باپ غیاث، کنول کو ریحان کی سوتیلی ماں کے روپ میں گھر لے آیا۔ کنول نے دو چار دن تو غیاث الدین کو دکھانے کے لیے ریحان سے جھوٹا پیار جتایا، لیکن پھر جلد ہی وہ اس ناٹک سے اُوب گئی اور ریحان اُسے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ بات صرف سوتیلے پن کی حد تک ہوتی، تو بھی کنول شاید ریحان کی موجودگی کا کڑوا گھونٹ پی ہی لیتی، لیکن کچھ عرصے کے بعد غیاث الدین کی فیکٹری کا نوجوان منیجر غیاث کی غیر موجودگی میں کسی نہ کسی بہانے کوٹھی کے چکّر لگانے لگا، تو ایسے میں کنول کو ریحان کی گھر میں موجودگی زہر لگتی۔ ایسے میں یا تو ریحان کو اوپر اس کے کمرے میں ڈانٹ ڈپٹ کر کے بند کر دیا جاتا یا پھر کوٹھی کے پچھواڑے بھیج دیا جاتا کہ وہ جا کر یعقوب کی بیٹیوں سے کھیلے۔ اس تمام احتیاط کے باوجود ریحان کی سوتیلی ماں اسے مختلف طریقوں سے ڈراتی رہتی اور اسے سیڑھیوں سے جُڑے کمرے کے نیچے والے تہہ خانے میں بند کرنے کی دھمکی دیتی، تاکہ وہ اپنے باپ کی رات گئے واپسی پر منیجر کی آمد کا ذکر نہ کرے۔ ایسے مواقع پر اگر یعقوب کی گھر والی اور بیٹیاں کہیں گئی ہوتیں تو ریحان اپنے کمرے میں بند خود ہی گڑیا اور گڈے کا کھیل کھیلتا رہتا۔ پھر اس کے ہاتھ کہیں سے لپ اسٹک لگ گئی، تو وہ اپنی باجیوں کی طرح ہونٹوں پر سُرخی لگانے میں مگن رہتا۔ رفتہ رفتہ اس نے آنکھوں میں کاجل بھرنا اور نیل پالش لگانا بھی سیکھ لیا، پھر ایک دن اسے سوتیلی ماں کی ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کے سامان کی پوری کٹ ہی نظر آگئی، تو وہ چپکے سے وہ بھی اپنے کمرے میں اٹھا لایا اور کئی دن تک مختلف شیڈز سے اپنا چہرہ رنگین کرتا رہا۔ بدقسمتی سے اس کی یہ چوری جلد ہی پکڑی گئی اور اس کی ماں نے، جو نوکرانی پر اس کٹ کی گم شدگی پر کئی دن سے برس رہی تھی، ریحان کو میک اپ استعمال کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ سوتیلی ماں کا قہر اس دن عروج پر تھا اور اس نے سزا کے طور پر ننھے ریحان کو اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف اسی تہہ خانے میں قید کر کے بخش دیا۔ جس تہہ خانے کے ذکر ہی سے ریحان بھاگ کر اپنے کمرے کی الماری کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔ وہ دو گھنٹے اس تاریک تہہ خانے میں ریحان نے کس طرح روتے، سسکتے اور ڈر سے کانپتے گزارے، اس کا احساس صرف وہی کر سکتے ہیں، جن کی اپنی کوئی اولاد ہو۔ اس تہہ خانے کی دیواروں پر اس روز اندھیرے میں ریحان نے اتنے عجیب و غریب ہیولے بنتے اور مٹتے دیکھے کہ اس دن، اس کی اپنی شخصیت ہی ایک ہیولہ بن کر رہ گئی۔ شام کو باپ کے آنے سے پہلے سوتیلی ماں ریحان کے جسم کو تہہ خانے سے باہر کھینچ لائی، لیکن اس کی روح وہیں اندھیرے میں بھٹکتی رہ گئی۔ اس رات کے بعد سے اندھیرا ریحان کو ڈسنے لگا اور وہ سوتے وقت بھی کمرے کی تمام بتیاں جلائے رکھنے کا عادی ہوگیا۔ ایسے میں کمرے میں پڑا آئینہ ریحان کا سب سے قریبی دوست بنتا گیا۔ ریحان کو میک اپ کا شوق تو اپنی باجیوں سے پہلے ہی مل چکا تھا، اب اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے اور اپنے راتوں کے خوف کو مٹانے کے لیے اس نے اپنے ہی کمرے میں ایک دوسری دنیا آباد کر لی تھی، کیوں کہ اس کے باپ کو اتنی فرصت تھی نہیں کہ وہ اپنے خوف زدہ بیٹے کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر دو میٹھی باتیں ہی کر لیتا یا اسے لوری سُنا کر سُلا دیتا۔ ایسے میں ریحان نے اپنے خوف کو لوری دینے والی خود ایجاد کر لی۔ رات گئے جب سارے گھر کی بتیاں بُجھ جاتیں، تو وہ چپکے

سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھ جاتا اور اِدھر اُدھر سے چرائی سُرخی اور غازہ اپنے چہرے پر مَل کر اپنے آدھے چہرے کا میک اپ کرتا۔ پھر یہی آدھا چہرہ اس کی ماں، بہن، دوست، سب ہی کچھ بن جاتا۔ داہنی حصے والی عورت ریحان سے باتیں کرتی، اُسے کہانیاں اور لطیفے سُناتی اور چہرے کے بائیں حصے والا ریحان خوش ہوتا، ہنستا اور اپنے چہرے کے داہنے حصے سے وہ سب کہتا، جو وہ اپنی سگی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔ اس کا طریقۂ کار یہ ہوتا کہ ریحان کو جب عورت سے بات کرنی ہوتی، تو وہ اپنے چہرے کا بایاں حصہ جو بنا میک اپ سادہ رہتا، اُسے آئینے کے رُخ پر رکھتا اور سوال کرتا، ضد کرتا، کہانیاں اور لوری سُننے کی فرمائش کرتا اور پھر جواب کے لیے، چہرے کا دایاں حصہ ایسے رُخ پر آئینے کو دکھاتا کہ صرف وہ مہربان عورت ہی اسے شیشے میں جھانکتی نظر آتی، جو ریحان کی سب ضدیں، ہر فرمائش پوری کرتی اور پھر جب رات نصف سے بھی زیادہ بیت جاتی، تو ریحان کی دوست، ماں، بہن اور ہم درد اُسے ایک اچھی سی لوری سُناتی۔ وہ لوری، جو ریحان اپنی سگی ماں سے سُنا کرتا تھا اور پھر آخر کار ریحان کو نیند آ جاتی۔ اس تمام عرصے میں ریحان کے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رہتا اور صبح تب ہی کھلتا، جب وہ عورت ریحان کا ماتھا چوم کر اگلی شام تک کے لیے رُخصت ہو جاتی۔ اب ریحان کو باقی دنیا سے شدید بے زاریت اور نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ بس ایک یعقوب اور اس کا گھرانہ ہی تھا، جہاں کچھ دیر کے لیے ریحان کا دل لگ پاتا تھا، لیکن اب وہاں سے بھی ریحان سرِ شام ہی بھاگنے کی کرتا، کیوں کہ اندھیرا ہوتے ہی اس کی پیاری اور مہربان دوست نے جو آنا ہوتا تھا۔

وہاں ریحان کی سوتیلی ماں کنول نے بھی ایک ہی بار بڑا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنایا اور ایک صبح جب گھر کے مکین اٹھے، تو تمام تجوریوں اور زیورات سمیت بینک بیلنس کو صاف پایا۔ اس دن کے بعد سے کنول اور فیکٹری کے منیجر کی کبھی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ ریحان کا باپ اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا۔ بات صرف پیسے کی ہوتی، تو وہ ایک سال ہی میں کھوئے ہوئے مال سے تین گنا زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتا تھا، لیکن اسے بستر پر ڈال دینے والا صدمہ بے وفائی کا تھا۔ رفتہ رفتہ جب باتیں کُھلنے لگیں، تو پتا چلا کہ کنول نے یہ سارا منصوبہ ہی اپنے چاہنے والے فیکٹری منیجر کی وساطت سے بنایا تھا اور اس کی شادی سے لے کر اب تک ہر بات پہلے سے ایک منصوبے کے تحت طے شدہ تھی۔ ریحان کا باپ دوبارہ بستر سے نہیں اُٹھ سکا اور پندرہ سالہ ریحان کو اپنے وفادار ڈرائیور کی سپردگی میں دے کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گیا۔ اس دوران ریحان کی سگی ماں کو تلاش کرنے کی بھی بہت کوشش کی گئی، مگر سب بے سُود۔ یعقوب نے نمک کا حق ادا تو کیا، لیکن اب ریحان جوان ہو رہا تھا اور اس نے اپنے گرد اتنا مضبوط خول بنا رکھا تھا کہ اس کے دل کی بات کسی تک پہنچنا محال تھا۔ آخر کار، یعقوب کی سب سے چھوٹی بیٹی بھی اپنے گھر سدھار گئی اور یعقوب کی بیوی کی موت کے بعد ریحان کی زندگی کا آخری روشن دان بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا، لیکن یعقوب کی بیوی مرتے مرتے اپنے شوہر کو اس کے چھوٹے صاحب کے اندر پلتی دو الگ شخصیات کا حال دے گئی، کیوں کہ اس نے بھی ایک ماں کی طرح ہی ریحان کو پالا تھا اور وہ گزشتہ کئی مہینوں سے ریحان کی سرِ شام شروع ہو جانے والی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ یعقوب زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا، لیکن زمانہ شناس ضرور تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ریحان اپنے اندر پلتی اس عورت کے ساتھ اتنی دور آ چکا ہے کہ اب اس کی واپسی بہت مشکل ہے۔ ریحان نے شام کے بعد خود کو دنیا سے بالکل کاٹ دیا اور دنیا میں اب صرف یعقوب ہی وہ واحد فرد تھا، جسے پتا تھا کہ شام ڈھلنے کے بعد ریحان، ریحان نہیں رہتا، اس کے اندر کی عورت باہر نکل آتی ہے۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ ریحان کے اندر کی عورت کی عمر، ریحان کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ گھٹتی گئی۔ بچپن میں وہ اس کی ماں تھی، لڑکپن میں دوست اور ہم درد اور جوانی میں وہ باقاعدہ ایک محبوبہ کے حقوق حاصل کر چکی تھی۔ دن میں اگر عملے کی کسی لڑکی سے ریحان دو گھڑی رُک کر بات کر لیتا یا کوئی ریحان کی شان دار شخصیت کو نظر بھر کر دیکھ لیتی، تو شام کو کمرے میں آنے کے بعد جب ریحان آئینے کے سامنے بیٹھتا، تو اس کی روح کی قابض باقاعدہ اس سے لڑتی جھگڑتی اور روٹھ جاتی۔ دونوں کے درمیان مکالمے کی صورت کچھ یوں بنتی کہ ریحان بائیں جانب چہرے کی اوٹ سے اس سے پوچھتا ”آج چُپ سی ہو۔ کوئی ناراضی ہے کیا۔“ داہنا میک اپ زدہ حصہ مُنہ بنا کر کہتا ”تمہیں اس سے کیا؟ تمہیں تو اُس پُھل جڑی شائستہ کے نخرے اٹھانے سے ہی فرصت نہیں۔“ ریحان اُسے مناتا ”اوہو..... اب جانے بھی دو۔ وہ نئی اکاؤنٹنٹ ہے۔ کچھ رہنمائی کی ضرورت تھی اُسے۔ سو، میں نے بتا دیا، ورنہ تم تو جانتی ہو کہ.....“ فوراً وہ پلٹ کر آئینے پر قابض ہو جاتی اور غصّے سے کہتی ”ہاں ہاں..... تین چار ہزار کے عملے میں سے اسے اور کوئی نہیں ملا تھا، اپنی الجھن دور کرنے کے لیے۔ میں سب جانتی ہوں، ان عورتوں کے چلتر..... ٹھیک ہے اگر تمہیں اس کی اتنی ہی فکر ہے تو پھر جاؤ۔ اُس کی رہنمائی کرو۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟“ ریحان بے بس ہو جاتا ”اوہو..... تم پھر روٹھ گئیں۔ اچھا بابا..... پکا وعدہ..... آئندہ کسی سے، کوئی کام کی بات بھی نہیں کروں گا۔ چلو اب ناراضی ختم کر دو، ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔“ جواباً نیم رضامندی کا اظہار بھی مصنوعی غصّے سے کیا جاتا۔ ”خوب جانتی ہو میں یہ سب بہانے، تمہیں پتا ہے نا کہ میں تمہیں بھوکا سوتا نہیں دیکھ سکتی۔ تب ہی مجھے اتنا ستاتے ہو۔ اچھا چلو اب مُنہ نہ بسورو۔ اٹھ کر کھا لو۔“ ریحان خوش ہو کر مسکرا دیتا اور وقتی طور پر جھگڑا ختم ہو جاتا، لیکن پھر چند دن بعد ایسی کوئی بات ہو جاتی اور پھر رات گئے تک یہی تکرار چلتی رہتی۔ عام دنیا کے لیے ریحان اندھیرے کے خوف کا ایک عام مریض تھا اور اس کے کاروباری حلقے میں سب ہی اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے کہ ریحان صرف دن کے اجالے کا ساتھی ہے۔ ریحان نے کبھی دوستیاں یار رشتے پالے ہی نہیں تھے، جو اس کی پُرسکون زندگی میں کسی قسم کی ہلچل مچاتے۔ وہ ہمیشہ سے تنہائی پسند تھا اور تنہائی ہی اس کی سب سے بڑی رفیق تھی، لیکن پھر لیلیٰ نام کی ایک معصوم سی لڑکی اُس کے عملے میں حادثاتی طور پر شامل ہوئی اور ریحان کی زندگی اتھل پتھل سی ہونے لگی۔ لیلیٰ ریحان کی فرم کے سینئر ڈرافٹس مین کی بیٹی تھی، جو اپنے باپ کی علالت کی وجہ سے یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے باپ کا کام سنبھالنے کے لیے صرف دو ماہ کے عارضی معاہدے پر کمپنی میں رکھی گئی تھی، لیکن شاید یہی دو ماہ ریحان کے اندر وہ اچھوتا احساس جگانے کے لیے کافی تھے، جس سے وہ عمر بھر انجان رہا تھا۔ پہلے پہل تو خود ریحان کو بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں اس کومل سی لڑکی کے اپنے آفس میں آنے پر ایک ان جانی سی خوشی محسوس کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی رات کی رازداں اور اپنے اندر کی عورت سے بھی کوئی بات چھپانے کی کوشش کی۔ ریحان ویسے بھی اپنے اسٹاف سے بہت کم بات کرتا تھا اور خواتین تو اس کے دفتر سے سات دَر پرے ہی گزرا کرتی تھیں، لیکن لیلیٰ میں نہ جانے ایسی کون سی کشش تھی، جو ریحان کو اس کی جانب کھینچے لے جا رہی تھی۔ شاید اس کا عام لڑکیوں کی طرح ریحان کے اردگرد چکر نہ کاٹنا ہی ریحان کو بھا گیا تھا، لیکن اس کے اندر والی سے یہ راز بھلا کہاں چُھپ جاتا۔ اس رات پہلی بار ریحان کا آئینے میں بیٹھی اپنی اس ہم زاد سے جھگڑا ہوا۔ وہ اتنا بگڑی کہ اس نے کمرے کا سارا کانچ توڑ ڈالا۔ کوٹھی میں اپنے سرونٹ کوارٹرز میں پڑے نوکر حیرت اور خوف سے اپنے صاحب کے کمرے میں اس عجیب و غریب شور شرابے کی دور سے آتی آوازیں سُنتے رہے، کیوں کہ انہیں شام کے بعد صاحب کے کمرے کی طرف جانے کی نہ تو اجازت تھی اور نہ ہی وہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں پاؤں دھر سکتے تھے۔ صرف یعقوب ہی تھا، جو ایسے مواقع پر اندر جا کر کوئی پیغام دے سکتا تھا۔ عموماً نصف شب کے بعد کوٹھی سے گھنگھروؤں کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی، لیکن اس رات کچھ عجیب سا سناٹا طاری رہا۔ ریحان اپنی ہم زاد کے اپنے اندر جنم لینے کے بعد زندگی میں پہلی بار اُسی رات بُھوکا سویا تھا۔ اگلی صبح دفتر پہنچتے ہی شدید غصّے کے عالم میں اس نے انٹرکام پر لیلیٰ کو اپنے دفتر میں آنے کا کہا۔ لیلیٰ دفتر میں داخل ہوئی، تو اُس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ .....(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

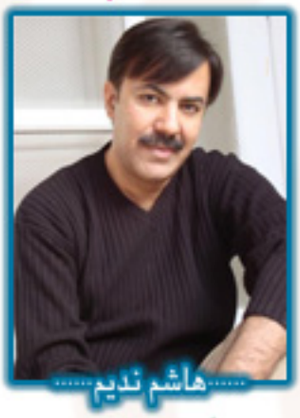

.....ہاشم ندیم.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

ریحان شدید اذیّت کے عالم میں جیسے خود اپنے آپ ہی سے لڑتے ہوئے نڈھال ہو کر اس طرح کرسی پر ڈھلکا ہوا تھا کہ اُس کا سر میز کے کونے پر اٹک گیا تھا۔ فوراً کمپنی کے ماہر ڈاکٹروں کی ٹیم کو طلب کیا گیا اور معالجِ خاص نے اسے شدید ذہنی تناؤ کا نتیجہ قرار دیا۔ ساتھ ہی اُسے سختی سے یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ وہ اگلے ایک ہفتے تک کسی دفتری کام یا فائل کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا، لیکن ریحان بھلا کب ماننے والا تھا۔ اسے اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور درحقیقت یہ کام ہی تو تھا، جو ریحان کے دن کے آٹھ دس گھنٹے گزارنے میں اس کی مدد کرتا تھا۔ مجبوراً ہیڈ آفس کے جنرل منیجر کو ریحان کا کام گھر ہی پر بھجوانے کا انتظام کرنا پڑا۔ جنرل منیجر ریحان کے باپ کے وفاداروں میں سے ایک تھا اور ریحان کو اس کی ماننی ہی پڑی۔ یہی وہ سات دن تھے، جب لیلیٰ ریحان کے حواس پر پوری طرح چھاتی گئی۔ ریحان کے اندر کا معصوم، سہما سا بچہ، جس نے اپنی ماں کو روتے ہوئے، خود سے دور جاتے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے کوئی اوٹ ڈھونڈ لی تھی۔ لیلیٰ کو دیکھتے ہی چھم سے باہر نکل آتا۔ زندگی میں پہلی بار ریحان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نظر آنے لگی اور اُس کا دل بھی چاہنے لگا کہ وہ اپنے اندر کی معصوم سی خواہشیں اور باتیں کسی سے بانٹے، لیکن یہ ساری خوشی اور سرشاری صرف سورج ڈھلنے سے پہلے تک ہی رہتی اور جب شام ڈھلے ریحان خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا، تو پھر وہی طوفان آ جاتا۔ وہی اس کی ہم زاد کے شکوے، طعنے اور جھگڑے۔ اب تو وہ ریحان کے منانے سے بھی نہیں مانتی تھی۔ اس کا بس ایک ہی تقاضا ہوتا کہ ریحان کسی بھی طرح لیلیٰ کو کمپنی سے باہر نکال پھینکے۔ ریحان اس کے سامنے عذر تراش تراش کر تھک جاتا، لیکن وہ روٹھی رہتی اور ریحان سے لڑتی رہتی کہ ریحان اب اُس سے اتنا پیار نہیں کرتا، جتنا لیلیٰ کے آنے سے پہلے کرتا تھا۔ اس کی ہم زاد کو لیلیٰ سے شدید نفرت ہونے لگی تھی اور پھر جب ریحان کو ڈاکٹروں نے گھر پر مکمل آرام کا مشورہ دیا اور لیلیٰ دفتر کے کچھ اہل کاروں کے ساتھ ضروری فائلوں پر دستخط کروانے کوٹھی بھی آنے لگی، تب تو سمجھو بھونچال ہی آ گیا۔ ہم زاد نے ریحان سے بات چیت بند کر دی اور پورے تین دن تک ریحان کی بھرپور منت سماجت کے باوجود بھی چپ سادھے بیٹھی آئینے سے ریحان کو تکتی رہی۔ ریحان کی حالت ان تین دنوں میں مزید بگڑ گئی، کیوں کہ وہ ساری ساری رات اُسے منانے کے لیے روتا رہتا۔ پھر جب ریحان نے اُس سے آخر کار یہ وعدہ کر لیا کہ وہ جلد ہی لیلیٰ کو خود سے دور کر دے گا، تب وہ ذرا مانی، لیکن تب تک لیلیٰ خود ریحان کی الجھی الجھی، خاموش اور کسی حد تک شرمیلی سی شخصیت کے آگے دل ہار بیٹھی تھی۔ وہ گھنٹوں اپنے شیشے کے کیبن کے بالکل سامنے راہ داری میں، دوسری جانب موجود ریحان کے آفس کے کانچ کی دیوار سے پرے اُسے مختلف کاموں میں الجھا ہوا دیکھتی رہتی۔ اُسے یہ کھویا کھویا سا، اپنے آپ سے باتیں کرتا اور نہایت شائستہ اور نفیس عادات و اطوار والا نوجوان کسی اور ہی دنیا کا فرد دکھائی دیتا۔ اسی قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت ریحان اپنے اندر چلتے اس شدید نفسیاتی ہیجان کا سامنا کرتے کرتے ٹوٹ کر بکھرنے کے بالکل قریب تھا، ٹھیک اُسی وقت لیلیٰ نے آ کر اُسے تھام لیا اور وہ ریحان، جو لیلیٰ کو نوکری سے فارغ کرنے کا لیٹر تیار کروائے بیٹھا تھا، اُسے اپنی زندگی کا ہم سفر بننے کا پیام دے بیٹھا۔ لیلیٰ کی تو جیسے کائنات ہی مکمل ہو گئی، لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے، لیلیٰ کی اُلجھنیں بڑھتی گئیں۔ کبھی کبھی اچانک ہی بیٹھے بٹھائے ریحان کا رویّہ بالکل ہی تبدیل ہو جاتا۔ کبھی کبھار جب وہ صبح اپنی سرخ انگارہ آنکھیں لیے دیر سے دفتر پہنچتا، تو بالکل ہی ہتھے سے اکھڑا ہوتا۔ ایسے میں اس کا برتاؤ لیلیٰ سے بالکل اجنبیوں والا ہو جاتا۔ اُس بے چاری کو کیا پتا کہ رات بھر اُس کا ہم نفس کس عذاب سے گزر کر صبح کی سیڑھی پھلانگ کر اس تک پہنچا ہے۔ لیلیٰ شروع میں تو اُسے کام کے بوجھ اور ریحان کی ازلی تنہائی پسندی کا شاخسانہ ہی سمجھتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ بات بننے کے بجائے بگڑتی چلی گئی۔ ان دونوں کی بحث، خاص طور پر اس وقت طول پکڑ لیتی، جب لیلیٰ ریحان کو شام ڈھلنے کے

بعد کہیں آؤٹنگ کے لیے لے جانے کی ضد کر بیٹھتی۔ اس کا اصرار کچھ بے جا بھی تو نہ ہوتا، کیوں کہ سارا دن تو ریحان دفتر کے کاموں اور میٹنگز ہی میں الجھا رہتا۔ بس، گھڑی دو گھڑی کے لیے دوپہر کے کھانے یا شام کی چائے پر ان دونوں کی ملاقات ہو پاتی۔ وہ بھی تمام دفتر کے عملے کے سامنے۔ اب بھلا ایسے موقع پر کوئی دل کی بات کیسے کی جا سکتی تھی، حالاں کہ تمام عملے کو بھی ریحان اور لیلیٰ کے مستقبل میں ہونے والے رشتے کے بارے میں خبر تھی اور درحقیقت سب ہی اس بات سے خوش بھی تھے، کیوں کہ ریحان نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے تمام عملے کی ہر ضرورت کا خیال رکھا تھا، لیکن پھر بھی لیلیٰ کو ریحان سے کچھ ایسے لمحوں کی ہمیشہ ہی تمنا رہی، جب صرف وہ اور ریحان ہوں اور وہ دل کی ہر بات بنا کسی جھجک کے کہہ سکے، لیکن شام ہوتے ہی ریحان کے اندر جیسے تمام جہان کی بے چینیاں سی بھر جاتی تھیں۔ عصر کے بعد تو وہ اپنے کئی کام ادھورے چھوڑ کر ہی گھر واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتا۔ ایسے میں یعقوب بھی ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا اور آج تک کبھی کسی نے اسے لیٹ ہوتے یا ناغہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ لیلیٰ انٹرکام پر یا میٹنگ کے دوران مختلف کاغذوں پر لکھ لکھ کر تھک جاتی، مگر ریحان کا دل کبھی نہ پسیجتا۔ لیلیٰ کو بھی ریحان کے بچپن کے خوف کی کچھ خبر پہنچ چکی تھی اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ وہ ریحان کی اس خوف کے جال سے نکلنے میں مدد کرے، مگر شام کا ریحان اس کے لیے بالکل اجنبی ہوتا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے جب ریحان کو زبردستی روکنے کی کوشش کی بھی، تو ریحان نے اُسے بری طرح جھڑک دیا۔ پھر بھی لیلیٰ کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ امید ضرور دیا جلائے رکھتی تھی کہ وہ شادی کے بعد ریحان کے دل میں چھپا ہر خوف اپنی محبت سے مٹا دے گی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریحان شام کے بعد بہت ضروری فون بھی اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ ایک بار لیلیٰ اندھیرا ہونے کے بعد ریحان کی کوٹھی کے گیٹ تک بھی جا پہنچی، مگر اس کے لاکھ سر پٹخنے پر بھی دربان نے اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ الٹا اگلی صبح ریحان لیلیٰ پر بری طرح برس پڑا کہ وہ اس کے انتہائی منع کرنے کے باوجود شام ڈھلنے کے بعد اس کی چوکھٹ پر کیوں آئی۔ لیلیٰ اپنے آنسو روک نہیں پائی اور بھاگتی ہوئی اپنے کیبن میں واپس چلی گئی۔

دو تین روز تک دونوں میں بات چیت بند رہی اور ان تین راتوں میں ریحان کی ہم زاد نے جی بھر کے ریحان کے لاڈ اٹھائے۔ اسے اس کی پسندیدہ شاعری سنائی۔ رقص کر کے اس کا دل بہلایا اور اس سے بہت سے گلے شکوے بھی کیے کہ وہ بچپن سے ریحان کی ہم زاد اور ہم نفس رہی ہے اور ہر مشکل اور کرب میں اس نے ریحان کا ساتھ دیا، لیکن جب اُسے ریحان کی ضرورت پڑی، تو ریحان اس سے منہ موڑ کر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اس نے ریحان سے وعدہ لیا کہ وہ پہلی فرصت میں لیلیٰ کے رشتے سے چھٹکارا پا کر دوبارہ اپنی ساتھی کے پاس آ جائے گا، لیکن ریحان تین دن تک ہی یہ وعدہ نبھا پایا اور چوتھے دن جب خود لیلیٰ نے اس کے سامنے آ کر ہاتھ جوڑ دیے، تو دونوں ہی مسکرا دیے۔ اس رات پہلی مرتبہ ریحان کی ہم زاد نے اس سے ضد کی کہ وہ بھی ریحان کی پسند سے ملنا چاہتی ہے، لہٰذا ریحان اسے رات کو کہیں مدعو کرے۔ ریحان نے سختی سے انکار کر دیا کہ جب تک شادی نہ ہو جائے، یہ راز راز ہی رہنا چاہیے، لیکن ہم زاد کی تکرار بھی طول پکڑتی گئی۔ ہم زاد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کا راج صرف سورج نکلنے تک ہی قائم رہتا تھا اور اجالا ہوتے ہی اسے ریحان کی روح کو آزاد کرنا پڑتا تھا۔ پھر سورج نکلنے سے لے کر سورج ڈھلنے تک ریحان کے دل و دماغ پر صرف لیلیٰ ہی کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس لیے ہم زاد دن میں بھی ریحان کے اعصاب تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنے لگی۔ پھر لیلیٰ خود بھی ریحان کی نفسیاتی پیچیدگیاں دور کرنے کی آس میں گاہے بگاہے اُسے شام ڈھلنے کے بعد ملنے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ رات کو ہم زاد اسے بڑھاوا دیتی ”اگر وہ تم سے رات کو ملنا چاہتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم مجھے بھی اس سے جلد از جلد ملوا دو۔ آخر شادی کی پہلی رات بھی تو مجھے ہی اس کا استقبال کرنا ہے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ میں پہلے ہی اس سے دوستی کر لوں۔ کہیں پہلی رات وہ مجھے تمہارے کمرے میں دیکھ کر بالکل ہی نہ گھبرا جائے اور تمہارا راز سب کے سامنے فاش نہ کر دے۔“ کبھی کبھی تو ریحان ان دونوں کی ضد اور تکرار کے سامنے بالکل ہی لاجواب ہو جاتا اور اسے لگتا کہ اس کے اندر پلتی وہ عورت، اس کی ہم زاد ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ لیلیٰ کو اس راز سے پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہیے کہ یہ اس کا حق بھی تو تھا۔ آخر دل اور دماغ کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح جیت دلِ نادان ہی کی ہوئی اور ریحان نے پہلی اور آخری مرتبہ لیلیٰ سے شام کے بعد ملنے کی ہامی بھر لی۔ اس روز لیلیٰ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ آسمان کے خیمے کی، زمین سے بندھی گرہیں کھول کر پورا آسمان اوڑھنی کی جگہ اپنے سر پر اوڑھ لے۔ سارا دن وہ ہواؤں میں اڑتی رہی۔ بات بے بات خود ہی مسکاتی رہی۔ شام کو اس نے ریحان کی پسندیدہ سفید ساڑی پہنی، بالوں میں گجرا لگایا اور اپنی کالی آنکھوں میں محبوب کی دید کی آس لیے، ساحل کی اس پٹی کی طرف اُسی گاڑی میں خود ہی ڈرائیو کرتی ہوئی چل دی، جس کی پہاڑی کے ٹیلے پر آج مغرب کے بعد ریحان نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ریحان کے ساتھ دن میں پہلے بھی کئی مرتبہ ڈرائیو پر اس جگہ آ چکی تھی۔ اسے وہاں پتنگ اڑانا بہت پسند تھا اور آج بھی وہ اپنے ساتھ بہت سی پتنگیں لے کر جا رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ آج وہ رات دیر تک ریحان کے ساتھ مل کر پتنگیں اڑائے گی اور اسے اتنا اونچا کر دے گی کہ اس کی پتنگ اس کے اور ریحان کے ملن کے ستارے چھو کر لوٹے گی۔ جب تک لیلیٰ پہاڑی ٹیلے پر پہنچی، تب تک شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے وقت کا جھٹ پٹا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ ریحان ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ لیلیٰ اپنی گاڑی سے نکل کر پہاڑی کے سرے تک چلی گئی اور وہاں کھڑے کھڑے اس نے دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں، وہ خوش ہو گئی کہ ریحان آ رہا ہے، لیکن جب گاڑی کچھ قریب پہنچی، تو وہ مایوس ہو گئی۔ یہ تو کوئی چھوٹی گاڑی تھی، لیکن وہ گاڑی تو اسی طرف آ رہی تھی۔ لیلیٰ کچھ دیر گاڑی کو پہاڑی پر چڑھتے دیکھتی رہی، پھر اس کی توجہ دوبارہ سمندر کی طرف ہو گئی، جو آج نہ جانے اتنا بپھرا ہوا کیوں لگ رہا تھا۔ گاڑی نہ جانے کب لیلیٰ کی گاڑی کے پیچھے آ کر پارک ہو گئی اور لیلیٰ تب چونکی، جب دھیرے سے کسی نے اس کا نام لیا۔ وہ آواز کتنی اپنی اور کتنی اجنبی بھی تھی۔ لیلیٰ نے اندھیرے میں کسی لمبی عورت کو پلو نکالے کچھ دور کھڑے دیکھا۔ چہرہ واضح نہیں تھا۔ لیلیٰ کچھ ڈر سی گئی۔ ”جی..... آپ کون.....؟“ اور پھر وہ عورت قریب آ گئی۔ لیلیٰ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ اس کے سامنے ریحان اپنے آدھے چہرے پر میک اپ کیے، آدھی عورت کے روپ میں کھڑا تھا۔ لیلیٰ سہم کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں ریحان سے پوچھا کہ یہ کیسا بے ہودہ مذاق ہے اور ریحان نے اتنا بھیانک حلیہ کیوں بنا رکھا ہے۔ بائیں جانب والے آدھے سادے چہرے والا ریحان رُخ موڑ کر بولا کہ لیلیٰ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج وہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی سے ملوانا

چاہتا ہے۔ اس کے اندر پلتی آدھی عورت اور آدھا مرد..... یہی اس کی تقسیم شدہ شخصیت کی حقیقت ہے اور اگر وہ ریحان کو اس کے اندر کی عورت سمیت اپنانے کا حوصلہ رکھتی ہے، تب ہی اس نازک بندھن کی گرہ باندھنے کی سوچے، کیوں کہ ریحان کی دُہری شخصیت اس اندھیرے میں پلنے والے وجود کے بنا ادھوری ہے۔ لیلیٰ تب تک پہلے صدمے سے کچھ سنبھل چکی تھی اور اسے کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اس نے چلّا کر ریحان سے کہا، یہ سب اس کا وہم ہے اور خود اس کی اپنی خود ساختہ پرچھائیں ہے۔ ایسی کسی عورت کا کوئی وجود نہیں ہے اور ریحان نے اپنی ساری زندگی ایک سائے کے ساتھ برباد کر دی ہے، لیکن اب بھی وقت ہے، اگر وہ لیلیٰ کا ساتھ دے تو وہ دونوں مل کر اس عفریت کی پرچھائیں پر قابو پا سکتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی چہرے کے دائیں جانب والی بگڑ گئی اور غرّا کر بولی کہ ''وہ بہت دیر سے لیلیٰ کی یہ بکواس برداشت کر رہی ہے، لیکن اب اگر اس نے، اُس کے ریحان کو چھیننے کی کوشش کی تو انجام بہت برا ہوگا، کیوں کہ اُسے پہلے دن ہی سے لیلیٰ سے شدید نفرت ہے، لہٰذا لیلیٰ کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ چپ چاپ یہاں سے چلی جائے اور دوبارہ کبھی پلٹ کر اس طرف کا رُخ نہ کرے۔'' لیلیٰ ریحان کو ایک بدلی ہوئی آواز میں چلّاتے دیکھ کر ایک بار پھر لرز گئی۔ اس نے ریحان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ سارا کھیل صرف اور صرف قوتِ ارادی کا ہے اور اگر آج ریحان نے اپنے اندر کی طاقت سے اس عورت کو اپنے وجود سے باہر نہ نکال پھینکا تو شاید پھر ساری زندگی وہ اس کے چُنگل سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ ریحان، لیلیٰ کی منت سماجت کر کے اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا، جب کہ اس کے اندر کی ہم زاد لیلیٰ کو دھتکار رہی تھی، اس پر چلّا رہی تھی اور اُسے ریحان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا حکم دے رہی تھی۔ لیلیٰ کبھی ریحان کے آگے روتی اور کبھی اس کی ہم زاد سے لڑتی۔ اسی کش مکش میں نہ جانے کب اور کیسے لیلیٰ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑی کی نوک تک جا پہنچی۔ اس کی سوت نے اسے تھپڑ مارا اور دھکا دیا۔ ریحان والی بائیں طرف نے لپک کر لیلیٰ کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، لیکن تب تک لیلیٰ کا توازن بگڑ چکا تھا۔ فضا میں ایک زوردار چیخ گونجی اور چند لمحوں کے لیے لیلیٰ کی سفید ساڑی کا پلّو گہرائی کے خلا میں لہرایا اور پھر ایک زوردار ''دھپ'' کی آواز کے ساتھ سناٹا چھا گیا۔ نیچے ساحل پر موجود ایک آدھ آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، جیسے وہ گرنے والے کی طرف لپکا ہو۔ ریحان تڑپ کر لیلیٰ کے پیچھے جانے کے لیے گہرائی کی طرف دوڑا، لیکن ہم زاد نے اُسے زبردستی روکا اور جھاڑا کہ نیچے کسی شخص کا ہیولا نظر آ رہا ہے، شاید کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا، جب میں ہذیان کے عالم میں حجرے سے نکل کر ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔ مجھے اس طرف آتے دیکھ کر وہ زبردستی ریحان کو وہاں سے لے گئی۔

اگلی صبح ریحان کو پتا چلا کہ لیلیٰ کے قتل کے الزام میں عبداللہ نامی ایک نوجوان گرفتار ہو چکا ہے۔ ریحان کا دماغ اس وقت لیلیٰ کی موت کی وجہ سے سُن ہو چکا تھا اور اس کی ساری مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ اس وقت اس کی تمام ڈوریں اُسی ہم زاد کے ہاتھ میں تھیں، جو اسے یہ کہہ کر ڈراتی رہی کہ اگر ریحان نے پولیس کو حقیقت بتا دی، تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی آدھی شخصیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیلیٰ تو پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی تھی۔ پھر ایک شام وہی عبداللہ نامی نوجوان اس کے دروازے پر یہ پیغام لے کر آیا کہ اس نے لیلیٰ کی آخری سرگوشی سُنی ہے۔ ریحان اس وقت اس سے ملاقات تو نہیں کر پایا، لیکن اس رات اپنی ہم زاد سے اس کی شدید تلخ کلامی ہوئی اور ریحان نے اس پر لیلیٰ کی قاتل ہونے کا الزام لگایا اور یہ بھی کہا کہ لیلیٰ اونچائی سے گرنے کے بعد بھی زندہ تھی، تب ہی اس نے مسجد کے اس طالب کو پیغام دیا۔ اگر ریحان موقع پر نیچے پہنچ جاتا تو شاید وہ لیلیٰ کی جان بچا لیتا۔ پھر ہم زاد کے منع کرنے کے باوجود ریحان نے صبح سویرے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر عبداللہ کو اپنی کوٹھی بلوا لیا اور عبداللہ نے جب اسے یہ بتایا کہ لیلیٰ نے اپنی سانسیں رُکنے سے پہلے اس عورت کو معاف کرنے کا پیغام دیا تھا، تو خود ریحان کو اپنی سانسیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس روز شام سے پہلے وہ یہ تہیّہ کر چکا تھا کہ وہ اگلے روز پولیس کو جا کر اپنا بیان ریکارڈ کروا دے گا، لیکن شام ہوتے ہی اس کی روح کی قابض نے حکم دیا کہ چل کر اس عینی گواہ کو دھمکایا جائے۔ ریحان کی ہم زاد کو عبداللہ نامی نوجوان کا کوٹھی آنا اور یوں ریحان کے دل میں دبی چنگاری کو ہوا دے کر لیلیٰ کی یادیں ابھارنا بھی بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ اس رات ساحلی چوٹی پر اس کے پیچھے آئی تھی۔ ریحان ابھی تک صبح سے گالف کے لباس ہی میں تھا اور اس کا اپنا من بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ساحل پر جائے، کیوں کہ وہاں اسے لیلیٰ کی یاد ستاتی تھی۔ اسی کش مکش میں وہ چلا تو آیا، لیکن اپنے سفید کرچ کے جوتے تبدیل کرنا بھول گیا یا شاید یہ اُس کے آدھے مردانہ حصے کا انوکھا احتجاج تھا۔ بہرحال، یہی جوتے اس کی گرفتاری کا سبب بن گئے، لیکن پولیس ابھی تک مخمصے میں تھی کہ وہ ریحان ہی کو پکڑ لائے ہیں یا کسی اجنبی کو.....

ماہرِ نفسیات نے ریحان کی کہانی ختم کر کے چند لمحے کی خاموشی اختیار کر لی۔ ہم سب اس وقت رحمٰن صاحب کے کمرے میں موجود تھے، جہاں گزشتہ پانچ گھنٹوں سے یہ بریفنگ چل رہی تھی۔ کمرے میں گمبھیر سناٹا طاری تھا۔ پولیس کی تاریخ میں یہ ایک ایسا انوکھا کیس تھا، جس نے اُن سب کے دماغوں کی چولیں ہلا دی تھیں۔ ریحان کو اس وقت پولیس کے پہرے میں اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جا چکا تھا، جہاں اس کی حالت شام کے بعد انتہائی ابتر بتائی جاتی تھی۔ ملک کے بڑے اور مشہور نفسیات دان اور معالج اس بحث میں پڑے ہوئے تھے کہ کیا یہ تقسیم شدہ شخصیت (siplit personality) کا کیس ہے یا پھر دُہری شخصیت کا تضاد (multiple personality disorder) ہے۔ سچ ہے کہ انسانی نفسیات ایک ایسا گھنا جنگل ہے، جس میں اگر ریحان جیسے کسی شخص کا معصوم بچپن کھو جائے، تو پھر وہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ انسان بھی کس قدر پیچیدہ مخلوق ہے۔ انسانی ذہن کی بھول بھلیوں کا پہلا ادراک مجھے وہیں پہلی بار ہوا اور مجھے خود اپنے آپ سے بھی شدید خوف محسوس ہونے لگا، کیوں کہ میں بھی تو جانے انجانے میں اسی نفسیاتی اور اعصابی نظام کے خاتمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری رگوں میں پھیلتے زہر کا انجام بھی تو آخر کار ایک مکمل دیوانگی ہی بیان کیا جا رہا تھا۔

بریفنگ ختم ہونے کے بعد جب معالجین رحمٰن صاحب کے کمرے سے نکل گئے، تو میں نے بھی ان سے رخصت چاہی، تو انہوں نے مجھے کچھ دیر رُکنے کا کہا۔ پھر سگریٹ سلگا کر بولے، ''تم کون ہو.....؟'' میں ان کا سوال سُن کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔ ''میں عبداللہ ہوں..... آپ جانتے ہیں.....''، ''نہیں..... میں وہ جاننا چاہتا ہوں، جواب تک نہیں جانتا۔ بہت سے سوال ہیں میرے ذہن میں، مگر میں اُنہیں ترتیب نہیں دے پا رہا..... لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ تم کچھ اور ہو..... اوروں سے کچھ ہوا..... کچھ الگ'' میں نے بات ٹالی ''آپ کا واہمہ ہے۔ میں باقی سب ہی کی طرح ہوں، بلکہ شاید ان سے بہت کم..... بہت عام.....'' لیکن انہوں نے جیسے میری بات سُنی ہی نہیں ''ساری تفتیشی ٹیم اس پُراسرار عورت کی کھوج میں تو تھی، لیکن ہم میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ریحان ہی کی دوسری شبیہہ ہوگی۔ میں نہیں مان سکتا کہ یہ صرف تمہارے وجدان کی کاری گری تھی کہ تم نے ریحان سے شام کے بعد ملنے کی خواہش ظاہر کی اور پھر دھاگے سے دھاگا جڑتا گیا اور سبھی کڑیاں آپس میں یوں ملتی گئیں کہ آج لیلیٰ کا پورا کیس ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ اب تم ہی کہو، میں اسے کیا کہوں.....؟'' میں کچھ دیر چُپ رہا ''آپ اسے وجدان کہہ لیں یا الہام..... سچ یہی ہے کہ میں صرف ریحان کے اندھیرے سے خوف کی کہانی سُن کر ہی اس کے گھر گیا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے پہلے دن ہی سے اس عورت کی شبیہہ میں کچھ ایسا اسرار جھلکتا نظر آیا کہ مجھے اس کا تعلق لیلیٰ کی موت سے جُڑتا محسوس ہوا۔ میں خود بھی یہ بات تب ہی جان پایا کہ ریحان ہی وہ عورت ہے، جب میں نے اس کے جوتے کا سول ساحل پر پایا۔ شاید قدرت کچھ راستے خاص میرے لیے ہی کھولتی گئی اور آپ کا کیس حل ہوتا گیا۔'' اتنے میں میز پر پڑے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ رحمٰن صاحب نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے کسی نے کچھ کہا۔ رحمٰن صاحب نے جلدی سے کہا ''ٹھیک ہے..... ہم ابھی وہاں پہنچتے ہیں۔'' انہوں نے فون رکھ کر میری جانب دیکھا، ''ریحان اپنے حواس میں آ چکا ہے اور وہ تم سے ابھی ملنا چاہتا ہے۔''

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہم شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سامنے کچھ بھیڑ تھی اور راستہ بند تھا۔ پتا چلا کہ کوئی مریض دم توڑ گیا ہے اور اس کی میت لے جائی جا رہی ہے۔ قریبی عزیز، چند رفقاء اور آس پاس کے چند راہ گیر کاندھا دینے کے لیے جلدی سے آگے بڑھے۔ مجھے یوں لگا، جیسے انسان اپنی پوری زندگی میں بس اتنا ہی کماتا ہے، جتنے لوگ اس کے جنازے کو کاندھا دینے اور اس کے آخری سفر میں چار قدم ساتھ چلنے کے لیے موجود ہوتے ہیں، باقی سب ضائع جاتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا نفع خود ''انسان'' ہی ہوتا ہے اور یہی وہ سب سے قیمتی سرمایہ ہے، جسے وہ اپنی زندگی کے دوران مختلف ادوار میں نقصان کی صورت میں کھو دیتا ہے۔ کیسے کیسے بیش قیمت لوگ ہمارے ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔ یہ بے رحم ''وقت'' کیسے ڈاکہ مار جاتا ہے کہ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی اور کوئی ہمارے درمیان سے ہمیشہ کے لیے اٹھ کر چل دیتا ہے اور اس کے بعد صرف یادیں، پچھتاوے اور افسوس باقی رہ جاتا ہے۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ رحمٰن صاحب کی جیپ نے ایک لمبا سا موڑ کاٹا اور ہم اسپتال کی مرکزی راہ داری کے بالکل سامنے والے پورچ میں پہنچ گئے۔ رحمٰن صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''جاؤ..... جا کر اس سے مل لو.....''، ''آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ.....؟''، ''نہیں..... اس وقت وہ صرف تم سے ملنا چاہتا ہے۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر بات نہیں کر پائے گا۔'' میں سامنے کھڑے مستعد اور چاق و چوبند سپاہی کے ساتھ مختلف راہ داریوں سے ہوتا ہوا نفسیاتی اور اعصابی مریضوں کے لیے مخصوص کمروں تک جا پہنچا۔ سپاہی نے 13 نمبر کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس کے باہر پہلے ہی دو پولیس کے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، تو کمرا بالکل یخ بستہ ہو رہا تھا۔ شاید کمرے کے مرکزی ٹھنڈا کرنے کے نظام کو اس کے آخری درجے پر رکھا گیا تھا۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف پلاسٹک کی دو کرسیاں پڑی تھیں اور اسے کمرے سے زیادہ بیرک کہنا مناسب ہوتا، کیوں کہ چوکور کے بجائے مستطیل ساخت کی دیواریں دور تک بڑھ گئی تھیں۔ فرش پر بے داغ سفید ٹائلز لگے ہوئے تھے اور ریحان سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کا انتظام کچھ اس طرح تھا کہ آنکھوں کو مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا تھا۔ آہٹ سن کر ریحان نے سر اٹھایا، لیکن یہ..... یہ تو وہ ریحان نہیں تھا، جسے میں جانتا تھا، وہ ریحان تو بے حد سجا سنورا، نہایت نفیس اور نازک سا تھا، جبکہ میرے سامنے بیٹھا شخص آنکھوں کے گرد گہرے کالے حلقے لیے، چہرے پر برسوں کی تھکن، بال الجھے ہوئے اور کئی دن کی بڑھی شیو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے کبھی پہلے والے ریحان کے چہرے یا لباس پر شکن نہیں دیکھی تھی، لیکن اس ریحان کے لباس اور چہرے پر اتنی زیادہ شکنیں تھیں کہ یوں لگتا تھا، جیسے زندگی نے عمر بھر کی ''بے شکنی'' کا حساب لے لیا ہو۔ کچھ دیر کے لیے میں اس کی یہ حالت دیکھ کر دروازے ہی پر جما رہ گیا۔ پھر ریحان ہی نے ابتداء کی ''تم آ گئے عبداللہ..... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا.....'' میں اس کی جانب بڑھا ''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے..... وہ تمہیں اگر اس طرح دیکھتی تو اسے کتنا دکھ ہوتا.....'' ریحان نے ایک گہری سی سانس لی ''جب سارے شہر کے آئینے ہی ٹوٹ جائیں، تو پھر بننے سنورنے سے کیا فائدہ.....؟ میں نے تم سے معافی مانگنے کے لیے آج تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں دانستہ کبھی کسی کو ذرّہ برابر بھی تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن میری وجہ سے تمہیں بے حد اذیت اٹھانی پڑی۔ تمہیں ہتھکڑیاں لگائی گئیں، شدید بیماری کے عالم میں تمہیں اس تندور نما حوالات میں راتیں کاٹنی پڑیں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔ میں یہ سب نہیں چاہتا تھا، لیکن یقین جانو میں بے اختیار تھا۔'' میں نے ریحان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''معذرت غیروں کے درمیان ہوتی ہے اور پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ میرا نصیب تھا، لیکن اگر معافی ہی کسی اذیت کا مداوا ہے، تو تم مجھے معاف کر دو، کیوں کہ تمہاری گرفتاری میرے وجدان کا شاخسانہ ہے اور میں خود کہیں نہ کہیں اپنے آپ کو بھی مجرم گردانتا ہوں۔'' ریحان تڑپ سا گیا۔ ''نہیں..... بالکل نہیں..... جسے تم گرفتاری کہتے ہو، اصل میں یہ میری پہلی رہائی ہے۔ میری ٹوٹی پھوٹی اور اندر سے کئی حصوں میں تقسیم شخصیت کے اتنے ریزے ہو چکے ہیں کہ اب ان کی کرچیاں چننا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری روح کی قابض نے میرا سب کچھ لوٹ لیا اور اس کا واحد علاج اسے پابند سلاسل کرنا ہی تھا۔ وہ ابھی تک میرے وجود پر اپنے پنجے گاڑے ہوئے

ہے اور میری راتوں کا اندھیرا اب بھی اتنا ہی خوف ناک ہے۔ کاش تم میری زندگی میں لیلیٰ ۶ کی موت سے قبل آئے ہوتے، تو شاید میری ساری جمع پونجی نہ لٹتی۔ کاش.....'' بولتے بولتے ریحان کی آواز بھرّا گئی اور شدید ضبط کے باوجود اس کی معصوم آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ آنسو کیا تھے، تیزاب کی دو بوندیں تھیں، جو میرے دل کی پوری کائنات کو پل بھر میں جلا کر خاکستر کر گئیں۔ ہم انسان کتنے بے بس، کتنے معذور ہوتے ہیں کہ صرف زبانی ہم دردی کے علاوہ کسی اپنے کا غم تک اپنے اندر اتار کر اس کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سامنے بیٹھ کر رونے والا ریحان نہیں، کوئی سات آٹھ سالہ بچہ ہے، جس کا سب سے پیارا کھلونا، کوئی اسی کے سامنے توڑ کر چلا گیا اور وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ میں نے ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میری ایک بات مانو گے ریحان.....؟'' معصوم سے بھولے بچے نے سر اٹھا کر گردن ہلائی۔ میں نے اس کے ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیے۔ ''جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو تنہائی میں خوب زور زور سے چیخ چیخ کر رونا..... اتنا رونا کہ یہ فلک پھٹ جائے اور اس آسمان سے پرے کی گلابی دھند میں تمہیں تمہاری لیلیٰ کا چہرہ دکھائی دینے لگے۔ مجھے یقین ہے، تمہارے آنسو اس دھند کو چیر کر اس تک ضرور پہنچیں گے۔ پھر اس سے جی بھر کر باتیں کرنا۔ مجھے یقین ہے، وہ اب بھی مسکرا تم سے بات کرے گی۔'' ریحان نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے بہتا پانی مسلسل میری ہتھیلیوں کی پشت کو بھگو رہا تھا۔ زمانے کے لیے وہ ایک قاتل تھا، لیکن کیا کبھی کسی نے اتنا معصوم قاتل بھی دیکھا ہوگا۔ مجھے کچھ یاد آیا۔ ''اور ہاں..... مجھے تم سے اپنے ایک اور جھوٹ کی معافی بھی مانگنی ہے۔ میں نے تمہیں لیلیٰ کے آخری جملے کے بارے میں جو بات کہی تھی۔ وہ صرف اس پر اسرار عورت کا کھوج لگانے کے لیے میری ذہنی اختراع تھی، پتا نہیں کیوں اور کب میرے ذہن میں وہ بات آئی اور میں نے کہہ دی۔ مجھے اپنے اس جھوٹ پر بے حد شرمندگی ہے۔'' ریحان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''لیکن تم نے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے خود اس رات نیچے جھانک کر دیکھا تھا، تم لیلیٰ کے گرتے ہی چند لمحوں بعد اس کے قریب پہنچ گئے تھے اور ٹھیک اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے، ضرور لیلیٰ نے تم سے کچھ بات کی ہوگی، مگر تم اپنی دگرگوں ذہنی حالت کی وجہ سے یاد نہیں رکھ پائے۔'' اب حیران ہونے کی باری میری تھی، میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ تو گویا میری زبان سے جو لفظ ادا ہوئے تھے، وہ میرے ذہن میں ٹھیک اسی وقت نہیں آئے تھے، جب میں ریحان سے اس کے گھر گالف کورس میں ملا تھا۔ لیلیٰ کی زبان سے ادا ہوئے وہ لفظ میرے سوئے ہوئے ذہن کی کسی دراز میں بند رہ گئے تھے اور صبح جب مجھے پولیس نے ساحل سے گرفتار کیا، تو میرے جنوں کا وہ دور حسبِ معمول میری یاد سے محو ہو گیا، لیکن جب ریحان میرے سامنے آیا، تو یاد کی کھڑکی سے لیلیٰ کا وہ جملہ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور میری زبان سے ادا ہو گیا۔ مجھے انسانی ذہن کی بھول بھلیوں اور اس کے کرشموں سے ایک بار پھر خوف محسوس ہونے لگا۔ جانے کتنے شعبدے، جانے کتنے عفریت اس چھٹانک بھر کے ذہن میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس ذہن کی موجودگی میں شاید ہر انسان ایک چلتا پھرتا آتش فشاں ہی تو ہوتا ہے، جو کسی بھی وقت دھماکے سے پھٹ سکتا ہے۔ ریحان کی اس حالت کا ذمے دار بھی تو صرف اور صرف یہ ذہن ہی تھا۔

میں بہت دیر تک ریحان کے آنسو پونچھتا رہا۔ کاش اس کے اندر بیٹھی وہ قابض قاتلہ میری رسائی میں ہوتی، تو میں اسے تصرف کے لیے اپنا ناکارہ وجود پیش کر دیتا کہ یہ جسم بوسیدہ تو اب خود دیوانگی کی راہ پر گام زن تھا۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ فی الحال نفسیات دانوں اور ڈاکٹروں نے اس کی ہم زاد سے اس کی جان چھڑانے کے لیے نیند کو بطور ڈھال استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور سرِ شام ہی اندھیرا ہونے سے قبل ریحان کے جسم میں ایک خاص مقدار میں نیند کی دوا تحلیل کر دی جاتی ہے اور مغرب سے لے کر صبح دیر گئے تک ریحان سویا رہتا ہے، لیکن بقول ریحان، اسے ڈر تھا کہ یہ ترکیب زیادہ عرصہ چل نہیں پائے گی، کیوں کہ وہ بہت پہلے خود بھی یہ نسخہ آزما چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اسے نیند آ جاتی تھی، لیکن پھر رفتہ رفتہ بے چینی شروع ہونے لگی اور چند دن بعد تو وہ اس کے خوابوں پر بھی قابض ہوتی گئی، نتیجتاً ریحان کو دورے پڑنے لگے اور اسے نیند کی دوا ترک کر دینی پڑی اور پھر میں اس وقت اپنا ضبط کھو ہی بیٹھا، جب ریحان نے مجھ سے یہ پوچھا کہ ''کیا میں بھی اسے ایک قاتل سمجھتا ہوں اور کیا میں کبھی ریحان کے لیے دعا کروں گا.....؟'' میں جواب دیتے ہوئے رو پڑا کہ میری اور میری دعاؤں کی کیا اوقات ہے۔ ہاں البتہ اگر اوپر والے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اور گڑگڑا کر مانگنے ہی کو دعا کہا جاتا ہے، تو میں یہ مشق ریحان کی گرفتاری سے بھی پہلے سے کر رہا ہوں۔ کہ ''یا مالک..... اس انسان کو صبر دے، سکون دے اور ہمت عطا کر.....'' میں بہت دیر سے ریحان کے ساتھ بیٹھا تھا اور مجھے باہر کے گزرتے وقت کی اطلاع صرف روشن دان سے چھنی دھوپ کے مختلف زاویوں ہی سے مل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے شام قریب آ رہی تھی۔ میں نے نماز بھی ریحان کے کمرے ہی میں ایک صاف چادر بچھا کر ادا کی اور ریحان سے بھی کہا کہ وہ نماز کی پابندی کی کوشش کیا کرے۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ بچپن میں یعقوب ڈرائیور کے ساتھ وہ ہمیشہ جمعے اور عید کی نماز کے لیے ضرور جاتا تھا۔ یعقوب کی بیوی، جو ریحان کی روحانی ماں کے برابر تھی، اس نے اسے نماز اور سورتیں یاد کروائی تھیں، لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ سب بھولتا گیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ چاہے وہ مذہب کو بھلا بیٹھا ہو، لیکن مذہب اسے کبھی نہیں بھولے گا اور جس دن ریحان باوضو ہو کر جائے نماز پر کھڑا ہوگا، اسے خود بخود سب یاد آ جائے گا۔ خود میرے ساتھ بھی تو یہی ہو چکا تھا۔ مذہب ہمارے اندر آتی جاتی سانس کی طرح زندہ رہتا ہے۔ جب ہم سانس لینا نہیں بھولتے اور کوئی ہمیں سانس لینا سکھاتا بھی نہیں، تو پھر مذہب ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔ بس، کچھ طریقۂ کار سیکھنے کے لیے کبھی کسی رہبر اور کبھی ماحول کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

عصر کے فوراً بعد ریحان کی دوا کا وقت ہونے لگا اور میرے جانے کی خبر سن کر نہ جانے وہ کیوں ایک دم ہی بہت بے چین سا ہو گیا۔ شاید میں اس کی عمر بھر میں اس کا واحد دوست تھا، جس کے ساتھ اس نے صبح سے شام تک کا وقت گزارا اور اپنے دل کی اتنی بہت سی انمول باتیں بانٹی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر عجیب سے درد بھرے لہجے میں التجا کی ''پھر آؤ گے نا عبداللہ.....؟'' ''ہاں..... ضرور..... کیوں نہیں..... اور اس دن ہم صرف تمہاری اور لیلیٰ کی بات کریں گے۔ پتنگوں کی باتیں، دھانی آسمان اور نیلی ڈور کی باتیں..... جھاگ اڑاتے سمندر اور دودھیا بادلوں کی باتیں..... ٹھیک ہے نا.....؟'' وہ بہت

خوش ہو کر بولا ''ہاں..... بالکل ٹھیک ہے..... لیکن پکا..... تم آؤ گے ناں.....'' ''ہاں بالکل پکا.....'' میں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور ہیڈ نرس نے ریحان کے بازو میں نیند کی دوا انجیکٹ کر دی۔ میں ریحان کی پلکیں بوجھل ہونے تک وہیں اس کے سرہانے بیٹھا رہا۔ نیند کی سرمئی پری نے دھیرے دھیرے اپنے پنکھ اس کے بوجھل پپوٹوں پر پھیرنا شروع کر دیے۔ ریحان کی پلکیں بھاری ہونے لگیں، لیکن سوتے سوتے بھی آج اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور دھیمی سی مسکان موجود تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی رات اس کی زندگی کی سب سے پُرسکون نیند کی رات ہوگی۔ نیند کا یہ مکمل خزانہ آج کل ہم سب میں سے کسی کا بھی نصیب نہیں ہے۔ ہم سو تو جاتے ہیں، مگر بنا نیند کے..... میں ریحان کے سو جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں گم صم سا بیٹھا رہا۔ میری بھیگی پلکیں مجھ سے بہت سے سوال کرتی رہیں، مگر آج بھی میرا دامن جوابوں سے خالی تھا۔

رات بہت دیر سے میں ساحلی مسجد کے قریب بس سے اترا، تو ایک نئی پریشانی میرے انتظار میں مسجد کے باہر ہی ٹہل رہی تھی۔ مرتضیٰ صاحب مجھے آتا دیکھ کر تیزی سے میری جانب بڑھے اور انہوں نے بتایا کہ مغرب کی نماز کے بعد اچانک سلطان بابا کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ فوری طور پر بستی کے حکیم کو بلایا گیا، مگر معاملہ اس کی پہنچ سے دور کا تھا، لہٰذا بستی والوں نے شہر کے ڈاکٹر کا انتظام کیا۔ میرے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر واپس جا چکا تھا۔ میں لپک کر حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا نیند میں تھے۔ پتا چلا کہ ڈاکٹر نے عارضی طور پر کوئی دوا اور نیند کا ٹیکا لگا تو دیا ہے، لیکن اس نے ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کی ہے کہ پہلی فرصت میں صبح سلطان بابا کو شہر کے بڑے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔

میں ساری رات وہیں بابا کے سرہانے ہی بیٹھا رہا اور اس ہمدرد اور بزرگِ مخلص کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ چند مہینوں ہی میں میری زندگی کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی کو کایا پلٹ کہتے ہیں، لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ اس پوری راہ میں، میں نے زہرہ کے علاوہ کوئی اور خوشی نہیں دیکھی تھی۔ ساحر کی زندگی جتنی ہم وار تھی، عبداللہ کی زندگی اسی قدر دشوار اور ہچکولوں سے بھری ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس جذبے کو ہم نے خوشی کا نام دے رکھا ہے۔ وہ کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتا۔ شاید کسی غم کا نہ ہونا ہی اصل میں خوشی ہے، ورنہ سب طرف غم ہی غم ہوتا ہے۔ حسبِ معمول فجر کے وقت سلطان بابا کی آنکھیں میکانکی انداز میں کھل گئیں۔ ہمارے ذہن میں لگے الارم کلاک کی سوئیاں سوتے میں بھی بالکل ٹھیک کام کرتی ہیں۔ میں نے انہیں آنکھیں کھولتے دیکھ کر ان سے پوچھا ''آپ مجھے کیوں اتنا ستاتے ہیں.....؟'' سلطان بابا کے نحیف چہرے پر ہلکی سی مسکان آ گئی۔ ''ستایا تو اپنوں ہی کو جاتا ہے میاں، اور پھر جسے عبداللہ جیسا تیماردار میسر ہو، وہ بار بار بیمار نہ پڑے، تو اور کیا کرے؟'' میں نے منت سماجت کر کے انہیں کم سے کم حرکت کرنے پر آمادہ کیا تو انہوں نے وضو کے بعد بیٹھ کر اشاروں سے نماز ادا کی۔ سورج نکلتے ہی میں نے رحمٰن صاحب کو شہر فون کر کے کسی سواری کا بندوبست کرنے کی درخواست کی اور ٹھیک پونے گھنٹے بعد ایک بڑی سی آرام دہ کار سمیت وہ خود مسجد کے باہر موجود تھے۔ ہم نے سفر کے دوران بھی اس بات کی حتی الامکان کوشش کی کہ سلطان بابا کے جسم کو راستے کے ہچکولوں سے بچایا جائے، کیوں کہ رات والے ڈاکٹر کی بھی یہی ہدایت تھی۔

شہر کے بڑے اسپتال کے ڈاکٹر نے سلطان بابا کو معائنے کے دوران ہی اسپتال میں داخل کرنے کی ہدایت کر دی۔ میں اور رحمٰن صاحب راہ داری ہی میں موجود تھے، جب ڈاکٹر صاحب مریض کے معائنے والے کمرے سے باہر نکلے۔ ہم دونوں ان کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ ''ان بزرگ کو ماضی قریب میں کوئی سر کی شدید چوٹ لگی ہے شاید.....'' ''جی..... کچھ حادثہ ہو گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے سر ہلایا ''تو میرا اندازہ درست تھا۔ کچھ پیچیدگی ہو گئی ہے، لیکن میں حتمی رائے تب ہی دوں گا، جب ان کے تمام معائنوں کی رپورٹ میرے پاس آ جائے گی..... اللہ خیر کرے گا'' ڈاکٹر میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ سلطان بابا کو فوری نگہداشت کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا اور پھر سے وہی شیشے کی نلکیاں اور بوتلیں ان کے جسم سے چپکا دی گئیں، جن سے انہیں شدید چڑ تھی۔ رحمٰن صاحب بھی بہت دیر تک میرے ساتھ ہی، شیشے کی دیوار سے پرے کمرے میں لیٹے سلطان بابا کو دیکھتے رہے۔ پھر انہیں کوئی ضروری فون آیا، تو وہ مجھ سے معذرت کر کے اپنے دفتر کی جانب روانہ ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ وقت جب اڑنے پر آئے، تو پر لگا کر اڑتا ہے اور جب سرکنے پر آئے، تو یوں ایک ایک صدی کر کے سرکتا ہے کہ ہم ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے کئی جنم گزار دیتے ہیں۔ میں نے بھی نہ جانے اس لکڑی کی بینچ پر بیٹھے کتنے جنم پھر سے جی کر فنا کر دیے۔ ڈاکٹروں کی نہ جانے کتنی ٹولیاں اندر آتی جاتی رہیں اور سلطان بابا کا معائنہ جاری رہا۔ نہ جانے کب پھر سے رات ہوئی اور پھر سویرا بھی ہو گیا۔ درمیان میں دو مرتبہ رحمٰن صاحب کا فون بھی آیا۔ میں دو رات پہلے ریحان سے ملنے کا وعدہ کر کے آیا تھا، لیکن آج دوسرا دن چڑھ آنے کے باوجود یہاں سے ہل بھی نہیں سکا تھا۔ جانے ہم انسان کس بل بوتے پر ایسے وعدے اور اتنے بڑے بڑے دعوے کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تو ایک پل کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔

پھر سہ پہر ڈھلنے کے بعد تھکے تھکے سے رحمٰن صاحب بھی آ گئے۔ میں نے ان سے ریحان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا، تو وہ ہوں ہاں کر کے ٹال گئے۔ میں بے چین ہو گیا اور ان کی منت کی کہ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ آخر رحمٰن صاحب نے ہتھیار ڈال کر مجھے وہ ان ہونی بھی سنا دی، جس کا خدشہ شاید میرے اندر بہت پہلے سے کہیں بیٹھا ڈنک مار رہا تھا۔ رحمٰن صاحب نے بتایا کہ ریحان اس رات بے حد پُرسکون نیند سویا تھا اور اٹھنے کے بعد بھی وہ بہت پُرسکون رہا، لیکن سہ پہر کے بعد اس کے اندر عجیب سی بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ فوراً کمرے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں، تاکہ اسے دن ہونے کا احساس ہوتا رہے، مگر وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر سر پٹختا رہا۔ شاید اس کا وجود اندر سے چیخ رہا تھا اور برسوں سے اس کے اندر پلتی دہری شخصیت کو جب لگاتار کئی راتوں تک اپنے اظہار کا موقع نہیں مل پایا، تو اس نے ریحان کے اعصاب اکھیڑنا شروع کر دیے تھے۔ ماہرِ نفسیات کے کہنے پر شام سے پہلے ہی کھڑکیوں کے پردے گرا کر ریحان کے کمرے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل اور میک اپ کا کچھ سامان پہنچا دیا گیا اور کمرا باہر سے بند کر دیا گیا، لیکن کچھ ہی دیر میں ریحان نے سنگھار میز کے آئینے کو ایک ہی ضرب سے کرچی کرچی کر دیا اور سنگھار کا سارا سامان اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ اسپتال کے عملے نے فوراً ریحان کو قابو کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا جنون بڑھتا ہی گیا اور نصف شب تک وہ خرد کی آخری حد بھی پار کر چکا تھا۔ مجبوراً اسے بجلی کے جھٹکے دیے گئے، لیکن ریحان جس گلابی دھند کے پار جا چکا تھا، وہاں سے واپس نہ لوٹ پایا۔ اگلی صبح اسپتال کی راہ داریاں اس کے دیوانہ وار قہقہوں سے گونج رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر میں لوگوں کو کسی معصوم بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ معصوم بچہ، جس کی پیاری ماں کو لوگ اس سے چھین کر لے جا رہے ہوں اور وہ رو رو کر اپنی ماں سے پوچھ رہا ہو کہ اب اسے رات کو لوری کون سنائے گی، کون صبح اس کے بال سنوارے گی اور کون اسے ہنس کر اپنے سینے سے لگائے گی۔ میرا دل پھٹنے لگا اور مجھے یوں لگا کہ ریحان کے ساتھ ساتھ میں بھی اسی گلابی دھند کے پار جا رہا ہوں۔

(باقی آئندہ)

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

.....ہاشم ندیم.....

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

ریحان نے ہمیشہ کے لیے اپنا ناتا اس ہوش کی دنیا سے توڑ لیا تھا، جہاں اس جیسے نازک احساس والے کے لیے ذی ہوش خود دیوانہ تھا۔ یہ دنیا ویسے بھی اس کے کام کی نہیں تھی، جہاں کانچ کا من رکھنے والوں کو ہر دم پتھروں کا سامنا رہتا ہے۔ اس شام جب سلطان بابا نے تین دن کی بے چینی کے بعد ذرا دیر کے لیے غنودگی کی چادر اوڑھی، تو میں رحمٰن صاحب کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ریحان کو دیکھنے کے لیے گیا۔ آہنی سلاخوں سے پرے ایک ایسے کمرے میں، جس کی دیواروں کو اندر سے چکنے اسٹیل سے ڈھک دیا گیا تھا اور جس کی آہنی چھت کے اندر صرف ایک بلب کے جلنے کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی، ریحان گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا، ہماری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا اور کسی بچے کی طرح خوف زدہ ہو گیا۔ پھر جلدی سے ہماری جانب سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گیا، لیکن اچانک ہی جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ جلدی سے بھاگ کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ رحمٰن صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''میری امی کب آئیں گی.....؟'' رحمٰن صاحب نے جھوٹی مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔ ''تمہاری امی جلد آ جائیں گی، شرط یہ ہے کہ تم روؤ گے نہیں، نہ ہی یہاں کے عملے کو تنگ کرو گے۔'' ریحان خوش ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے..... پکا.....؟'' رحمٰن صاحب نے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''بالکل پکا.....'' وہ فوراً جا کر اپنی جگہ پر یوں باادب بیٹھ گیا، جیسے کوئی بہت تمیز دار بچہ اپنی ماں کے حکم کے مطابق کسی جگہ بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ مجھ سے پھر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ کتنا نازک ہوتا ہے یہ انسان، کتنا کومل، کتنے ملائم احساس والا..... پھر بدل کیسے جاتا ہے۔ مکاریاں، فریب، چال بازیاں، دشمنیاں، حسد، برائیاں، کینہ پروری، چوری، جھوٹ، خیانت اور دغا بازیاں کیسے سیکھ لیتا ہے؟ اگر جنوں انسان کو پھر سے ریحان کی طرح معصوم بنانے کے عمل ہی کا نام ہے، تو اے کاش قدرت سب ہی ہوش مندوں کو مجنوں کر دے اور پھر شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہوش والے بھلا جنوں کی حکایت کو کیا جانیں، بے خودی کی لذت تو صرف دیوانوں ہی کا انعام ہے۔ یہ نادان ہوش والے تو بس ساہوکار کی طرح لین دین اور نفع نقصان کے پھیرے میں پڑے رہتے ہیں، لیکن ایک دن انہیں بھی سب کچھ یہیں چھوڑ کر دیوانوں کے ساتھ ہی کوچ کرنا پڑتا ہے۔

میں واپس اسپتال تو آ گیا تھا، لیکن اپنے دل کا ایک ٹکڑا وہیں ریحان کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ خود میری اپنی حالت بھی نہایت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ رگوں میں سلگتی چنگاریاں وقفے وقفے سے ایک بھڑکتا شعلہ بن کر میرے پورے سراپے کو جھلسا رہی تھیں، لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔ میں ایسے موقع پر ڈاکٹروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا کر سلطان بابا کے سامنے سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا، لیکن یہ جبر میں نے رات بھر خود پر اس طرح جھیلا کہ صبح میرا سارا بدن بخار میں پھنک رہا تھا۔ بالآخر صبح ڈاکٹروں نے سلطان بابا کے معائنوں کے حتمی نتائج دیکھنے کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ انہیں جس جدید علاج کی ضرورت ہے، وہ ملک کے صرف دو شہروں میں دست یاب ہے، جس میں ایک میرا اپنا شہر بھی شامل تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں سے ہمارے شہر کے لیے ہفتے بھر میں صرف ایک جہاز اڑتا تھا اور بدقسمتی سے آج وہی دن تھا اور اڑان کا وقت بھی نکل چکا تھا۔ زمینی راستے سے جانے والی سلطان بابا کی حالت نہیں تھی اور ٹرین تک پہنچنے کے لیے کم از کم یہاں سے دو دن کا زمینی سفر درکار تھا۔ پھر نہ جانے رحمٰن صاحب کے ذہن میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے دو چار فون گھمائے اور گھنٹے بھر بعد ہی آ کر یہ مژدہ سنایا کہ شہر کی بندرگاہ پر ایک بہت بڑا غیر ملکی بحری جہاز آ کر لگا ہے اور ٹھیک چھ گھنٹے بعد اس کی روانگی ہے۔ رحمٰن صاحب نے ہمارے لیے دو فرسٹ کلاس کے کیبن مختص کروا لیے تھے۔ ہمیں یہ بحری جہاز آج سے ٹھیک پانچویں دن شہر کی بندرگاہ پر اتار دیتا۔ بقول رحمٰن صاحب، یہاں بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ ہم اپنی منزل کی جانب چل پڑتے، کیوں کہ سات دن بعد بھی اگر موسم یا کسی دوسری ان ہونی کی وجہ سے ہم سے اگلی فلائٹ بھی رہ جاتی، تو مزید دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہا، تو انہوں نے زور سے میرا کاندھا تھپتھپایا اور میرے ساتھ سامان سمیٹنے میں مشغول ہو گئے۔

جب ہم بندرگاہ پہنچے، تو وہ عظیم الشان نیلے رنگ کا بحری جہاز، جس کی سات منزلیں تو دور ہی سے گنی جا سکتی تھیں، کسی فوج کے فاتح سپہ سالار کی طرح سینہ تانے لنگر انداز تھا۔ جہاز پر سنہری اور سفید حروف میں بڑا بڑا کا سابلانکا لکھا ہوا تھا اور اطالوی نژاد عملہ عرشے پر اور نیچے سیڑھیوں پر کھڑا، آنے والے

مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ اس بحری جہاز کو دیکھتے ہی مجھے اسی جیسے ایک دیوہیکل سفینے کے ڈوبنے کا واقعہ یاد آ گیا، جس سے جڑی محبت کی ایک لافانی داستان کو لوگوں نے پردے پر بھی بے حد سراہا تھا۔ رحمٰن صاحب کے عملے نے ایمبولینس سے اتار کر اسٹریچر پر لیٹے سلطان بابا کو نہایت احتیاط سے مشین کے ذریعے اوپر جہاز پر پہنچا دیا۔ جہاز کے بھونپو نے ایک زوردار ہنکارا بھرا اور میں نے رحمٰن صاحب کی جانب الوداعی ہاتھ بڑھا دیا۔ انہوں نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولے ''زندگی رہی تو تم سے ملاقات ضرور ہوگی۔ میں جانتا ہوں، تم نے سلطان بابا کی حالت کے پیشِ نظر اپنی تکلیف ہم سب سے چھپائے رکھی، لیکن تم اسے میرا حکم سمجھ لو یا درخواست کہ اپنے شہر پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنا چیک اپ بھی ضرور کراؤ گے۔ تمہارے یہاں کے معالج تمہارے لیے بے حد فکر مند ہیں۔ انہیں ابھی تک تمہاری بیماری بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آئی اور تمہیں یوں درمیان میں ہی سب چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے.....'' میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں ان کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا۔ وہ تب تک وہیں بندرگاہ کی میلوں پھیلی سلیب پر کھڑے رہے، جب تک جہاز لہریں اچھالتا اور کسی مست ہاتھی کی طرح جھومتا گہرے پانیوں میں نہیں نکل آیا۔ جہاز نے جس وقت لنگر اٹھایا تھا، اس وقت عصر کا وقت تھا اور اب مغرب بھی ڈھل چکی تھی۔ میں سلطان بابا کو ان کے کیبن میں دوا کھلا کر، کمبل اوڑھا کے باہر عرشے پر نکل آیا۔ کھلے سمندر میں سورج ڈوبنے کے بعد بھی بہت دیر تک شفق کی لالی برقرار رہتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سورج غروب ہونے سے پہلے سمندر کے ساتھ اپنی آخری جنگ لڑ رہا تھا، تب اس کی سنہری کرنوں نے افق تا افق لہروں کو اپنا سونا سونپ کر درخواست کی کہ آج وہ سورج کو نہ ڈبوئے..... لیکن سمندر بھلا کب کسی کی سنتا ہے، جو ان معصوم کرنوں کی مانتا، نتیجتاً ازل سے جاری اس لڑائی میں ایک بار پھر شام ڈھلے سورج کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے اور سمندر ایک بار پھر جیت گیا۔

میں جانے کتنی دیر عرشے پر لوہے کی ریلنگ کے پاس کھڑا لہروں کو سمندر کی جیت کا جشن مناتے دیکھتا رہا۔ اچانک پیچھے سے کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ چونک کر پلٹا، تو احرام باندھے کوئی عازمِ حج کھڑا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بندرگاہ پر جہاز میں سوار ہوتے، میری نظر عازمین حج کی ایک ٹولی پر بھی پڑی تھی۔ وہ راہِ حق کا مسافر مجھے دیکھ کر مسکرایا ''کہیں بہت دور کھوئے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہیں سمندر کا جادو تمہیں کھینچ نہ لے..... اس لیے مخل ہو گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔'' میں بھی دھیرے سے مسکرایا۔ ''میرے اندر بہ یک وقت نہ جانے ایسے کتنے سمندر ٹھاٹھیں مارتے رہتے ہیں، اس کا جادو ٹونا میرے لیے نیا نہیں۔'' ''بہت خوب..... کوئی لمبا سفر درپیش ہے؟ اور وہ بزرگ اب کیسے ہیں، جو تمہارے ہم سفر ہیں۔ میں نے جہاز پر سوار ہوتے وقت انہیں تمہارے ساتھ دیکھا تھا۔'' ''جی وہ آرام کر رہے ہیں۔ طبیعت کچھ مضمحل ہے ان کی۔ ہم اگلی بڑی بندرگاہ پر اتر جائیں گے۔ وہی میرا شہر اور ہماری منزل بھی ہے۔'' اس نے با آوازِ بلند کہا ''انشاء اللہ'' کچھ دیر ہم دونوں پہاڑ جیسی لہروں کو نیچے جہاز کے پیندے سے ٹکرا کر فنا ہوتے دیکھتے رہے۔ پھر میں نے ہی آدابِ تکلم کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بات جوڑی، ''البتہ آپ کا سفر کافی طویل ہے، کتنے عرصے میں پہنچ جائیں گے، اس کے گھر.....؟'' ''شاید چودہ پندرہ دن لگیں گے، لیکن سچ تو یہی ہے کہ یہی پندرہ دن اس پچپن سالہ زندگی کا حاصل ہیں۔ تم نے حج کیا ہے.....؟'' ''نہیں..... مجھے فی الحال یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی..... اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یہ بہت ہمت اور حوصلے کا کام لگتا ہے۔ جانے میرا ظرف اس قابل کبھی ہو بھی پائے گا یا نہیں۔'' وہ ہنس دیے ''سب بلاوے کی بات ہے میاں..... بلاوا آ جائے، تو لمحوں میں انسان کا اندر تیار ہو جاتا ہے۔ خود میرا بھی حال تم سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کبھی اس سفر کے لیے نکل ہی نہیں پاؤں گا، لیکن جب بات بننے لگی، تو یوں بنی کہ جیسے بس اسی سفر کے انتظار میں ہی تو میری ساری عمر کٹی ہے۔'' وہ کافی دلچسپ انسان تھے۔ ان کا نام حبیب البشر تھا۔ تیسری منزل پر چند دوسرے ایشیائی باشندوں کے ساتھ ان کا مشترکہ کیبن تھا۔ وہ کافی دیر میرے ساتھ عرشے پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چند سال پہلے نیویارک میں کاروبار کرتے تھے اور مذہب سے ان کا دور دور تک کوئی واسطہ یا رابطہ نہیں تھا۔ میں نے بے خیالی ہی میں پوچھ لیا۔ ''آپ نیویارک میں کیا کرتے تھے؟'' ''میرا ڈانس کلب تھا وہاں۔ ویک اینڈ پر پارٹی اور فنکشن کا اہتمام کروایا کرتا تھا میں۔'' جواب سن کر میں زور سے چونکا۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئے۔ میں نے معذرت کی کہ خواہ مخواہ ان کی نجی زندگی کو کریدا۔ وہ ہنس دیے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں میاں..... میں نے کہا نا کہ میں چودہ پندرہ سال کی عمر میں امریکا منتقل ہو گیا تھا، لہٰذا میرا اسلام سے برائے نام رشتہ بھی قائم نہ رہ سکا، پھر ایک دن کچھ لوگ میری زندگی میں آئے اور میری راہیں بدلتی گئیں۔'' وہ دور افق کے پار کچھ دیکھتے ہوئے کھو سے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ''اس روز نیویارک میں پیدل چلنے کا دن منایا جا رہا تھا، لہٰذا لوگ قریبی مقامات تک پیدل چل کر جا رہے تھے۔ سڑکوں پر کسی میلے یا تہوار جیسی بھیڑ تھی۔ نوجوان حبیب بھی ہلکی ہلکی گرتی برف میں سردی سے جمتے ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں ڈالے، سیٹی پر کوئی مشہور دھن گنگناتا، کلب کی جانب جا رہا تھا۔ آسمان کے تیور بتا رہے تھے کہ کسی بھی وقت برف باری تیز ہو سکتی ہے، لہٰذا لوگوں کے قدموں میں تیزی آ رہی تھی۔ تیز سرد ہوا کے تھپیڑے لباس کے اندر داخل ہو کر جسم کے پار نکلے جاتے تھے۔ حبیب قریبی چوراہے کے سگنل پر پہنچا، تو بتی سرخ تھی۔ اچانک پیچھے سے کسی نے پکارا۔ ''نوجوان..... کیا تم دو لمحوں کے لیے ہماری بات سن سکتے ہو۔'' حبیب چونک کر پلٹا۔ پیچھے پانچ باریش بزرگوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ ''جی فرمائیے.....'' ''کیا تم ہمیں اپنے قیمتی وقت میں سے صرف دس منٹ دے سکتے ہو، اللہ کے لیے.....'' حبیب سمجھا کہ وہ کوئی چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بزرگ اس کا مقصد سمجھ کر مسکرائے، ''نہیں..... پیسا نہیں..... صرف وقت..... اور وہ بھی دس منٹ.....'' ''لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور پھر نیویارک جیسے شہر میں آپ کو کوئی بھی دس منٹ نہیں دے گا۔ یہاں وقت ہی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔'' ''تب ہی تو ہم نے کہا کہ اپنا قیمتی وقت دے سکتے ہو، اس

اللہ کے نام پر، جس نے تمہیں پیدا کیا اور اتنی اچھی صورت دی اور آرام دہ زندگی عطا کی۔ ہم تم سے تمہارے دس منٹ مانگنے کے لیے سات سمندر پار سے آئے ہیں، اور یہاں سب سے ہمارا بس اتنا ہی مطالبہ ہے، لیکن اب تک زیادہ تر دھتکار ہی ملی ہے۔'' حبیب نے کچھ دیر سوچا اور پھر نہ جانے کیوں اس کا دل پسیج گیا۔ ''ٹھیک ہے..... لیکن صرف دس منٹ..... ایک سیکنڈ بھی زیادہ نہیں، کیوں کہ مجھے اپنے کلب پہنچنا ہے اور ایک بہت ضروری شو کا اہتمام کرنا ہے۔'' سگنل کھل چکا تھا۔ باریش ٹولی حبیب کو سامنے ہی شیشوں کے بڑے بڑے دروازوں والے ایک کیفے میں لے گئی۔ برف باری تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پار کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں کے نشان برف پر بننا شروع ہو چکے تھے۔ حبیب نے کیفے میں داخل ہو کر سر کے بالوں میں جمی برف کو جھاڑا۔ انہوں نے کھڑکی کے سامنے والی میز سنبھال لی۔ ایک بزرگ نے بیگ میں سے ایک کتاب نکالی اور اس کی تلاوت کی۔ ساتھ بیٹھے دوسرے بزرگ نے ترجمہ سنایا ''تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے.....'' تلاوت جاری رہی اور ترجمہ ہوتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے نو منٹ بعد بزرگ نے تلاوت بند کر دی۔ ''دس منٹ پورے ہونے کو ہیں۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے اپنے وقت میں سے دس منٹ اللہ کے نام کر دیے۔ جزاک اللہ.....'' لیکن حبیب ابھی سیر نہیں ہوا تھا ''کیا آپ میرے لیے پانچ منٹ مزید یہ کتاب پڑھ سکتے ہیں..... میں اپنا وقت کور کرنے کے لیے زیرِ زمین ٹرین پکڑ لوں گا۔'' بزرگ نے بنا کچھ کہے، پھر سے کتاب کھولی اور مزید پانچ منٹ تلاوت کی۔ حبیب نے گھڑی دیکھی ''اگر میں اپنے عملے کو موبائل کے ذریعے ایک پیغام بھیج دوں، تو وہ میرے پہنچنے تک کچھ انتظامات شروع کر سکیں گے۔ اس صورت میں میرے پاس مزید پندرہ منٹ بچ سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو میں مزید سُننا چاہوں گا۔'' پندرہ منٹ مزید تلاوت ہوتی رہی، لیکن حبیب اب بھی کچھ بے چین سا تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنا شو ختم کر کے رات دس بجے دوبارہ اس کیفے میں آئے گا اور پوری سورۃ دوبارہ سُنے گا۔ وہ رات بھی آ گئی اور نصف شب تک تلاوت بھی ہوتی رہی، لیکن معاملہ اب بھی وہی تھا۔ حبیب کی تشنگی..... پھر طے یہ ہوا کہ حبیب اتوار کے روز جماعت کے ساتھ مین ہٹن کے علاقے میں پورا ایک دن گزارے گا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ حبیب نے ہچکچاتے ہوئے بزرگ سے پوچھا کہ یہ پوری کتاب اور یہ پورا پیغام سُننے کے لیے اسے اُن لوگوں کے ساتھ کتنا وقت بتانا ہوگا؟ کیوں کہ تین دن تو وہ کسی نہ کسی طرح نکال ہی لے گا۔ بزرگ نے کہا ''جزاک اللہ'' اور تین دن کے لیے حبیب البشر ان کے ساتھ ہو لیا، پھر تین سے دس اور دس سے بات چالیس دنوں تک جا پہنچی اور جب چالیس دن کے بعد حبیب گھر پہنچا تو وہ حبیب نہ تھا، جسے اس کی گلی نمبر 128 والے جانتے تھے۔ ڈانس کلب دھیرے دھیرے کافی کے کیفے میں تبدیل ہو گیا، جس کے باہر لگا بڑا سا بورڈ دور سے لوگوں کو نظر آ جاتا تھا۔ جس پر لکھا تھا ''یہاں شراب فروخت نہیں کی جاتی۔'' زندگی کا پہیہ گھومتا رہا اور اپنے وقت میں سے دیے گئے دس منٹوں نے حبیب کو کچھ ایسا خراج ادا کیا کہ وہ خود اُن لوگوں کا سربراہ بن گیا، جو لوگوں سے اللہ کے لیے چند منٹ طلب کرنے، دنیا بھر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ پھر ایک دن حبیب چند لوگوں کے ساتھ مشرقی ساحل والے اپنے آبائی شہر میں اترا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔'' حبیب صاحب اپنی کہانی سُنا کر خاموش ہو گئے، بیس برس کا جمع پانی ان کی آنکھوں سے نکل کر سمندر کے نمک کو مزید نمکین کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا، بقول ان کے، بیس برس بعد آخر کار اُن کا وہاں سے بلاوا آ ہی گیا تھا، جہاں جا کر وہ ماتھا ٹیک کر تب تک نہ اٹھتے، جب تک انہیں اپنے پچھلے ہر گناہ کی معافی کا یقین نہیں ہو جاتا۔ وہ یہ شکوہ بھی کرنے جا رہے تھے کہ وہ پُراسرار بندے جو عمر کے چونتیسویں سال میں نیویارک کے ایک چوراہے پر ان سے ملے تھے، وہ انہیں پہلے کیوں نہیں ملے.....؟ وہ اس کے پیارے حبیبؐ کے روضے کی جالی سے اپنی جبیں ٹکا کر تب تک رونا چاہتے تھے، جب تک اُن کی آنکھوں کا پانی بھی آبِ زم زم کی طرح میٹھا نہ ہو جائے..... میں عقیدت سے اس انسان کی طلب کو محسوس کرتا رہا۔ سمندر کی لہریں اب بپھرتی جا رہی تھیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ نچلی منزل پر اوّل درجے کے مہمانوں کے ریسٹورنٹ کی گھنٹی بج چکی تھی اور اندر سے پیانو کی ہلکی سی موسیقی کی تانیں باہر عرشے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ حبیب صاحب تیسری منزل کے مہمان تھے، لہٰذا انہیں اسی ریستوران میں کھانا کھانے جانا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ رحمٰن صاحب نے بنا مجھ سے پوچھے ہی جہاز کے سب سے اعلیٰ حصے کے ٹکٹ کروا لیے تھے۔ مجھے جہاز کا اطالوی عملہ دو مرتبہ آ کر یاددہانی کروا چکا تھا کہ کھانا نیچے ریستوران میں چُن دیا گیا ہے۔ حبیب صاحب بھی نیچے جانے کے لیے پلٹے، اچانک میں ان سے پوچھ بیٹھا ''کیا وہاں پہنچنے تک میں آپ کو یاد رہ پاؤں گا؟ میرا مطلب ہے کہ کیا آپ میرے لیے اس کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا مانگ سکتے ہیں اور اس جالی کے سامنے بھی، اگر آپ کو یاد رہے تو.....؟'' حبیب صاحب تڑپ کر پلٹے ''ہاں ضرور..... کیوں نہیں..... یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کوئی خاص دُعا کروانی ہے تو وہ بھی بتا دو.....'' میں کچھ دیر خاموش رہا ''ہاں..... بہت خاص..... دعا بھی کیا ہے، بس ایک پیغام ہے کہ آپ نے اُسے صرف چالیس دن میں پا لیا، میں چالیس صدیاں بھی ریاضت کرنے کو تیار ہوں، بس مجھے مکمل دیوانہ کرنے سے پہلے ایک بار چند لمحوں کے لیے فرزانگی عطا کر دے۔ وہ فرزانگی، جو میری آنکھوں پر پڑے سب پردے اُٹھا دے۔'' جانے حبیب صاحب کو میری بات سمجھ میں بھی آئی کہ نہیں۔ وہ کچھ دیر نم آنکھوں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ پھر دھیرے سے بولے ''انشاء اللہ۔''

میں اُن سے رخصت ہو کر نیچے ریستوران میں پہنچا، تو کھانا لگایا جا چکا تھا۔ خوب صورت سفید اور نیلی وردیوں میں چاق و چوبند بیرے اور دیگر عملہ مہمانوں کی خدمت میں مشغول تھا۔ ایک جانب پیانو پر ایک خوش گلو دوشیزہ بیٹھی کسی اطالوی اوپیرا کا کوئی مشہور گیت بجانے کے ساتھ دھیمے سُروں میں گنگنا بھی رہی تھی۔ سارے ہال میں غیر ملکی مسافر ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد اور اناس کی چند قاشیں رکھیں اور ایک اندھیرے گوشے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ سامنے سے آتی ایک غیر ملکی خاتون سے، جو اپنی چار پانچ سالہ بچی کو پکڑنے کے لیے لپک ہی رہی تھیں، زور سے ٹکرا گیا۔ میری پلیٹ سے سلاد ان کے لباس اور پھر زمین پر بکھر گیا۔ ان کا پارہ ایک دم ہی آسمان کو چھو گیا اور انہوں نے بنا میری معذرت سُنے، انگریزی میں مجھے بے نقط سنانا شروع کر دیں، حالاں کہ غلطی بھی انہی کی تھی۔ میرے سادہ سے شلوار کُرتے کی وجہ سے شاید وہ مجھے بھی نچلے عملے ہی کا کوئی رُکن سمجھی تھیں اور پھر پورا ہال ہماری جانب متوجہ ہو چکا تھا ''جانے کہاں کہاں سے آ جاتے ہی احمق لوگ۔ جنہیں ریستوران کے آداب کی بھی تمیز نہیں۔ میرے سارے لباس کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اس آدمی کو کس نے ہال میں آنے دیا ہے۔ میری کپتان سے بات کرواؤ ابھی۔'' وہ بنا وقفے کے چلائے جا رہی تھیں۔ میں چپ چاپ کھڑا اپنی وضاحت پیش کرنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک جہاز کی ایک اٹینڈنٹ بدحواس سی میری جانب دوڑتی ہوئی آئی ''وہ جو بزرگ آپ کے ساتھ تھے..... ان کی حالت بگڑ رہی ہے.....''

(جاری ہے)

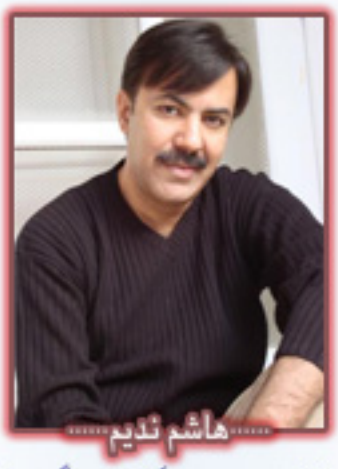

ہاشم ندیم

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

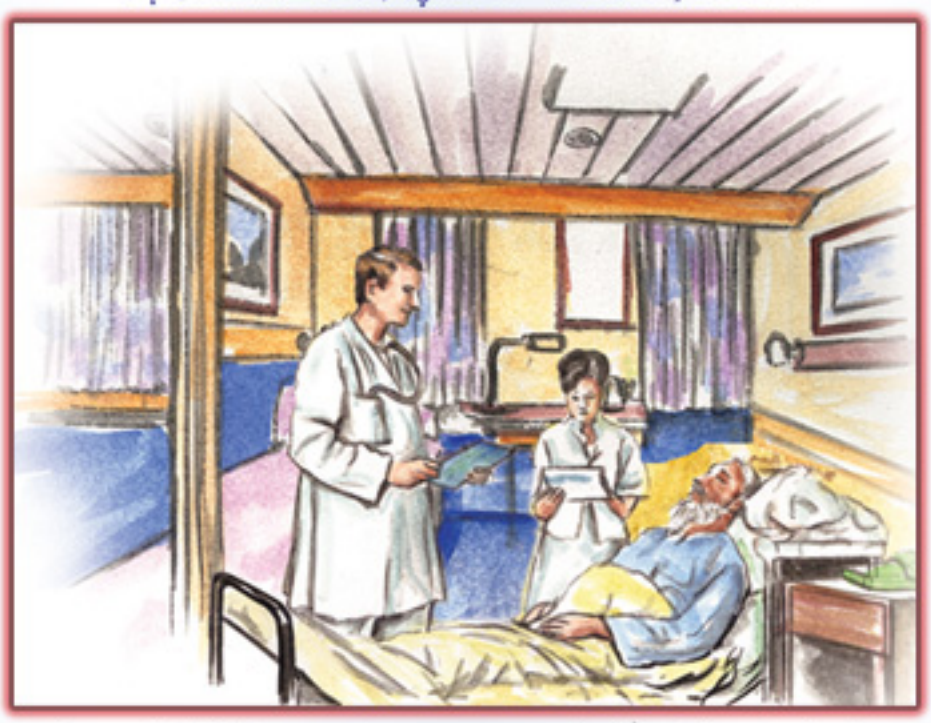

یہ سنتے ہی میں اس عورت کو چیختا چلاّتا چھوڑ کر اپنے کیبن کی جانب لپکا، وہاں پہلے ہی سے جہاز کی طبّی ٹیم کے مستند ڈاکٹر موجود تھے۔ سلطان بابا کو آکسیجن لگائی جا چکی تھی اور ان کی سانس رک رک کر چل رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر ڈاکٹر سے پوچھا کہ ”کیا ماجرا ہے؟“ ڈاکٹر نے سلطان بابا کی نبض سے ہاتھ اٹھایا ”عام طور پر بوڑھے افراد کو سمندری بخار (Sea sickness) ہو جاتا ہے۔ ایسے میں متلی، چکر آنا یا دل گھبرانا معمول کی بات ہے، لیکن چوں کہ یہ بزرگ پہلے ہی سے بیمار چلے آ رہے تھے، لہٰذا دونوں وجوہ نے مل کر ان کے نظامِ تنفّس کو ایک دھچکا دیا ہے۔ بہر حال، ہم نے آکسیجن لگا دی ہے۔ ہمارے عملے کی نرس ساتھ والے کیبن ہی میں رات بھر موجود رہے گی۔ اگر آپ ذرا سی بھی غیر معمولی بات محسوس کریں، تو فوراً اسے طلب کر سکتے ہیں۔ شب بخیر.....“ فرانسیسی ڈاکٹر انگریزی میں مجھے تسلی دے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ نرس بھی اطالوی تھی۔ اس نے مجھے خود کار گھنٹی کا ریموٹ پکڑا دیا کہ ضرورت پڑنے پر میں صرف یہ بٹن دبا دوں، تو وہ حاضر ہو جائے گی۔ میں نے سلطان بابا کے بستر کے بالکل سامنے پڑی آرام کرسی سنبھالی اور کیبن کی روشنیاں مدھم کر کے کرسی پر کمر ٹکا لی۔ جانے کتنی دیر، میں آکسیجن سلنڈر کے ساتھ جڑی شیشے کی نلکی میں پانی کے بلبلے بن کر ختم ہوتے دیکھتا رہا۔ ہماری زندگی بھی تو فقط پانی کا ایک بُلبلہ ہی ہے۔ یہاں بنا..... وہاں ختم..... جانے رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا، لیکن دوسری مرتبہ دستک کی آواز واضح تھی، میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو راہ داری میں رات کے کھانے کے لباس (ڈنر سوٹ) میں ایک وجیہہ شخص، باریک سا خوب صورت نظر کا چشمہ لگائے کھڑا تھا۔ اس نے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ ”اس وقت زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں، مجھے راحیل کہتے ہیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں عبداللہ ہوں، کہیے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ وہ کچھ ہچکچایا۔ ”دراصل میں تم سے معذرت کرنے آیا ہوں۔ ڈائننگ ہال میں تم پر بلاوجہ چلاّنے والی میری بیوی نتاشا تھی۔ میں جانتا ہوں کہ غلطی تمہاری نہیں تھی، لیکن اس نے تمہاری بہت بے عزتی کی۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم ایشیائی ہو اور پھر جب میں نے جہاز کے عملے سے تمہارے کوائف پوچھے، تو پتا چلا کہ تم میرے ہم وطن بھی ہو۔ میں درحقیقت تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”بھول جائیے۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔“ ”نہیں..... یہ بھولنے والی بات نہیں ہے، لیکن نتاشا خود شدید ڈیپریشن کا شکار ہے اور اس نے جانے کس بات کا غصہ تم پر اتار دیا، ورنہ وہ عمومی طور پر نہایت شائستہ اطوار کی خاتون ہے۔“ میں نے ان کا تاسف کم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ ”آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لیں، یقین کریں، میں ڈائننگ ہال سے نکلنے سے پہلے ہی سب فراموش کر چکا تھا۔ دراصل میں کچھ پریشانی میں مبتلا ہوں، اس لیے مجھے جلدی میں وہاں سے نکلنا پڑا۔“ ”ہاں، مجھے پتا چلا ہے۔ اب کیسے ہیں وہ بزرگ؟“ ”کچھ بہتر ہیں۔ یہ انہی کا کیبن ہے، میرا کیبن ساتھ والا ہے۔“ اتنے میں عملے کی ایک اٹینڈنٹ ہمارے قریب آئی اور مؤدب انداز میں راحیل صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ”جناب آپ نے فرسٹ کلاس کے ایگزیکٹو سوئیٹ کے لیے حکم دیا تھا، لیکن معلومات کرنے پر پتا چلا ہے کہ اس وقت کوئی بھی رائل یا ایگزیکٹو کیبن خالی نہیں ہے، لہٰذا ہم معذرت خواہ ہیں، البتہ اگر آپ پسند کریں تو چوتھی منزل پر ایک دوسرے درجے کا کیبن فی الوقت میسر ہے۔ آپ کہیں تو اسے آج رات کے لیے بک کر دیا جائے۔“ راحیل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ اطالوی لہجے میں انگریزی بولنے والی اٹینڈنٹ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے راحیل صاحب سے پوچھا۔ ”کیا آپ کو جگہ کا مسئلہ درپیش ہے، اگر ایسا ہے تو آپ رات میرے کیبن میں بھی گزار سکتے ہیں۔ میں ویسے بھی رات بھر اپنے ہم سفر کے کمرے میں گزاروں گا۔ انہیں میری تیمارداری کی ضرورت ہے۔“ راحیل صاحب کچھ ہچکچا سے گئے۔ ”نہیں نہیں..... کچھ انتظام ہو ہی جائے گا، آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں۔“ لیکن میں نے اصرار کر کے اپنے کیبن کی چابی ان کے حوالے کر دی اور خود سلطان بابا کے کیبن میں چلا آیا۔ رات کے آخری پہر مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میرے ساتھ والے کیبن میں کچھ تیز لہجے میں بحث کی آوازیں ابھری ہوں، لیکن میں نے دانستہ راہ داری میں نکلنے سے گریز کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میاں بیوی میں کچھ اَن بن چل رہی

ہے، لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں انہیں اپنے معاملات سلجھانے کا موقع دوں۔ صبح تک سلطان بابا نے دو مرتبہ آنکھیں کھولیں اور دونوں مرتبہ مجھے جا کر سونے کا اشارہ کیا، لیکن وہ میرے جواب سے بھی خوب واقف تھے۔ صبح کے بعد ان کی نیند کچھ پُرسکون ہوئی، تو میں باہر نکل آیا۔ ٹھیک اسی وقت راحیل صاحب بھی ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ ''رات میں ٹھیک طرح سے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ نتاشا نے مجھے آدھی رات کو ڈھونڈ لیا تھا۔ دراصل ہمارے درمیان تمہارے معاملے ہی پر کچھ اَن بن ہوگئی تھی، اس لیے میں اپنا کیبن چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ پہلے تو وہ میرے کیبن سے یوں چلے آنے پر بہت ناراض ہوئی اور پھر جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میں اس وقت اسی نوجوان کے کیبن میں ہوں، جسے اس نے بھرے ہال میں سخت سُست سنائی تھی، تو وہ بہت دیر تک تو کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اتنا شرمندہ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں رات ہی اپنے کیبن واپس لوٹ گیا تھا۔ بہرحال، تمہارا بہت شکریہ۔'' انہوں نے کیبن کی چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی اور مجھے اپنے ساتھ ناشتے کے لیے چلنے کی دعوت دی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں لباس تبدیل کر کے نیچے ہال میں ان سے ملوں گا۔ کبھی کبھی نیم گرم پانی کا ایک طویل شاور ہماری رگوں سے تھکن یوں نچوڑ لیتا ہے، جیسے گیلی ریت پر لکھے کسی نام کو سمندر کی ایک بڑی لہر اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ میں ڈائننگ ہال پہنچا، تو کھڑکیوں کے پردے ہٹائے جا چکے تھے اور باہر آسمان پر ہلکے بادلوں سے چھن کر آتی دھوپ نے ہال کے چاروں طرف لکڑی کے چکنے فرش پر دھوپ کی درجنوں کھڑکیاں سی بنا رکھی تھیں۔ میں ابھی بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ راحیل صاحب نے آواز دی۔ ''یہیں آ جاؤ نوجوان..... ہماری میز پر ایک کرسی خالی ہے.....'' لیکن میں نے دور ہی سے ہاتھ ہلا کر ان کا شکریہ ادا کیا اور عرشے کی جانب کھلتی ایک کھڑکی کے قریب پڑی میز پر اپنے دلیے کا پیالہ رکھ دیا۔ تب ہی میں نے نتاشا کو میز سے اٹھ کر اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ تیس بتیس سال کی ایک دل کش خاتون تھیں۔ سلیقے سے کٹے ہوئے سنہرے بال، جو فلپر سے میچنگ اسکارف سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں آج دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور دونوں ہی مرتبہ جانے کیوں مجھے ان کے چہرے کے ایک زاویے سے کبھی کے ساحر کی پسندیدہ ہالی وڈ آرٹسٹ کیتھرین زیٹا جونز کی جھلک بہت واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں اجازت لے کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کل رات راحیل صاحب بھی مجھ سے اردو میں ہی بات کر رہے تھے، لیکن نتاشا کو اردو میں اپنے لفظ جوڑنے کے لیے کافی مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے کچھ دیر انہیں یہ ''ناکام کوشش'' کرنے دی اور پھر دھیرے سے ان سے انگریزی میں کہا کہ وہ چاہیں، تو اب یہ کوشش ترک کر کے مجھ سے انگلش میں بات کر سکتی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھونچکا سی رہ گئیں اور پھر انتہائی ندامت سے بولیں۔ ''اوہ..... تو تم انگلش بول لیتے ہو، لیکن مجھے راحیل نے تو بتایا تھا کہ..... پھر تو میں مزید نادم ہوں، کیوں کہ تم نے میری گزشتہ رات کی ساری گفتگو سمجھ لی ہوگی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کبھی کسی پر اس طرح نہیں چلائی۔'' میں مسکرایا۔ ''چلیں یہ اعزاز میری قسمت میں لکھا تھا، ورنہ عام طور پر بے چارے شوہر کا نصیب ہوتا ہے۔'' میری بات سن کر وہ ہنس پڑیں اور ان کے چہرے پر چھایا ہوا تکدّر کم ہو گیا۔ ''ویسے تم عجیب لڑکے ہو، جس عورت نے تمہیں یوں سرِ بازار رسوا کیا، اسی کے شوہر کو تم نے رات گزارنے کے لیے اپنا کیبن پیش کر دیا۔ کیوں؟.....'' میں نے ان سے بھی وہی کہا، جو رات کو راحیل صاحب سے کہہ چکا تھا کہ وہ سب فراموش کر دیں۔ ہماری میز کے بالکل ساتھ والی میز پر ایک نوبیاہتا انگریز جوڑا ناشتا کر رہا تھا۔ پتا نہیں کس بات پر لڑکے نے لڑکی سے بہت پیار سے پوچھا۔ ''سچ کہو، تم میرے ساتھ خوش تو ہو نا۔'' لڑکی نے ہنستے ہوئے زور سے ''ہاں'' کہا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ قریب ہونے کی وجہ سے ان کی ساری گفتگو ہم تک پہنچ رہی تھی۔ نتاشا مسکرائی۔ ''کتنی عجیب بات ہے، برسوں سے یہ سوال عورت سے تب ہی کیا جاتا ہے، جب اس کے پاس ''ہاں'' کہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔'' ''ظاہر ہے، کون بے وقوف شوہر ہوگا، جو اپنی بیوی کو پیٹتے ہوئے یہ سوال کرے گا؟'' میری بات سن کر وہ پھر زور سے ہنس پڑیں، لیکن ان کی اداس آنکھیں کچھ اور ہی فسانہ سنا رہی تھیں۔ میں نے ان سے معذرت کی کہ کل رات میری وجہ سے راحیل صاحب کا ان سے جھگڑا ہوا۔ وہ جلدی سے بولیں ''نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... تم صرف ایک بہانہ بنے، ورنہ ہمارے درمیان بہت دن پہلے ہی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگلی بندرگاہ پر اتر کر ہم قانونی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔'' میرے اندر جیسے ایک چھناکا سا ہوا۔ یہ بات میرے لیے کچھ اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ وہ شاید میری حالت بھانپ گئیں۔ ''شاید میں نے تمہیں دھچکا پہنچایا۔ مجھے افسوس ہے، مگر سچ یہی ہے۔ ہمارے درمیان جمود طاری ہو رہا تھا اور شاید جمود محبت کی موت ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ محبت کو جمود سے بچانا بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح جیسے محبت کا ہو جانا ہمارے بس سے باہر ہوتا ہے۔'' میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ مشرق کی عورت جس بات کو چھپانے کے لیے زندگی بھر چپ رہتی ہے، مغرب کی عورت نے وہی حقیقت کتنی آسانی سے بیان کر دی تھی۔ میں چپ رہنا چاہتا تھا، لیکن پھر وہی آدابِ گفتگو کی زنجیر آڑے تھی۔ ''ہمارے مشرق میں ہزاروں لاکھوں محبتیں ایسے جمود کا شکار ہونے کے باوجود صرف ایک بندھن کی حرمت کی خاطر اپنی طبعی موت کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ جانے یہ ان کی خوش قسمتی ہے یا حرماں نصیبی، لیکن شاید یہ رشتہ کبھی نہ کبھی ایسی قربانی ضرور مانگتا ہے۔'' وہ اپنی پلیٹ میں رکھے آملیٹ کو کانٹے سے اِدھر اُدھر دھکیلتی رہیں، لیکن اُن کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ ''جانتی ہوں، ساری بات شاید اختیار کی ہے۔ کاش میں بھی تمہارے مشرق کی عورت کی طرح بہت سی باتوں پر اختیار رکھنے کے باوجود بے اختیار ہوتی۔'' میں نے تردید مناسب نہیں سمجھی۔ ناشتے کے بعد میں بہت دیر تک سلطان بابا کے کیبن میں ان کے سرہانے بیٹھا رہا۔ انہیں اب بھی خود سے زیادہ میری فکر کھائے جا رہی تھی اور وہ مختلف بہانوں سے مجھ سے وعدہ لیتے رہے کہ میں شہر پہنچتے ہی خود کو کم از کم ایک ہفتے کے لیے ڈاکٹروں کے حوالے کر دوں گا۔ شہر کا ذکر آنے پر ایک دم ہی میرے ذہن میں اس پری کا تصور ابھر آیا، جو اس سارے فسانے کی بنیاد تھی۔ جانے میں اس کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔ میری سانسیں تو اس کے تصور ہی سے تھمنے لگتی تھیں۔ اتنے عرصے بعد اسے اپنے سامنے دیکھ کر جانے میرا کیا حال ہوگا۔ میں جہاز پر سوار ہونے سے قبل ہی رحمٰن صاحب کے ذریعے اپنے گھر اپنی واپسی کی اطلاع کروا چکا تھا اور یقیناً ممانا نے زہرہ کو بھی میری آمد کی اطلاع دے دی ہوگی۔ جہاز کے بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن مجھے ان لمحوں میں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ کبھی کبھی انتظار خود ایک وصل کی لذت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، لیکن اس کیفیت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جو خود کسی طویل ریاضت سے گزر کر اپنی منزل کو بالکل سامنے پا کر بھی خود کو سویرا ہونے تک روکے رکھتے ہیں۔ میں بھی عصر کے بعد عرشے پر بچھی نیلی بان سے بنی آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا دور اسی افق کو دیکھ رہا تھا، جس سے پرے، وہ زہرہ جبیں رہتی تھی، اور انتظار کی اسی لذت کو محسوس کر رہا تھا، جو کسی کسی کا مقدر ہوتی ہے۔ اتنے میں مجھے اپنے عقب سے نتاشا کی آواز سنائی دی۔ ''کیا میں مخل ہو سکتی ہوں؟'' میں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ راحیل صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ نتاشا نے بات شروع کی۔ ''تم نے کبھی محسوس کیا، ہماری زندگی

کی ننانوے فی صد ضروریات کسی نہ کسی تخلیق کار کے ذہن کی مرہونِ منت ہیں۔ سوئی سے لے کر بحری جہاز تک۔ کوئی بھی ایجاد اٹھالو، انسان نے انسان کی سہولت کے لیے، کیا کچھ نہیں کیا۔ بس ایک زیادتی ہوگئی کہ ان سب آسائشوں کے حصول کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے منسلک کر دیا، جسے ہم آج کل پیسا کہتے ہیں۔'' ''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ..... اور شاید جہاں سے پیسے کا عمل دخل شروع ہوتا ہے، وہیں سے تخلیق کے عمل کا خاتمہ شروع ہو جاتا ہے۔ ویسے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ تخلیق یا Creativity خود کو غلطیاں کرنے کی اجازت دینے کا دوسرا نام ہے، جب کہ ''آرٹ'' اپنی غلطیوں میں سے کسی ایک کو جاری رکھنے کو کہتے ہیں۔'' نتاشا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو..... تمہارا یہ حلیہ اور تمہاری باتیں آپس میں بالکل میچ نہیں کرتیں۔ یہ کیا معما ہے؟'' میں مسکرایا۔ ''اگر میں آپ سے کہوں کہ یہ باتیں مجھے یہ حلیہ اختیار کرنے کے بعد ہی سمجھ میں آئی ہیں تو آپ مزید الجھ نہ جائیں..... آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کے اور راحیل صاحب کے درمیان صلح کی کوئی گنجائش نہیں؟ میں نے انہیں ایک بے حد نفیس انسان پایا ہے اور یقیناً وہ آپ سے شدید محبت بھی کرتے ہیں۔'' نتاشا نے گہرا سانس لیا۔ ''صلح وہاں ہوتی ہے، جہاں جھگڑے کی کوئی بنیادی وجہ بھی ہو، اور یہ بھی سچ ہے کہ راحیل جیسا عمدہ اور نفیس انسان بڑی مشکل سے میسر ہوتا ہے، مجھے اس کی محبت پر کوئی شک نہیں ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں جدا ہو رہے ہیں۔ ہماری بیٹی عینی ابھی بہت چھوٹی ہے، لہٰذا ہم یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ وہ شروع میں کچھ عرصہ میرے ساتھ رہے گی اور پھر جب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی، تو آخری چناؤ اس کے ہاتھ ہی میں ہوگا۔'' نتاشا نے جتنی بار اپنا گھر ٹوٹنے کا ذکر کیا تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں ایک خاص دکھ کی لہر محسوس کی تھی۔ مشرق ہو یا مغرب، رشتے ٹوٹنے کی چبھن شاید یکساں ہوتی ہے۔ ''میں جانتا ہوں کہ شاید یہ بہت ذاتی سوال ہوگا، لیکن کیا میں اس جدائی کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' نتاشا نے کچھ دیر توقف کیا، پھر ان کی آواز یوں سنائی دی، جیسے وہ ساحلوں سے پرے بیٹھی ہوں۔ ''وفا..... ہماری جدائی کا سبب وفا ہے۔'' میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ لیکن چپ رہ کر انہیں خود کو مجتمع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ''جو بات میں تمہیں اب بتانے جا رہی ہوں، جانے اس کے بعد تمہارے دل میں میرے لیے رتی برابر بھی عزت باقی رہے گی یا نہیں۔ ہمارے مغرب میں آپس میں ہم آہنگی نہ ہونے پر گھروں کا ٹوٹ جانا ایسی کوئی معیوب بات نہیں رہی، بلکہ اب تو کسی بندھن کے تکلف ہی کو ترک کر دیا گیا ہے، لیکن میں نے ایک مشرقی مرد سے محبت کے بعد شادی کی تھی اور اس کی ہر روایت کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ پھر نہ جانے یہ تیسری ''دراندازِ محبت'' کہاں سے ہمارے درمیان کی دیوار بنتی گئی۔ مجھے امید ہے، تم مجھے دیگر لوگوں کی طرح ایک بے راہ رو مغربی عورت نہیں سمجھو گے۔ سچ یہ ہے کہ میری وفا مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں راحیل کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی سوچوں کے دروازے کسی اور کے تصور پر وا کروں۔ میں نے اسی لمحے راحیل کو بتا دیا تھا کہ شاید میں کسی اور کی کشش کا شکار ہو رہی ہوں اور یہ راحیل ہی کا اعلیٰ ظرف ہے کہ اس نے آٹھ سالہ رفاقت اور شدید محبت کے باوجود فیصلہ میرے اوپر چھوڑ دیا۔ ہم دونوں ہی محبت میں تجدیدِ وفا کے قائل نہیں ہیں..... اور پھر وہ وفا ہی کیا، جسے ''تجدید'' کی ضرورت پڑ جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب محبت فرسودہ ہو کر دامن چھڑانا چاہتی ہے، تب وفا اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے اور محبت کو اس کا راستہ بدلنے نہیں دیتی۔ ننانوے فی صد کیسز میں جیت وفا ہی کی ہوتی ہے، لیکن افسوس میرا مقدمہ 100 سواں تھا۔'' میں چپ کر کے نتاشا کی بات سنتا رہا۔ انہیں اپنا دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے کسی اچھے سامع کی ضرورت شاید بہت عرصے سے تھی۔ ان کی کہانی بھی ہر محبت کی کہانی کی طرح ان کی پہلی ملاقات سے شروع ہوتی تھی۔ راحیل اور نتاشا کی ملاقات پیرس کی ایک نمائش میں ہوئی تھی۔ جہاں راحیل پاکستان سے اپنے ادارے کے ملبوسات کی تشہیر کے لیے آیا ہوا تھا۔ راحیل کی شان دار شخصیت، متانت اور سمجھ داری کے امتزاج نے جلد ہی مشکل پسند اور تنک مزاج نتاشا کے دل میں گھر کر لیا۔ خود نتاشا اٹلی سے فیشن ڈیزائننگ کے کورس کے لیے پیرس آئی ہوئی تھی۔ دو چار ملاقاتوں ہی میں سارے پیمان بندھ چکے، تو راحیل نے اپنے گھر والوں سے فون پر نتاشا کی بات کروائی، کیوں کہ وہ اپنی ماں کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ ماں نے بیٹے کی آواز میں جھلکتی خوشی کو مستقل کرنے کا عندیہ دے ڈالا اور نتاشا راحیل کی ہو گئی۔ دونوں کا شعبہ ایسا تھا کہ انہیں فرانس اور پیرس ہی سب سے زیادہ جچتا تھا، لہٰذا رہائش وہیں رکھی گئی۔ ان کی اکلوتی بیٹی عینی کی پیدائش بھی پیرس ہی میں ہوئی۔ سات سال یوں پر لگا کر اڑ گئے کہ دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ ہاں بس، دونوں میں کبھی ہنستے کھیلتے اختلاف ہوا بھی تو صرف اس بات پر کہ راحیل محبت کے حصول ہی کو محبت کی معراج سمجھتا تھا، جب کہ نتاشا اس حاصل پن کو صرف ایک ابتدا۔ وہ محبت میں جنوں کے سرد ہونے کو منافقت کے طور پر لیتی تھی اور یہیں شاید راحیل سے کچھ چوک ہو گئی اور فرہاد ان کی زندگیوں میں داخل ہو گیا۔ فرہاد ایک ایرانی مصور، جس کی تصویروں کی نمائش پیرس کی ایک بہت بڑی آرٹ گیلری میں لگی ہوئی تھی اور نتاشا کے لاکھ اصرار کے باوجود راحیل نے گھر پر عینی کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دی، جب کہ اس سے قبل راحیل اور نتاشا ایک ساتھ ایسی ہر تقریب میں نہ صرف شرکت کرتے، بلکہ واپس آ کر ہفتوں ان فن پاروں پر بحث کر کے اپنے خیالات بھی بانٹا کرتے تھے، لیکن اس بار نتاشا کو مجبوراً تنہا ہی نمائش دیکھنے جانا پڑا۔ شاید کچھ ''ان ہونیاں'' سدا ہی سے ہماری تاک میں ہوتی ہیں۔ وہ تصویریں بھی کچھ یوں ہی تھیں۔ ایک حادثے کی طرح اچانک اور فن کا ایک عظیم شاہ کار، نتاشا پینٹنگز میں کچھ ایسی کھوئی کہ خود اپنا آپ ہی بھولتی چلی گئی۔ کتنا درد، کتنی پیاس، کیسی گہری کسک تھی ہر تصویر میں، روح میں سے روح نچوڑ لینے والی تاثیر لیے ان رنگوں نے گیلری میں سب ہی لوگوں کو مبہوت کر رکھا تھا۔ اور پھر نتاشا کی نظر فرہاد پر پڑی، وہ کسی شخص کو اپنی کسی تصویر کا عنوان بتا رہا تھا۔ ''کھوج..... اس تصویر کا عنوان کھوج ہے..... لاحاصل کی کھوج..... یوں سمجھ لیں کہ جیسے کوئی اپنے کسی نہایت عزیز اور اس پیارے کے لیے چھلنی میں بھر کر پانی لے جانے کی ایک ناکام کوشش کر رہا ہو، جو اسی کے سامنے شدید پیاس سے دم توڑ رہا ہو یا میدانِ جنگ میں پیاس سے تڑپتے، جان دیتے سپہ سالار کے لیے اس کے کسی وفادار سپاہی کا اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں دو گھونٹ پانی لے کر بھاگنا..... بس کچھ ایسا ہی بیان کرنے کی کوشش کی ہے میں نے اس تصویر میں.....'' نتاشا خاموشی سے فرہاد کی بات سنتی رہی۔ اور یہی وہ ابتدا تھی، جس کی انتہا، آج میرے سامنے کا سابلانکا کے عرشے پر موجود تھی، شروع کے چند ہفتے تو نتاشا کو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ کشش فرہاد کے فن کی ہے یا شخصیت کی۔ وہ راحیل کو بھی اگلے ہفتے وہ نمائش دکھانے لے گئی اور راحیل نے بھی فرہاد کے فن کو خوب سراہا۔ خود فرہاد اس بات سے ہمیشہ بے خبر رہا کہ ان جانے میں وہ کسی کے اندر ہونے والی کتنی بڑی ٹوٹ پھوٹ کا ذمے دار ہے، کیوں کہ نتاشا نے کبھی اسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ نتاشا اس لیے بھی شدید الجھن میں تھی، کیوں کہ اس کے پاس بظاہر ایک اور محبت میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی، لیکن کیا کبھی محبت کو کسی وجہ کی ضرورت رہی ہے؟ کیا محبت کسی عمر کی مرہونِ منت ہوتی ہے؟ نہیں..... دل کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے..... کہ دل کب کسی کا دوست ہوا ہے۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشق حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسب سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

سراپا عشق ہوں میں، اب بکھر جاؤں تو بہتر ہے
جدھر جاتے ہیں یہ بادل، اُدھر جاؤں تو بہتر ہے
یہ دل کہتا ہے تیرے شہر میں کچھ دن ٹھہر جاؤں
حالات کہتے ہیں کہ گھر جاؤں تو بہتر ہے.....
یہاں ہے کون میرا جو مجھے اپنا بھی سمجھے گا
میں کوشش کر کے اب خود ہی سنور جاؤں تو بہتر ہے.....

نتاشا کے حالات سنورنے کے بجائے بگڑتے ہی چلے گئے، حالاں کہ وہ صرف دو مرتبہ ہی فرہاد کی آرٹ گیلری گئی تھی۔ پہلی مرتبہ تنہا اور دوسری بار راحیل کے ساتھ اور اس کے بعد اُس نے کئی ہفتے دوبارہ اس جانب کا رُخ بھی نہیں کیا۔ اُسے راحیل، اپنی بیٹی اور اپنی پُرسکون زندگی ہاتھوں سے پھسلتی نظر آنے لگی۔ یہ محبت ہمارے دلوں پر تب ہی شب خون کیوں مارتی ہے، جب ہم اس کے وار سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں۔ اگر یہی جرم ہمارے مشرق میں کسی عورت سے سرزد ہوا ہوتا، تو طوفان آ جاتا۔ پھر چاہے وہ نتاشا کی طرح یک طرفہ اور بنا اظہار والا جذبہ ہی کیوں نہ ہوتا، لیکن ایک مکمل بربادی عورت کا مقدر ہوتی، لیکن یہ پیرس تھا اور نتاشا ایک اطالوی نژاد فرانسیسی شہری۔ پھر بھی راحیل کے اندر اپنی پرانی اقدار گہری جڑوں تک موجود تھیں اور پھر اسے اب بھی نتاشا سے شدید محبت تھی۔ وہ چاہتا تو چیختا، چلاتا، اُسے بے وفائی کے طعنے دیتا، ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے باہر بھی کر سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو دوسرے کے پلٹ جانے پر اپنی حُرمت ہی کھو دے۔ اپنا وقار، اپنا گریس ختم کر دے۔ راحیل نے ٹھیک اس ڈوبتے جہاز کے کپتان جیسا بھرم قائم رکھا، جس کے سامنے اس کی متاعِ حیات قطرہ قطرہ کر کے ڈوب رہی ہو، لیکن وہ آخری مسافر کو بھی بچانے کی خاطر عرشے پر آخری وقت تک سینہ تانے کھڑا رہے اور جہاز سے بندھی آخری کشتی کے سمندر میں اترنے کے بعد جہاز کے ساتھ ہی غرقاب ہو جائے۔ نتاشا نے بھی مغربی معاشرے کی ایک آزاد عورت ہونے کے باوجود اپنی گم گشتہ محبت کی حرمت قائم رکھی اور آخری وقت تک فرہاد کو اپنے دل و دماغ میں چلتی جنگ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، تاوقت یہ کہ اس نے راحیل سے ہر بات بانٹ نہ لی۔ راحیل کو نتاشا کے اس آخری کڑوے سچ پر بھی مان تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دنیا لٹتے ہوئے زیادہ دیر نہیں دیکھ پائے گا۔ اس نے نتاشا سے آخری فیصلہ کرنے کا کہا۔ نتاشا خود بھی راحیل کو یوں لحہ بہ لحہ ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سو، اس نے خود ہی اپنی فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور خود ہی اپنی سزا بھی طے کر دی۔ عمر بھر کی جدائی کی سزا۔ جب کوئی جج کسی کو عمر قید کی سزا سُناتا ہے، تو وہ اصل میں ملزم کو اس کے پیاروں سے عمر بھر کی جدائی کی سزا ہی تو دے رہا ہوتا ہے۔ سو، نتاشا نے بھی اپنے لیے اک نئے طرز کی ''عمر قید'' چُن لی تھی۔ راحیل نے نتاشا سے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیوپڈ کے وار کا شکار اگر نتاشا کا دل ہوا تھا اور جُرم کی سرزدگی بھی اس کے دل کے سر ہے، تو پھر سزا راحیل کو بھی کیوں مل رہی ہے۔ شاید دلوں کے جرم ہی ایسے ہوتے ہیں کہ کرتا کوئی اور ہے اور بھرتا کوئی اور..... دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کے تیسرے مرکزی کردار فرہاد کو ابھی تک اس بات کی خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کتنی زندگیوں میں طوفان کا باعث بن رہا تھا۔ حالاں کہ اب اس کی نتاشا سے اچھی خاصی پہچان ہو چکی تھی اور وہ اس کے تمام خاندان سے بھی مل چکا تھا، لیکن نتاشا نے راحیل کے کہنے پر بھی اپنے دل کا حال فرہاد پر ظاہر نہیں کیا۔ اُس نے اپنے دل کو سزا دینے کے لیے ایک عجیب جُوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا ظرف اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ راحیل کے ہوتے ہوئے فرہاد کے سامنے، دل کے لٹ جانے کی دُہائی دے اور پھر اگر کسی وجہ سے فرہاد ہی اُسے ٹھکرا دے، تو پھر سے روتی دھوتی راحیل کی زندگی میں واپس آ جائے، لہٰذا اس نے آخری کشتی جلا کر تخت یا تختے کا فیصلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے راحیل کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ جب تک وہ علیحدہ نہ ہو جائیں، تب تک فرہاد کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے کہ ان کی علیحدگی کی وجہ خود اُسی ''مردِ مغرور'' کے ہاتھ سے کینوس پر پھینکے گئے چند رنگ کے چھینٹے ہیں۔ بظاہر ناممکن نظر آنے والی ایسی داستانیں صرف مغرب ہی میں جنم لے سکتی ہیں، کیوں کہ ہمارے ہاں کسی مرد کا ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری محبت میں ''مبتلا'' ہو جانا تو عام سی بات سمجھی جاتی ہے، مگر عورت بے چاری اپنے خواب میں ساتویں عکس سے پرے بھی اگر کسی غیر کی شبیہہ دیکھ لے تو گھبرا کر خود ہی اُٹھ بیٹھتی ہے۔ مشرق میں وفا کے پلڑے کا سارا بوجھ عورت ہی کو پورا کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ یہاں کا مرد اُس ترازو میں تُلتا ہی نہیں، لیکن نتاشا نے مغربی ہوتے ہوئے بھی اپنی وفا کا ایک معیار قائم

رکھنے کی یہ انوکھی کوشش ضرور کی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ راحیل سے علیحدہ ہونے کے بعد فرہاد اُسے اپنائے گا یا اُس کی ساری داستان کو ایک قہقہے میں ختم کر دے گا، کیوں کہ یہ جوا تو صرف نتاشا ہی نے اپنی زندگی کے ساتھ کھیلا تھا۔ فرہاد کی وفا اور محبت تو کبھی اس کھیل سے مشروط ہی نہیں تھی۔ راحیل نتاشا کے اس پاگل پن سے کبھی کبھار اتنا بکھر جاتا کہ اس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر اسے فرہاد کی آرٹ گیلری چھوڑ آئے، تاکہ نتاشا یہ اندھی چال چلنے سے پہلے صرف ایک بار اپنے پتے ضرور دیکھ لے کہ کہیں مات ہی تو اس بازی کا مقدر نہیں؟ لیکن بالآخر راحیل ہی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہاں اُس کی ماں کی طبیعت پاکستان میں مسلسل بگڑتی جا رہی تھی اور اس کی شدید خواہش تھی کہ ایک بار اپنی بہو اور پوتی سے مل لے، کیوں کہ نتاشا شادی کے بعد سے اب تک راحیل کے وطن نہیں جا پائی تھی، لہٰذا راحیل نے اُس سے اس آخری ''ہم سفری'' کی درخواست کی اور طے یہ پایا کہ راحیل کی ماں سے ملاقات کے بعد خاموشی سے وہ دونوں جدا ہو جائیں گے اور اس کی خبر راحیل کی بوڑھی ماں کو کبھی نہیں ہو پائے گی، کیوں کہ وہ یہی سمجھتی رہے گی کہ اس کا بیٹا اور بہو خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئے ہیں۔

نتاشا کی عجیب داستان کا اختتام ابھی باقی تھا، لیکن میں اس رات لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپک سکا۔ کیا محبت دوبارہ بھی ہماری زندگیوں میں پلٹتی ہے، وفا کیا ہے اور اس کی حدیں کہاں تک مقرر ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں جس محبت کے حصول کے لیے پاگل ہوتے ہیں، اپنے دل کے کواڑ دوسروں پر ہمیشہ کے لیے بند کر لیتے ہیں، کیا وہی ہماری ''آخری محبت'' ہوتی ہے۔ کیا ''محبت'' اور ''وفا'' کے معیار بھی ہماری معاشرتی اقدار کے تابع ہوتے ہیں اور ہم صرف انہی کی پیروی ہی کو ان جذبوں کے پرکھنے کا اصل پیمانہ تو نہیں سمجھ بیٹھتے۔ جانے اس ''محبت'' نامی معمے کی کتنی پرتیں، کتنے پہلو اور کتنے زاویے مزید ایسے تھے، جن سے میرا پالا پڑنا ابھی باقی تھا۔ رات بھر سلطان بابا بے حد بے چین رہے اور بار بار اُن کی آنکھ کھلتی رہی۔ مجھے ان کی طرف سے بے حد تشویش تھی اور میں اس پریشانی میں کئی مرتبہ خود اپنی دوائیں لینا بھی بھول جاتا تھا، حالاں کہ مجھے ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اپنے شہر پہنچنے تک مجھے ہر حال میں ان دواؤں کا استعمال جاری رکھنا ہوگا، ورنہ سمندر کے سفر میں میری طبیعت مزید بگڑنے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ میرے دوروں کا دورانیہ ویسے بھی اب طویل تر ہونے لگا تھا۔ اس رات بھی کئی مرتبہ میری رگوں میں جیسے مکمل اندھیرا سا چھانے لگا اور کئی مرتبہ مجھے اپنا سر جھٹک کر اٹھ کے ٹہلنا پڑا، نتیجتاً صبح میری طبیعت نہایت بوجھل تھی اور سر درد سے پھٹ رہا تھا، لہٰذا میں اپنے کیبن ہی میں پڑا رہا۔ سلطان بابا کے کمرے میں نرس ان کی دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی۔ کچھ دیر میں میرے کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے راحیل صاحب کھڑے تھے ''میں مُخل تو نہیں ہوا، دراصل تمہیں ناشتے پر ڈائننگ ہال میں نہیں دیکھا تو تشویش ہوئی۔'' ''جی..... میری طبیعت کچھ بوجھل تھی، اس وجہ سے نیچے نہیں آسکا۔'' انہوں نے فوراً میری نبض دیکھی اور تیز بخار کا خدشہ ظاہر کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دوا لے چکا ہوں۔ انہوں نے تجویز دی کہ مجھے اس حال میں بند کمرے کے بجائے عرشے پر کھلی فضا میں رہنا چاہیے، تاکہ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں میرے تپتے جسم کو کچھ راحت مل سکے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں جہاز کے ڈیک والے حصے میں لکڑی کے پتلے تختوں سے ایک اونچے پلیٹ فارم نما عرشے پر کھڑے تھے۔ آس پاس سفید وردی پر نیلی لکیر والی مخصوص ٹوپی پہنے جہاز کا عملہ صفائی کر رہا تھا اور سیلر مین اطالوی زبان میں کوئی گیت گنگنا رہے تھے۔ راحیل صاحب نے دور بنتی لہروں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''جانتے ہو یہ ملاح اس اطالوی گیت میں کیا گنگنا رہے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ''یہ کہہ رہے ہیں کہ بادبان اونچے کر لو۔ پتوار اور تیز چلاؤ، کیوں کہ ایک بڑا طوفان ہماری تاک میں ہے..... ہمارا ساحل دور ہے اور کپتان کی محبوبہ پھول لیے اس کا انتظار کر رہی ہے۔'' ''آپ کو اطالوی آتی ہے؟'' ''ہاں..... کچھ عرصہ رہا ہوں وہاں..... نتاشا کے گھر والوں کے سامنے بہت پاپڑ بیلنے پڑے تھے مجھے۔ وہاں کی بہت سی رسمیں اب بھی ہم سے ملتی جلتی ہیں۔'' میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ''کیا بادبان اونچے کرنے اور پتوار تیز چلانے سے طوفانوں سے بچا جا سکتا ہے۔؟'' انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے ''نہیں..... طوفان تو آ کر ہی رہتے ہیں، لیکن طوفانوں کے ڈر سے سمندروں کو ویران بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا اور پھر جن کی ناؤ ہی میں چھید ہو جائے، انہیں طوفانوں سے کیا گلہ، گر ڈوبنا ہی مقدر ہے تو، پھر سکون سے بنا کسی آواز کے کیوں نہ ڈوبا جائے۔ شور مچا کے اور واویلا کر کے سمندر کا تقدس پامال کرنے سے کیا فائدہ؟'' میں ان کے چہرے ہی سے ان کے اندر اٹھتے طوفانوں کی ایک جھلک دیکھ سکتا تھا۔ میں نے انہیں پھر ٹٹولا ''آپ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان سکتے ہیں، جو ڈوبنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، وہ طوفانوں کا رخ بھی تو موڑ سکتے ہیں۔'' وہ مسکرائے۔ کتنی گھائل مسکراہٹ تھی۔ ''وہ جس معاشرے میں پلی بڑھی ہے، وہاں محبت کا ہو جانا حادثہ تو ہو سکتا ہے، جرم نہیں اور محبت جرم تب بنتی ہے، جب وہ اپنے ساتھ احساسِ جرم لے کر آئے..... اور پھر یہ دلوں کے سودے ہیں۔ یہاں ڈوبنے والے ہی فاتح قرار پاتے ہیں۔ اس کے دل میں بال آ جانے سے میری محبت پر کوئی فرق پڑے، تو پھر یہ محبت نہیں ''سوداگری'' ہوئی۔ میں صرف اپنے احساس کے ساتھ بھی تو ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ جانتے ہو، محبت جتنی پرانی ہوتی ہے، اتنی ہی خون میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت، پچھلی محبت کا خون میں بسا یہ زہر نچوڑ نہیں سکتی۔'' ''تو پھر آپ خون میں سرایت کی ہوئی اس محبت کو اتنا بڑا جوا کھیلنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔؟ آپ پاکستان میں رہ جائیں گے اور جانے وہاں فرانس میں فرہاد انہیں قبول کرے گا بھی یا ان کے اتنے بڑے قدم اٹھانے پر صرف افسوس کا اظہار کر کے اپنی زندگی میں پھر سے مگن ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے، اُسے پہلے سے کسی اور سے محبت ہو۔ محبت بھلا کب کسی کا انتظار کرتی ہے؟'' میرا لہجہ شاید جذبات کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی تلخ اور بلند ہو گیا تھا، تب ہی ہمارے پاس سے گزرتی ایک بوڑھی خاتون مسافر نے اپنے کالے جالی دار ہیٹ کے نیچے سے ہم پر خشمگیں سی نگاہ ڈالی۔ راحیل صاحب کچھ دیر چپ رہے ''جو انتشا نے کھیلا ہے، لیکن بازی میں نے بچھائی ہے۔ میں اپنی ہم سفر کو اس کی زندگی کے سب سے مشکل سفر میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں، دو دن بعد ہم جس بندرگاہ پر اُتر رہے ہیں، وہاں فرہاد پہلے سے موجود ہوگا۔'' میرے پاؤں تلے سے جیسے کسی نے عرشے کا تختہ کھینچ لیا اور مجھے یوں لگا، جیسے میں دھڑام سے سمندر میں جا گرا ہوں۔ راحیل صاحب میری کیفیت سے بے خبر مجھے تفصیل بتاتے رہے کہ کس طرح پیرس میں جب وہ نتاشا کی ضد کے آگے ہار مان گئے اور انہوں نے اُسے آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تب انہوں نے نتاشا کی سب سے قریبی دوست سونیا سے رابطہ کیا۔ سونیا، نتاشا کی کلاس فیلو بھی رہ چکی تھی، لہٰذا راحیل اور نتاشا کی علیحدگی کا سُن کر وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ نتاشا سے لڑنا چاہتی تھی، مگر راحیل نے بڑی مشکل سے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یہ خبر کسی طریقے سے فرہاد تک پہنچا دے کہ راحیل اور نتاشا آپس کی ان بن اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ راحیل نے سونیا کو سختی سے تاکید کی کہ نتاشا کا بھرم کبھی نہ ٹوٹنے پائے اور فرہاد کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ نتاشا راحیل سے کیوں جدا ہو رہی ہے۔ سونیا کو فرہاد کے سامنے یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنی عزیز از جان سہیلی کے

لیے بہت پریشان ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اگر فرہاد پر پہلے سے کسی وعدے یا رشتے کا بوجھ نہیں ہے، تو وہ نتاشا کو اپنا لے۔ راحیل نے سونیا کو یہ پیغام دے کر فرہاد کے پاس تو بھیج دیا، لیکن خود انگاروں پر لوٹتا رہا۔ دنیا میں بھلا کون ہوگا، جو کسی لٹیرے کو خود مدعو کرے کہ ''آؤ اور میری متاعِ حیات لوٹ کر چلتے بنو.....''

دوسرے دن جب سونیا نے راحیل کو آ کر یہ بتایا کہ پہلے پہل تو فرہاد ان کی جدائی کے صدمے سے سنبھل ہی نہیں پایا، کیوں کہ وہ نتاشا کے پورے خاندان سے واقف تھا اور اسے ایک فرد کی حیثیت دی جاتی تھی، پھر اس نے سونیا سے التجا کی کہ کیا وہ نتاشا کی ذاتی زندگی میں دخل دے کر اسے سمجھا سکتا ہے، لیکن جب سونیا نے اُسے نتاشا کے بھرم کی قسم دی، تو اس نے سونیا کو بتایا کہ وہ ہمیشہ راحیل کی قسمت پر رشک کرتا آیا ہے، کیوں کہ نتاشا جیسی ہم سفر قسمت والوں ہی کو ملتی ہے اور اس نے سونیا سے کہا کہ وہ نتاشا کو اپنانا اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتا۔ یہ سب سن کر راحیل کا دل آخری بار دھڑک کر جیسے بند ہو گیا، شاید کہیں دور اس کے دل میں اب بھی یہ امید تھی کہ فرہاد نتاشا کو کسی وجہ سے اپنا نہ پائے، مگر اب تو کہانی ہی ختم ہو چکی تھی۔ نتاشا کو اس واردات کی خبر نہیں تھی کہ فرہاد کو سونیا نے پہلے ہی جہاز کے ذریعے ہمارے شہر بھیج دیا ہے اور راحیل اسے بندرگاہ ہی پر الوداع کہہ دے گا، البتہ ماں سے کیا بہانہ کرنا ہے، وہ بعد کی بات تھی۔ دنیا کا سب سے مشکل کام شاید اپنی محبت کو خود اپنے دل میں پل پل مرتے دیکھنا ہے اور اس سے بھی مشکل خود اسی محبت کی لاش کو اپنے دل میں دفن کرنا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ایک ایسا ہی شخص کھڑا تھا، جو اپنی محبت کے لیے اپنے دل میں گڑھا کھود چکا تھا اور اب صرف اُسے دفنانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے حبیب البشر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ جانے والے سبھی حاجیوں سے انہوں نے میرے لیے دعا کرنے کا وعدہ لیا ہے۔ انہیں شاید جہاز کے طبی مشن سے میری ناسازیٔ طبیعت کا بھی پتا چل گیا تھا۔ وہ بہت دیر میرے ساتھ عرشے پر بیٹھے رہے۔

عشاء کے بعد جب ان کے جانے کا وقت ہوا، تو مجھے اوپر والے چوبی ڈیک پر جہاز کی آخری ریلنگ کے پاس نتاشا نظر آئی۔ عام طور پر جہاز کا عملہ کسی مسافر کو مغرب کے بعد اتنی اونچائی پر کھڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتا، کیوں کہ کوئی بھی بڑی لہر انسان کا توازن بگاڑ کر اُسے بیچ سمندر میں پھینک سکتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو خود نتاشا کے ارادے بھی مجھے کچھ بدلے سے نظر آئے۔ میں جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ان کے قریب پہنچا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ پلٹیں ''کہیں آپ نے کسی شارک مچھلی کے ساتھ ڈنر کا وعدہ تو نہیں کر رکھا؟'' وہ مسکرائیں ''نہیں! میری شارک مچھلیوں سے کبھی اچھی سلام دُعا نہیں رہی.....'' ہم دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے لہروں کو گنتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا ''تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے عبداللہ؟'' ''نہیں..... میں ابھی محبت کے ''م'' اور عشق کے ''عین'' تک بھی نہیں پہنچ پایا اور پھر سچ یہ ہے کہ آپ سے ملنے کے بعد تو مجھے اپنے جذبے کو پھر سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔'' ان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''کیوں؟'' میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا ''آپ سے ملنے کے بعد میں نے یہ جان لیا ہے کہ ہماری جستجوؤں کا کوئی اختتام نہیں ہوتا، شاید محبت کی بقا صرف اس کے لاحاصل رہنے ہی میں ہے۔ جسے پا لیا جائے، شاید وہ محبت نہیں رہتی، ورنہ انسان کا دل اس معراج کو پا لینے سے پھر سے خاک میں کیوں لوٹتا؟ رشتوں کے نیلے بھنور بھی جب محبت کی سنہری کمند کو نئی فصیلوں پر اٹکنے سے نہیں روک پاتے، تو پھر ہم ایک نیا گلیہ کیوں نہ ایجاد کر لیں؟'' نتاشا کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔ ''کیسا گلیہ؟'' میں نے مُڑ کر دیکھا ''یہی کہ ہم اپنی زندگی کی سب سے پہلی اور شدید محبت کو اس شرط سے متصل نہیں رکھ سکتے کہ خود ہم بھی اس کے لیے آخری محبت ہی ثابت ہوں گے، بلکہ ہمیں یہ گنجائش بھی رکھنی ہوگی کہ خود ہمارا دل بھی پلٹ سکتا ہے، تو پھر ایسی پلٹ جانے والی چیز کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے ایک نئی راہ دکھا دی۔'' نتاشا کی آواز میں بے چینی تھی ''لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جو واردات میرے دل کے ساتھ ہوئی ہے، وہ سب ہی کے ساتھ ہو۔ تم اپنا نظریہ کیوں بدل رہے ہو۔ یہ صرف میری بدبختی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' میں نے آخری وار کر دیا ''تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سیاہ نصیبی پھر سے اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی؟'' ''کیا مطلب؟'' ''مطلب یہ کہ جس راستے پر آپ چل رہی ہیں، وہ تو سدا کا بے نشان و منزل ہے۔ کل تک راحیل آپ کی پہلی محبت تھے۔ آپ کا ہر خواب اُن سے وابستہ تھا، لیکن آج آپ کو اپنا من فرہاد کی جانب کھنچتا محسوس ہوتا ہے۔ ایک اجنبی آپ کے تمام خوابوں پر قابض ہو بیٹھا، تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کل یہ من اپنے دھاگے کہیں اور نہیں الجھا بیٹھے گا؟'' نتاشا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ''لیکن تم.....؟'' میں صرف اتنا سمجھ پایا ہوں کہ بات اگر دل کے اختیار پر چلنے کی ہے، تو پھر ہمارا ایک شاعر صدیوں پہلے کہہ گیا تھا کہ ''دل پر زور نہیں'' آپ جس ماحول میں پلی بڑھی ہیں، اُس معاشرے میں انسان کی آخری سانس تک، ایسے دل کش ہیولے اس کا دل کھینچنے کے لیے اس کے آس پاس بھٹکتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی فلم اسٹار، کبھی کوئی کھلاڑی، کبھی کوئی سنگر..... تو پھر آپ کے گلیے کے حساب سے ایک پل کا سکون ملنا بھی محال ہوگا۔ انسان کی ذات اندر سے جن سیکڑوں، ہزاروں خانوں میں بٹی ہوئی ہے، دوسرا کوئی بھی ایک انسان ان سب خانوں کے خلا کو بھرنے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتا۔ یہ کسی فردِ واحد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ہم خود بھی کسی دوسرے کے بنائے ہوئے ہیولے کا صرف پندرہ یا بیس فی صدی ہی پورا کر پاتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان مشہور لوگوں (سیلیبریٹیز) میں اپنے من کے بنائے خاکے کی خوبیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے راحیل کے من کے ہیولے کو ٹٹولا ہے۔ ہو سکتا ہے، خود آپ بھی اس کے اندر کی شبیہہ کا صرف پانچ فی صدی ہی پورا کرتی ہوں۔'' نتاشا نے چونک کر میری جانب دیکھا ''لیکن راحیل نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا، ورنہ یقین کرو، میں اس کے من کے اندر موجود ہر تصویر کو اس کے سامنے لا کھڑا کرتی۔ میں اُس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' ''کتنی تصویریں جمع کر پاتیں آپ؟ اور کیا انسان ساری زندگی انہی سرابوں کے پیچھے بھاگتے ہی گزار دے اور آخر میں خود ایک ہیولہ بن کر رہ جائے۔ کیا یہی مقدر ہے ہم مجبور اور بے کس انسانوں کا، جنہیں زندگی تو صرف ایک ملتی ہے، مگر خواہشیں ہزار صدیوں کے وزن جتنی۔'' نتاشا کی طرف سے بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر جب وہ بولی تو آواز سمندر کے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔ ''پھر ان ہزار صدی کی خواہشوں کا کیا ہو، دل پر قفل کیسے لگایا جائے؟'' میں نے ان کی جانب دیکھا ''اگر اس دل نے ہمارے ساتھ ہر حاصل کو خاص سے عام کرنے کا کھیل رچایا ہوا ہے، تو پھر ہمیں بھی اس کے لیے کسی ایک کو ہمیشہ کے لیے ''لاحاصل'' رکھ چھوڑنا چاہیے، تاکہ وہی ''لاحاصل'' اس کی آخری چاہت ثابت ہو۔ ہم اگر کسی ضدی بچے کی طرح اس دل کی ہر بات مانتے گئے اور اس کی پسند کا ہر کھلونا اس کی جھولی میں ڈالتے رہے، تو پھر یہ بھی اُس بچے کی طرح چند دن کھیل کر اس کھلونے کو پرانا کر دے گا یا دل اوب گیا، تو توڑ دے گا اور پھر سے کسی نئے کھلونے کے لیے مچلنے لگے گا، تو کیوں نہ اسے ہمیشہ کے لیے ایک کھلونے کی آس ہی میں منتظر چھوڑ دیا جائے..... تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے لیے ''خاص'' رہے.....''

میں نتاشا کو سوچوں کے بھنور میں چھوڑ کر نیچے کیبن میں چلا آیا۔ اگلی شام جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کے لیے اپنی رفتار دھیمی کر چکا تھا۔ میرے سامنے وہی ساحل بانہیں کھولے کھڑا تھا، جس کی ایک درگاہ پر نظر آئی ایک جھلک اور جلوے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ دور سے میں نے ممتا اور پپا کو میزبانوں والے حصے کی جالی کے پرے دیکھا۔ ان کی نظر ابھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی، لیکن مجھے زہرہ کا دھانی آنچل تو ہمیشہ پہلی نظر میں نہار جاتا تھا، مگر کیوں آج ابھی تک میری نظر اُسے ڈھونڈ نہیں پائی تھی۔ جہاز بندرگاہ پر لگ گیا۔ ہم سب ایک ایک کر کے سیڑھیاں اُتر کر زمین پر قدم رکھتے گئے۔ راحیل کے بعد اس کی بچی کھچی اور پھر نتاشا نے آخری سیڑھی کو الوداع کہا۔ دفعتاً نتاشا کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ایک سجے سنورے شخص پر پڑی اور اُس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ میرے دل نے دھڑک کر مجھ سے کہا ''فرہاد.....''

(جاری ہے)

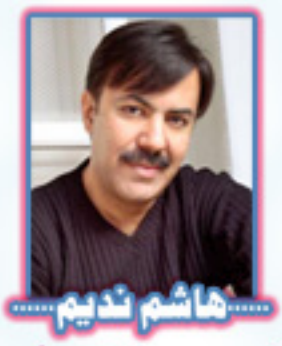

.....ہاشم ندیم.....

اِک خاک بسر نوجوان کا فسانہ..... جو خدا کو اپنی شہ رگ سے کچھ دور تلاش رہا تھا

''عبداللہ'' ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار، ہاشم ندیم کا تیسرا ناول ہے۔ یہ جنگ ''سنڈے میگزین'' ہی میں چھپنے والے ناول ''عبداللہ'' کا سیکوئیل ہے۔ اس سے قبل ہاشم ندیم کے دو ناول ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' بھی چھپنے کے بعد، بین الاقوامی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق ''عبداللہ'' دورِ حاضر کا بے حد مقبول و معروف، سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے نوجوان کی سرگزشت ہے، جو اپنے مجازی عشق کی تلاش میں ایک ایسی راہ پر چل نکلتا ہے کہ جہاں اسے ہر نئے دن، عشقِ حقیقی کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ ناول کا خاکہ حسبِ سابق اُنہی اسرار و رموز کے گرد بُنا گیا ہے، جن سے عام زندگی میں تقریباً ہر انسان کا واسطہ پڑتا تو ہے، لیکن ہر ایک پہ یہ راز کھلتے نہیں۔ اسی متوازی دنیا کے سربستہ بھیدوں سے پردہ اٹھانے کے لیے پڑھیے، ''عبداللہ'' ایک نئے آغاز، پرانے تسلسل، کچھ مختلف انداز، نئے سب ٹائٹل کے ساتھ..... آپ کی سہولت کے لیے ناول کی ایک علیحدہ ای میل آئی ڈی بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ ناول نگار سے براہِ راست بھی مخاطب ہو سکتے ہیں۔

novelabdullah@janggroup.com.pk

میں نے بھی نتاشا کی نظروں کے تعاقب میں نگاہ ڈالی۔ وہ یقیناً فرہاد تھا۔ اس کے انداز میں جو ایک خاص لاپروائی تھی اور اس کے سفید لباس پر جچتی نیلی پی کیپ اسے دور ہی سے کوئی مصور بتا رہی تھی۔ یہ تخلیقی کاموں سے تعلق رکھنے والے ایک جیسے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ وہ عمر میں نتاشا سے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ نتاشا ابھی تک شاک کی کیفیت سے نہیں نکل پائی تھی۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی ''فرہاد..... تم..... یہاں.....؟'' فرہاد مسکراتے ہوئے اس کی جانب بڑھا ''ہاں مجھے سونیا سے پتا چلا کہ تم پاکستان آ رہی ہو۔ اتفاق سے میری بھی ایک تصویری نمائش ہے، اسی شہر کی آرٹ گیلری میں۔ سوچا تمہیں سرپرائز دے کر حیران کر دوں۔'' نتاشا ابھی تک کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ راحیل کی آنکھیں نم ہونے کو تھیں، مگر وہ ضبط کیے کھڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر نتاشا سے کہا ''چلیں..... آپ کا کام آسان ہو گیا، لوگوں کو خواب دیکھنے کے لیے رات بھر آنکھیں بند کر کے نیند کا محتاج ہونا پڑتا ہے، جب کہ آپ کا خواب خود چل کر آپ کے پاس آ گیا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اب اپنے سپنے کے ساتھ ہی لوٹ جائیں۔ خوابوں کو جینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ سہانے خوابوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔'' اتنے میں راحیل نے بھی تائید کی ''عبداللہ ٹھیک کہہ رہا ہے نتاشا! میں اپنی ماں کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم یہاں تک میرے ساتھ آئیں۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اب یہاں سے آگے ہمارے راستے جدا ہیں۔ نتاشا شاید سمجھ گئی تھی کہ فرہاد کی یہاں آمد کے پیچھے کیا مقصد کارفرما ہے۔ اس کے بدن پر جیسے ایک لرزہ سا طاری تھا، وہ کسی پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور اپنی لرزاہٹ چھپانے کی کوشش میں اس کا وجود مزید ریت ہوا جا رہا تھا۔ راحیل نے عینی کا ہاتھ پکڑا اور مخالف سمت میں قدم اٹھائے۔ عینی نے حیرت سے اپنی ماں کو وہیں جمے دیکھا اور پھر اسے جاتے جاتے آواز دی ''مما'' نتاشا کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ جلدی سے پلٹ کر چلائی ''رک جاؤ راحیل'' راحیل کے قدم جم گئے، لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نتاشا تیزی سے میری جانب بڑھی ''کل رات تم نے ٹھیک کہا تھا۔ دل جیسے ضدی بچے کی بات سنی جائے، تو ہماری محبتوں کا کبھی اختتام نہ ہو، تو پھر کیوں نہ کسی ایک کو اپنی ''آخری محبت'' بنا لیا جائے۔ میرے رشتوں کے نیلے بھنور نے آج ہمیشہ کے لیے وہ سنہری کمند توڑ ڈالی ہے، جو آس پاس بکھرے ہزاروں دل کش ہیولوں کی فصیل پر ہر بار اپنی کنڈی اٹکا بیٹھتی ہے۔ میں پیرس واپس جانے سے پہلے تم سے ملنے ضرور آؤں گی عبداللہ، اس ''تجدیدِ وفا'' کا شکریہ ادا کرنے کے لیے، لیکن تم بھی مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ اپنا نظریہ کبھی نہیں بدلو گے، کیوں کہ آج سے میرا بھی یہی نظریہ ہے اور میں یہ پیغام ہر محبت کرنے والے تک ضرور پہنچاؤں گی۔'' میں نے مسکرا کر اس نئی نتاشا کو دیکھا۔ ''ہر محبت آخری محبت ہوتی ہے اور آخری محبت بن کر ہی نازل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا، تو شاید ہم کبھی محبت میں مبتلا ہی نہ ہو پاتے۔ محبت سورج کی کرنوں کی طرح درزوں سے چھن کر ہمارا آس پاس منور کر سکتی ہے، مگر محبت کو کسی بھی شرط سے متصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بندھن اور رشتے خود محبت کے آخری ہونے کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ محبت کے ہزاروں سورج ہیں، مگر ہمیں بس اپنے حصے کے ایک آفتاب ہی کی روشنی سمیٹنی ہوتی ہے، لیکن سورج کی طرح چمکنے کے لیے پہلے اس کی طرح جھلسنا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ آج آپ بھی تپ کر کندن بن چکی ہیں۔ جائیے..... آپ کی محبت کا سورج آپ کا انتظار کر رہا ہے۔'' نتاشا نے میرے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں دور کھڑے راحیل کی جانب دیکھا۔ فرہاد کو سنانے کے لیے اس بار میں نے انگریزی میں بات کی تھی۔ نتاشا پلٹنے سے پہلے فرہاد کی طرف بڑھی۔ ''تمہارا بہت شکریہ فرہاد کہ تم میرا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آئے، لیکن ابھی مجھے جانا ہے، راحیل کے ساتھ۔ ہاں البتہ اپنی نمائش کا دعوت نامہ ضرور بھیجنا۔ میں، راحیل اور عینی نمائش دیکھنے ضرور آئیں گے اور تم سے اچھی سی ٹریٹ بھی لیں گے، یہ وعدہ رہا.....'' نتاشا نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور فرہاد کو یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر راحیل کے سنگ آگے بڑھ گئی۔ کافی دور جا کر اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ راحیل صاحب نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ ان کی ایک نگاہ ہی سارا خراج ادا کرنے کے لیے کافی تھی اور پھر اگلے لمحے وہ تینوں بندرگاہ کی بھیڑ میں غائب ہو چکے تھے۔ فرہاد بھی تھکے تھکے قدموں سے پلٹ گیا۔ اسے اپنی محبت کے سورج کے لیے ابھی کچھ اور آسمان چھاننا باقی تھے۔ میں سلطان بابا کے لیے آئے کرین اسٹریچر کے ذریعے انہیں لے کر نیچے اترا ہی تھا کہ پپا کی ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ ''ساحر..... ہم یہاں ہیں.....'' پپا کے ساتھ مما بھی کھڑی تھیں، لیکن ان کی آواز ان کے بہتے آنسو پہلے ہی گھونٹ چکے تھے۔ میں لپک کر ان کے قریب پہنچا اور پھر ہم تینوں ہی ایک دوسرے کو چپ کراتے کراتے رو رہے تھے۔ میں قریباً چھ ماہ

کے بعد ان سے مل رہا تھا اور مما بار بار میرا چہرہ اپنے ہاتھوں سے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں، جیسے انہیں اب تک یقین نہ آ رہا ہو کہ میں واقعی ان کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ مائیں سدا سے اولاد کے معاملے میں اتنی بے یقین کیوں ہوتی ہیں۔ اتنی دیر میں ایمبولینس بھی بندرگاہ کے مرکزی داخلے سے ہوتی ہوئی مقررہ جگہ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی کہ اب مزید کوئی دیر کیے بنا سلطان بابا کو بڑے اسپتال پہنچا دیا جائے۔ میری آنکھیں بار بار میزبانوں کی گیلری کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جتنی دیر میں سلطان بابا کو ایمبولینس میں منتقل کیا گیا، تب تک میں شاید سیکڑوں بار اس جانب دیکھ چکا تھا، جہاں سے اس ناز آفریں کو آنا تھا، لیکن وہ راستہ اتنے زیادہ ہجوم کے باوجود میرے لیے سنسان ہی رہا۔ مما پپا دونوں میری بے چینی بہت اچھی طرح بھانپ چکے تھے، لیکن نہ جانے کیوں دونوں ہی چپ سے تھے۔ بالآخر میں نے مما سے پوچھا ہی لیا کہ زہرہ کیوں نہیں آئی؟ مما نے بتایا کہ انہوں نے میرے آنے کی خبر اسی دن زہرہ کے گھر والوں تک پہنچا دی تھی، جس دن انہیں پتا چلا تھا، پھر بھی زہرہ میرے استقبال کو نہیں آئی..... کیوں؟

سلطان بابا کو اسپتال لے جاتے ہوئے بھی میرے اندر خود ہی سوال اٹھتے رہے اور میرا نادان دل خود ہی ان وسوسوں کے جواب اور جواز تراشتا رہا۔ ہوسکتا ہے، اسے ٹھیک خبر ہی نہ ملی ہو۔ یا ہوسکتا ہے، وہ کہیں بھیڑ ہی میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ یہ بڑے شہروں کا ٹریفک بھی تو کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے بندرگاہ سے نکلتے ہی وہاں پہنچ گئی ہو۔ ہم بھی تو سلطان بابا کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائے تھے۔ وہ آئی ہو اور مجھے وہاں نہ پا کر کتنی پریشان ہوئی ہوگی۔ میرا ذہن کسی ایک خدشے کا سر ابھارتا تو میرا سودائی دل اس کے سو عذر تراش کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ محبت ہمیں کتنے بہانے بنانا سکھا دیتی ہے۔ بندرگاہ سے نکلنے سے پہلے میں خاص طور پر عرشے پر کھڑے حبیب البشر صاحب سے ملنے کے لیے اوپر گیا۔ وہ مجھے بہت دیر تک گلے لگائے تھپکتے رہے اور میرے شانے ان کی پلکوں سے نم ہوتے رہے۔ آتے وقت انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے سے بولے ”ہم اگر اس کی جانب ایک قدم بڑھاتے ہیں، تو وہ ہماری جانب ستر قدم آتا ہے۔ یقین جانو، تم اس کے بہت قریب ہو، میں جتنی بار بھی اس کے گھر پر نگاہ ڈالوں گا، میرے دل سے تمہارے لیے دعا ضرور نکلے گی اور مجھے یقین ہے، ایک دن تمہاری کھوج ضرور اپنے انجام کو پہنچے گی۔“ میں اپنے خیالات سے تب چونکا، جب ایمبولینس اسپتال کے ”انتہائی نگہداشت“ کے شعبے کی پارکنگ میں جا کر رک گئی۔ مما پپا بھی اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ ہی پہنچ چکے تھے اور اگلے چند لمحوں میں ہم سلطان بابا کو علیحدہ کمرے میں منتقل کر چکے تھے، جہاں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم ہماری منتظر تھی۔ سلطان بابا نے نیم غنودگی کے عالم میں ایک دو بار مجھ پر نگاہ ڈالی اور پھر دواؤں کے اثر تلے ان کی پلکیں جھپکتی چلی گئیں۔ ہمیں بڑے معالج کی ہدایت پر باہر انتظار کرنے کا کہا گیا۔ پپا چاہتے تھے کہ میں کچھ دیر کے لیے گھر سے تازہ دم ہو آؤں، تب تک وہ اسپتال میں ٹھہرتے، لیکن میں نے منع کر دیا اور ہم دونوں نے تقریباً زبردستی مما کو گھر واپس بھیجا، کیوں کہ انہیں اسپتال کے ماحول اور ارد گرد ہوتی ان ہونیوں سے ہمیشہ ہی خوف آتا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ سلطان بابا کی طبیعت سنبھلتے ہی میں کچھ دیر کے لیے گھر ضرور آؤں گا اور پھر ہم سب رات کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔ وہ بادل نخواستہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں وہاں سے چلی تو گئیں، لیکن تقریباً ہر قدم ہی پر مڑ کر انہوں نے مجھ سے میرے عہد کی تجدید ضرور چاہی۔ دنیا کا کوئی بھی فرد اپنے ماں باپ کا قرض نہیں چکا سکتا۔ یہ وہ سودا ہے، جو سود در سود ہر پل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور شاید اس جہان کا یہ واحد ادھار ہے، جس کی ادائیگی کیے بنا ہی ہم سب یکے بعد دیگرے الوداع کہتے جاتے ہیں۔

مما کے جانے کے بعد میں نے کافی وقفے سے مناسب الفاظ میں پپا کو اپنی بیماری کے بارے میں بھی بتا دیا اور میری توقع کے مطابق وہ میرے لاکھ سہل انداز اور تسلی کے باوجود ایک دم ہی گھبرا سے گئے۔ اگر سلطان بابا کی طبیعت کا خیال نہ ہوتا، تو وہ اسی وقت مجھے بھی اسی اسپتال میں داخل کروا دیتے۔ پھر بھی جب تک میں نے ان سے وعدہ نہیں کر لیا کہ اگلی صبح سب سے پہلے میں اپنے تمام معائنے خود ان کی نگرانی میں کرواؤں گا، تب تک وہ چین سے نہیں بیٹھے اور راہ داری ہی میں ٹہلتے رہے۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ جب تک میں اپنے گھر میں تھا اور مما پپا کے لاڈلے کے طور پر ان کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، تب تک مجھے کبھی پپا کے اندر سلطان بابا جیسی بزرگانہ جھلک نظر نہیں آئی تھی، لیکن آج میرے سامنے ماتھے پر بل ڈالے، بڑبڑاتے اور مجھے ڈانٹتے ہوئے ٹہلنے والا یہ شخص مجھے اپنے پپا سے زیادہ اپنا بزرگ دوست لگ رہا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ بزرگی کا تعلق صرف انسان کی عمر بڑھنے سے نہیں ہوتا۔ نہ ہی صرف عقل و دانش اس کی وجہ ہوتی ہے۔ ”بزرگ“ کچھ اس سے بڑھ کر، کچھ ہوا ہوتا ہے۔ پپا ہی نے مجھے میرے جگری دوست کاشف کے بارے میں بتایا کہ وہ ان دنوں کسی کاروبار کے سلسلے میں لندن گیا ہوا ہے۔ وہ میرے اندر کی بے چینی سے خوب واقف تھے، لہٰذا مختلف بہانوں سے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن میرے ذہن کی جو کنڈی اس زہرہ جبیں کی پلک کے خم میں اٹک چکی تھی، اسے شام ڈھلے تک اس کی مسلسل غیر موجودگی کے تمام جواز بھر بھرے ہوتے نظر آئے۔ اگر کسی وجہ سے وہ بندرگاہ پر میرے استقبال کے لیے نہیں پہنچ سکی، تو پھر بھی اب تک اسے مجھ تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے شہر میں اترے سات گھنٹے ہو چکے تھے، لیکن اس کی طرف سے کوئی پیام، کوئی رقعہ، کوئی سندیسہ تک موصول نہیں ہوا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں تحصیل ماہی کے مجذوب کی آواز گونجی ”جا..... تجھے خدا ملے گا، نہ ہی وصالِ صنم.....“ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا، ٹھیک اسی لمحے سلطان بابا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سب ہی ڈاکٹر ایک ایک کر کے باہر نکل آئے۔ میں لپک کر ان کے سربراہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچھ فکر مند سے تھے ”آپ ان سے مل سکتے ہیں..... لیکن دھیان رہے کہ انہیں آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ سر پر گہری چوٹ لگنے کے بعد مسلسل آرام نہ کرنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئی ہیں۔ بہر حال مایوسی کفر ہے..... ہمیں ایک آدھ دن ہی میں بڑا آپریشن کرنا ہوگا۔“ میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں اور پپا کمرے میں داخل ہوئے تو آہٹ سن کر بابا نے آنکھیں کھولیں اور مسکرائے، لیکن ان کی آواز میں نقاہت نمایاں تھی ”تم نے پھر ایک بار اپنی ضد پوری کر لی نہ میاں..... اب یہ ڈاکٹر دن رات تمہیں ڈراتے رہیں گے، حالاں کہ ان کے ہاتھ میں شفا تو ہوسکتی ہے، لیکن ”جزا“ نہیں۔ قضا اور جزا کا اختیار صرف اس کے پاس ہے۔ جتنی سانسیں لکھوا کر لائے ہیں۔ وہ تو بہر حال کاٹنی ہی ہیں۔“ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا ”بات اگر سانسوں کی گنتی کی ہے، تو پھر مجھے وہ کلیہ بھی آج بتا ہی دیں، جس کے ذریعے میں اپنی باقی ماندہ سانسیں بھی آپ کے حساب میں منتقل کروا سکوں۔“ انہوں نے میری بھیگی پلکیں پونچھیں۔ ”زندگی صرف سانسوں ہی میں نہیں بانٹی جاتی، تم نہیں جانتے، تم مجھے کتنی زندگی دے چکے ہو اور ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی ہمیشہ سانسوں ہی سے منسلک نہیں ہوتی۔ ایک سفر ختم ہوگا تو دوسرا

شروع ہو جائے گا۔'' پپا نے دھیرے سے میرے کاندھے کو دبا کر مجھے یہ احساس دلایا کہ مجھے سلطان بابا کو آرام کا موقع دینا چاہیے۔ میری آنکھیں بہتی رہیں۔ جانے ہم اپنے سب سے زیادہ عزیز رشتوں سے ہمیشہ یہ توقع کیوں لگا بیٹھتے ہیں کہ وہ ہم سے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ میرا دل اور ذہن کسی طور پر بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ ''بزرگِ دانش'' بھی باقی سب کی طرح ایک دن اپنی پلکیں موند کر گہری نیند کی چادر اوڑھ کر چلتے بنیں گے۔

عشاء کے بعد رات کی ڈیوٹی والی نرس نے ہمیں یاد دلایا کہ اسپتال کے قوانین کے مطابق کوئی ایک تیماردار ہی وہاں رات گزار سکتا ہے اور وہ بھی سلطان بابا کے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں۔ مجھے مما سے کیا گیا وعدہ یاد تھا، سو، میں سلطان بابا کو آرام کرتا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے پپا کے ساتھ گھر چلا آیا۔ وہی مانوس دیواریں، وہی جانی پہچانی سی خوش بو..... وہی مما کی اپنی اپنی سی نوکروں کو ڈانٹنے کی آوازیں، وہی دیواروں سے لپٹی بیلیں، شاید اگلی زندگی میں جسے جنت سے بھی بڑھ کر کسی کو کچھ عطا کرنے کا فیصلہ ہوا، تو اسے واپس اپنے ہی گھر بھیج دیا جائے گا۔ میرا کمرہ بھی بالکل اسی طرح ''بکھرا'' ہوا تھا، جیسے میں اپنی عادت کے مطابق اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید مما نے میرے جانے کے بعد کسی کو میرے کمرے میں داخلے کی اجازت ہی نہیں دی ہوگی۔ میرے پرفیومز، سی ڈیز، سن گلاسز، سوئٹس، میوزک سسٹم اور ذاتی تھیٹر..... سبھی کچھ ویسا ہی تو تھا، حتیٰ کہ میرے کف لنکس اور ٹائی پنز بھی اسی طرح اپنی جگہ پر پڑی تھیں۔ ایک پل کے لیے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنا کمرا چھوڑ کر کسی دوست کے پاس گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آوارہ گردی کر کے واپس لوٹ آیا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے کے فون سے زہرہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف بجتی ہر گھنٹی پر میرے دل کی دھڑکن اتھل پتھل ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا، جیسے وہ گھنٹی دوسری جانب کے فون کے بجائے میرے اپنے من مندر میں بج رہی ہو، لیکن بہت دیر بجنے کے باوجود دوسری جانب سے فون نہیں اٹھایا گیا۔ زہرہ موبائل استعمال نہیں کرتی تھی اور اس ایک رابطہ نمبر کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی اور نمبر بھی نہیں تھا۔

کھانے کے دوران بھی میرا دھیان اسی جانب اٹکا رہا۔ مما نے آج کھانے پر پچھلے تمام مہینوں کی کسر ایک ہی بار نکالنے کی ٹھان رکھی تھی۔ مجبوراً مجھے ان کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھانا پڑا۔ مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر پپا نے تجویز پیش کی کہ ہم تینوں کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے زہرہ کی طرف بھی ہو آتے ہیں، لیکن مجھے اس وقت وہاں جانا کچھ معیوب سا لگا اور پھر ویسے بھی مجھے واپس اسپتال پہنچنا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ پپا مزید اصرار کرتے، اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی، میں اندر تک جھنجھنا اٹھا، لیکن دوسری جانب کی بات سنتے ہی مما کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ''کیا..... اوہ..... اچھا..... جی جی..... لیکن کس اسپتال میں..... اچھا ٹھیک ہے.....'' مما نے فون رکھا اور اپنی سانس درست کرنے کی کوشش کی'' زہرہ کی گاڑی تلے کوئی شخص آ گیا ہے۔'' میرے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ مما نے جلدی میں بتایا کہ زہرہ کا ڈرائیور ٹھیک وقت پر اسے بندرگاہ لانے کے لیے نہیں پہنچا، تو اس نے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی اماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ گھر سے خود ہی گاڑی لے کر نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور بھی پہنچ گیا، تو اسے بھی زہرہ کے پیچھے دوسری گاڑی دے کر بھیج دیا گیا اور پھر بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ ہجوم دیکھ کر ڈرائیور نے بریک لگائی اور پھر اپنی مالکن کی گاڑی کے گرد خون بکھرا دیکھ کر اس کے تو ہوش ہی گم ہو گئے۔ پتا چلا کہ کوئی موٹر سائیکل سوار زہرہ کی گاڑی تلے آ گیا ہے۔ نوجوان کی نبضیں ابھی چل رہی تھیں، لہٰذا لوگوں کے چیخنے چلانے کے باوجود ڈرائیور نے اسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور زہرہ سمیت اسے لے کر قریبی اسپتال کی طرف گاڑی بھگا دی۔ یہ فون وہیں سے زہرہ کے والد نے کیا تھا۔ جب زہرہ گھر سے نکلی تھی، تب تک وہ اپنے دفتر سے واپس نہیں لوٹے تھے اور پھر جب گھر پہنچے، تو اس افتاد کا سنتے ہی وہ زہرہ کی اماں کو لے کر فوراً اسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہیوی بائیک پر سوار نوجوان کسی اونچے گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور دوسری جانب کے لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زہرہ کے ابا نے پپا اور مجھ سے بھی وہاں آنے کی درخواست کی تھی، کیوں کہ معاملہ پولیس کا تھا۔ نہ جانے غلطی کس کی تھی، لیکن مما کے بقول زہرہ کے ابا کی آواز سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔ میرے دل سے بے اختیار صدا نکلی کہ ''یا میرے مولا..... اس گھائل کو اپنی امان میں رکھنا۔'' ابھی ہم نے گھر سے نکلنے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی اور اس مرتبہ میں نے لرزتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سلطان بابا کے وہ سینئر معالج تھے، جنہیں میں خاص طور پر اپنے گھر کا فون نمبر دے کر آیا تھا کہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں مجھے فون پر اطلاع دے سکیں۔ میں صرف اتنا ہی سن سکا کہ سلطان بابا کی سانسیں الجھنے لگی تھیں، لہٰذا انہیں پھر سے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ غنودگی میں کئی بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ میں ریسیور رکھ کر باہر کی جانب لپکا، جہاں مما پپا پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ دونوں طرف ہی کچھ ایسی صورت حال تھی کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کس طرف کو نکلا جائے۔ میں نے پپا کو زہرہ لوگوں کی جانب جانے کا کہا اور خود دوسری گاڑی میں سلطان بابا کی جانب روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔ ڈرائیور جلدی میں گیراج سے گاڑی نکال کر ابھی پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ میری رگوں میں پھر سے وہی اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا، لیکن میری بصارت سے رنگ غائب ہوتے گئے اور پھر میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ذہن میں جیل کی قید کے دوران کیے گئے معائنے والے بڑے ڈاکٹر کے الفاظ پھر سے گونجے۔ ''کوئی بھی شدید پریشانی یا اچانک خوشی کی خبر ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر اس نظام کو متحرک کر سکتی ہے، جو آگے چل کر کسی بھی بڑے اعصابی حملے کی بنیاد بن سکتا ہے۔'' افسوس وہ نظام متحرک ہوا بھی تو کس گھڑی، جب چاروں طرف سے مصائب میرا گھیراؤ کر چکے تھے۔ میں زور سے لہرایا اور گاڑی کے بونٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ میری حالت دیکھ کر پپا تیزی سے میری جانب بڑھے۔ ''ساحر..... خود کو سنبھالو بیٹا.....'' لیکن میں شاید بہت پہلے سنبھلنے کے مقام سے آگے گزر آیا تھا۔ میری ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں نے مما کو چیختے ہوئے میری جانب بڑھتے دیکھا، لیکن میری سماعتیں آس پاس کے شور سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے پپا کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ پھر نہ جانے میں ہوش میں تھا یا کوئی سپنا تھا۔ ایمبولینس کی گھومتی سرخ بتی، شور مچاتی سڑک، کسی غیر ملکی اسپتال کی ہمارے شہر میں موجود کڑی کا سائن بورڈ، سفید گاؤن پہنے اور میرے اسٹریچر کے ساتھ بھاگتے ڈاکٹر، بدحواس سی نرسیں، آپریشن تھیٹر کی ایک جھٹکے سے جلنے والی گول فانوس نما روشنیاں، کچھ چمکتے اوزار، خون کے چھینٹے، درد، کسک، بوجھل پن، میری کنپٹی کی بائیں جانب کسی انتہائی تیز نشتر کی نوک کی چبھن اور پھر جلد سے گزر کر ماس کے اندر تک کاٹ کا احساس..... اور پھر وہی سرخ اندھیرا..... کئی صدیوں کے بعد میری سماعت میں کچھ ہلکی سی سرگوشیاں گونجیں..... ''ہمیں افسوس ہے..... لیکن آپ کے بیٹے کے بچنے کی امید بہت کم ہے، البتہ آپ اگر چانس لینا چاہیں، تو اسے فوراً لندن کے روز ویل اسپتال تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ وہاں ڈاکٹر البرٹ ہی واحد ماہرِ اعصابی امراض ہیں، جو شاید اب کچھ کر سکتے ہیں۔'' پھر مما کے رونے کی آواز، ایئرپورٹ ٹرمینل کے مخصوص اعلانات، ہوائی جہاز کے پہیوں کی رن وے پر رگڑ سے اڑتی چنگاریاں۔ اور پھر ایک ملائم آواز ''ہم لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔''

(جاری ہے)